اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری تا مارچ

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری ۲۰۱۷ء تا مارچ ۲۰۱۷ء

شمارہ نمبر ۱۰

مدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

محمد امین

روبینہ شاہین

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و خطابت

mudeer.ai.new@gmail.com

کیا؟ کیا؟ کہاں؟

غزلیات / ھزلیات

ڈرامے بازیاں

سفر وسیلۂ ظفر

جوکے

مزاحیے

نظمالوجی

قہقہہ نواز

کتابی چہرے

کالم گلوچ

فیس بُک موج میلہ

جستہ جستہ

ابنِ منیب، ارسلان بلوچ ارسلؔ، پروفیسر مجیب ظفر وغیرہ کے جستہ جستہ فقروں، قہقہہ آور چٹکلوں اور ادارہ ہذا کے تشخیص کردہ شرارتی کارٹون، مجلّے کے مختلف صفحات پر۔

مشتری ھوشیار باش

https://www.facebook.com/groups/837838569567605

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:

https://archive.org/details/@nzkiani

ایک تھا جنگل

ایک انتہائی غیر سیاسی کہانی

پیارے دوستو، السلام علیکم، آج آپ سب کو ایک کہانی سناتے ہیں، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شیرنی اور گدھے کی شادی ہوگئی، اُن کے ہاں بیٹا ہوا تو سب پریشان تھے کہ یہ گدھا ہے یا شیر! پھر ایک دن شکاری کی گولی سے شیرنی ہلاک ہوگئی، گدھا بہت غمزدہ تھا۔ تمام جانوروں نے بہت ہمدردی کی مگر دکھ کم نہ ہوا، پھر سب نے مل کر گدھے کو جنگل کا بادشاہ بنا دیا۔ گدھے نے بادشاہ بن کر جنگل کا بیڑا غرق کر دیا، ہر طرف کرپشن اور افراتفری تھی۔ سب نے فیصلہ کیا کہ گدھے کو ہٹا کر کسی اصل شیر کو حکومت دیں۔ الیکشن کا فیصلہ ہوا تو گدھے نے اپنے بیٹے کو اپنی جگہ نامزد کر دیا۔ سب نے کہا کہ یہ تو ''کھوتے کا پتر ہے!''

گدھے نے کہا ''مگر اِس کی ماں تو شیرنی تھی ناں!''

پھر گدھے نے اپنے بیٹے کا نام بدل دیا تا کہ کوئی اس کو ''کھوتے کا پتر'' نہ کہے۔ اب تجزیہ کار اِس ''کھوتے کے پُتر'' سے بڑی ''شیرانہ'' اُمید لگائے بیٹھے ہیں۔

(یہ ایک انتہائی غیر سیاسی کہانی ہے لہذا اِسے سیاسی رنگ نہ دیا جائے، شکریہ)

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

طنز و مزاح لکھنا کوئی آسان کام ہوتا تو اس کی صف میں خواتین کثرت سے موجود ہوتیں باوجودیکہ وہ طنز گوئی میں یدِ طولیٰ رکھتی ہیں لیکن ان کی اکثریت حسِ مزاح سے محروم ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ فیکٹری فالٹ ہے اِس لئے ان کو اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی پاکستانی عوام کی اکثریت کے معاشی حالات ایسے ہیں کہ خواتینِ خانہ گھر میں اور مرد حضرات گھر سے باہر کولہوں کے بیل بنے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں تو دونوں ہی گھر سے باہر گردش میں ہوتے ہیں کہ مہنگائی کے جن کو قابو کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں طنز کی زیادتی اور مزاح کی قلت ہے کیونکہ طنز تلخی کی پیداوار ہے اور مزاح آسودگی کی، اس لئے اس دور میں جو لوگ طنز و مزاح لکھ رہے ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں، خصوصاً اس سلسلے میں خواتین کے جو چند نام نظر آتے ہیں ان کی خصوصی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے تا کہ دیگر اصنافِ سخن کی طرح طنز و مزاح میں بھی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ نظر آئیں۔ ویسے بھی حکومت نے اپنے اقدامات سے طنز و مزاح کے بیشمار نئے موضوعات پیدا کر دئے ہیں۔ طنز و مزاح ٹینشن کے اس دور کی اہم ضرورت ہے، اس کے باوجود ادبی سطح پر اس کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا ہے اور حکومتی سطح پر سوتیلے پن کی یہی وجہ ہے کہ کسی مزاح نگار کو آج تک کوئی اعلیٰ ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ اگر کسی مزاح نگار کو کوئی اعزاز دیا بھی گیا ہے تو اس کی وجہ اُس کے مزاح نگار ہونے کے بجائے اُس کی ذاتی اثر و رسوخ اور سیاسی چلت پھرت ہے۔ رہی سہی کسر برقی میڈیا نے پوری کر دی ہے جنھوں نے مزاحیہ مشاعروں کو بھانڈوں کی حیثیت دے دی ہے اور عید بقرعید پر مزاحیہ مشاعرہ کرا کر کچھ مخصوص شاعروں کو بلا لیتے ہیں اور معمعلی معاوضہ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ اس میں کچھ قصور ان میں شریک ہونے شاعروں کا بھی ہے جو بھانڈوں کی سی حرکتیں کر کے ان کی سوچ کو درست ثابت کر دیتے ہیں حالانکہ مسخرے، بھانڈ اور طنز نگار میں ویسا ہی فرق ہوتا ہے، جو پھکڑ پن اور شائستہ شگفتہ کلام میں ہوتا ہے۔ بھانڈ اور مسخرے بھی اپنی جگہ اہم ہیں اور ان کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان میں اور مزاح نگار میں جو فرق ہے اسے ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ یاد رکھیں کہ طنز و مزاح نگاری نہایت سنجیدہ کام ہے اسو را سے سرانجام دینے والے اکثر نہایت سنجیدہ انسان ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق کے لئے مشفق خواجہ، کمال احمد رضوی، ابنِ انشاء، ڈاکٹر شفیق الرّحمن، کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کی اصلی زندگی پر نظر دوڑائیں، یہ حضرات عام انسانوں سے بھی زیادہ سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ ہم طنز و مزاح نگاروں کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کا کام پیش کر رہے ہیں۔ طنز و مزاح لکھنا بذاتِ خود دشوار سہی لیکن صحت افزا مزاح لکھنا اس سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس کے لئے پھکڑ پن، نمائشی اور عامیانہ بازاری زبان سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ مزید یہ کہ آپ کسی مخلوق کی تخلیقی خامی (لنگڑا کانا وغیرہ) کو طنز و تضحیک کا نشانہ نہیں بنا سکتے کیونکہ یہ اللہ کی صناعی پر طنز کے مترادف ہوگا جس کی بہر حال اجازت نہیں، ہاں کسی مخلوق کی خود ساختہ ناہمواری پر طنز بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کا مضحکہ بھی اُڑایا جا سکتا ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اس میں ہمدردی کا جذبہ نمایاں ہو، نہ کہ دل آزاری کا۔ اس کے ساتھ ساتھ شعائرِ اسلام کا مضحکہ اُڑانا بھی غیر صحتمند رویہ ہے جو انسان کو گناہگار ہی نہیں، بعض صورتوں میں دائرۂ اسلام سے بھی خارج کر دیتا ہے مثلاً اللہ، دوزخ، جنت، فرشتوں، مُردوں، داڑھی یا کسی دینی معاملے کا مذاق اُڑانا وغیرہ۔ زبان و بیان کی غلطی تو بعض اوقات مزاح کے ذیل میں آجاتی ہے لیکن نظریاتی غلطی روحانی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے، اس لئے اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ دوسروں کا خیال رکھیں اور طنز و مزاح میں کسی کی دل آزاری سے بچیں، اللہ نگہبان۔

خادم حسین مجاہد

پطرس بخاری

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے۔ اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی۔ اور اس غرض سے اُس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا ''مرزا صاحب۔ ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟''

مرزا صاحب بولے ''بھئی کچھ ہوگا ہی نا آخر۔''

میں نے کہا ''میں بتاؤں تمہیں؟''

کہنے لگے ''بولو۔''

میں نے کہا ''کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں۔۔۔ کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو۔ کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کے دم ہوتی ہے۔ تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں اور میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اور اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔''

''پیدل۔۔۔ تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا

طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے، ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہوجاتے ہیں۔ تخیل مرجاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہوجاتا ہے۔''

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے وفائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے ازحد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف پھیرلیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کررہا ہوں وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا ''اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھوتو میں کیا کرتا ہوں۔''

میں نے اپنے دانت پیچی کرلیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرادیا لیکن میرے تبسم کا میں زہر ملا ہوا تھا۔

جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہوگیا تو میں نے چبا چبا کر کہا ''مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا پھر بولے ''کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟''

میں نے کہا ''سنا نہیں تم نے۔ ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو، اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کردیے۔ تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔''

مرزا بولے ''ہوں۔''

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اُوپر کو چڑھا لیں۔ پھر سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور لے جاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا بولے ''ہوں۔''

میں سوچا اثر ہورہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا، مرزا کچھ بولے، تاکہ مجھے معلوم ہو، کہاں تک مرعوب ہوا ہے لیکن مرزا نے پھر کہا ''ہوں۔''

میں نے کہا ''مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام ''ہوں'' سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے، اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔''

مرزا صاحب کہنے لگے ''نہیں یہ بات تو نہیں، میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کررہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں تو میاں صاحب زادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟''

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا ''میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔''

مرزا بولے ''کون کون سی مثلاً؟''

میں نے کہا ''ایک تو میں سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔''

مرزا کہنے لگے ''چلو دس آنے تو یہ ہوگئے، باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی کسی طرح ہوجائے تو سب کام ٹھیک ہوجائے گا۔''

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہوکر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے ''میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں ایک بائسیکل لے لو۔''

میں نے کہا ''وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔''

کہنے لگے ”مفت۔۔۔“

میں نے حیران ہو کر پوچھا ”مفت وہ کیسے؟“

کہنے لگے ”مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔“

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں، اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، اُبلتے ہوئے فواروں کی موسیقی، بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں، تو میں نے پوچھا ”کس کی؟“

مرزا بولے ”میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے، تم لے لو۔“

میں نے کہا ”پھر کہنا۔۔۔ پھر کہنا!“

کہنے لگے ”بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے جب میری ہے، تو تمہاری ہے، تم لے لو۔“

یقین مانئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہوگیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کرلی، سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا ”مرزا صاحب سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں، جو ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی، دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کردو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خودغرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی

سایۂ دیوار اور ٹھیکدار

کسی مشاعرہ میں کوثر قریشی اپنی غزل کا یہ شعر پڑھ رہے تھے:

شرکتِ انجمنِ ناز ضروری ہے مگر
ہم پس سایۂ دیوار بہت اچھے ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی نے یہ شعر سنا تو کہا ”بہت اچھی بات ہے، کوثر صاحب! لیکن خیال رکھئے گا کہ وہ دیوار کہیں نئی دہلی کے ٹھیکیداروں کی بنائی ہوئی نہ ہو، کیونکہ ایسی دیواریں بالعموم چار چھ مہینے کے بعد ہی گر جاتی ہیں۔“

ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں، مجھے معاف کردو۔“

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا، لیکن مرزا صاحب کہنے لگے ”واہ اس میں میری فیاضی کیا ہوتی، میرے پاس ایک بائیسکل ہے، جیسے میں سوار ہوا، ویسے تم سوار ہوئے۔“

میں نے کہا ”مرزا، مفت میں نہ لوں گا، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔“

مرزا کہنے لگے ”بس میں اسی بات سے ڈرتا تھا، تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے حالانکہ خدا گواہ ہے، احسان اس میں کوئی نہیں۔“

میں نے کہا ”خیر کچھ بھی سہی، تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔“

مرزا بولے ”قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی، وہ تو بہت زیادہ تھی

اوراب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔“
میں نے پوچھا ”تم نے کتنے میں خریدی تھی؟“
کہنے لگے ”میں نے پونے دوسو روپے میں لی تھی، لیکن اُس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا، اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔“
میں نے کہا ”کیا بہت پرانی ہے؟“
بولے ”نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی، میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا، اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے، لیکن اِتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے، آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہے۔ جنہیں کالج کے سر پھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔“
”مگر مرزا پونے دوسو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا، اِتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔“
مرزا کہنے لگے ”تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں، اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن۔۔۔“
میں نے کہا ”نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں تم گھر جا کے گن لینا، اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا ورنہ روپے واپس کر دینا، اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں، یہ تو کچھ دکان داروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔“
مرزا بولے ”بھئی جیسے تمہاری مرضی، میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔“

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا، میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا، وہ بیچارہ تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو، لیکن مفت میں کیسے لے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں، جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں بس ٹھیک ہے، چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔
باہر آیا چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا ”مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا۔“
مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا ”کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے، دیر نہ کر دینا۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ اور تمہارا بہت بہت شکریہ، میں تمہارا بہت ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کر دینا، دیکھو نا کبھی کبھی یوں ہی بے تکلفی میں۔۔۔ کل صبح آٹھ نو بجے تک۔۔۔ ضرور۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔“
مرزا کہنے لگے ”ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو خود ہی ڈلوا دوں گا، ورنہ تم خود ہی ڈلوا لینا۔“
میں نے کہا ”ہاں ہاں وہ سب کچھ ہو جائے گا، تم کل بھیج ضرور دینا اور دیکھنا آٹھ بجے تک ساڑھے آٹھ سات بجے تک پہنچ جائے۔ اچھا۔۔۔ خدا حافظ!“
رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح کی ہوا خوری کے لئے

ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اُٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اُڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، بار ہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر اؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔ صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کے حضور وہ بائیسکل آ گئی ہے۔ میں نے کہا ''اِتنے سویرے؟''

نوکر نے کہا ''وہ تو رات ہی کو آ گئی تھی، آپ سو گئے تھے میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی یہ ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔''

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے بائیسکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا ''دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو۔ اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو، اے بھاگا کہاں جا رہا ہے ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں، بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور

ٹوئیلٹ دروازے کے دائیں طرف ہے، لیکن پلیز ذرا جلدی کیجئے گا، ابھی آپ کا آپریشن مکمل نہیں ہوا!!!

جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے۔ جس سے تمام پرزے ہی خراب ہوجائیں، بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال رکھو، ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جارہے ہیں اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا ابھی مت رگڑنا، بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔''

جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش خروش کے ساتھ ''چل چل چنبیلی باغ میں'' گاتا رہا اس کے بعد کپڑے بدلے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب وغریب مشین پر نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے، نوکر سے دریافت کیا ''کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟''

نوکر بولا ''حضور یہ بائیسکل ہے۔''

میں نے کہا ''بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟''

کہنے لگا ''مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔''

میں نے کہا ''اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟''

کہنے لگا ''یہی تو ہے۔''

میں نے کہا ''کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟''

کہنے لگا ''جی ہاں۔''

میں نے کہا ''اچھا'' اور پھر اسے دیکھنے لگا ''اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟''

''اس کو دو تین دفعہ صاف کیا ہے؟''

''تو یہ میلی کیوں ہے؟''

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

''اور تیل لایا؟''

''ہاں حضور لایا ہوں۔''

''دیا؟''

''حضور وہ تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں وہ نہیں ملتے۔''

''کیا وجہ ہے؟''

''حضور ڈھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔''

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتارہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا تو ثابت ہوگیا کہ یہ بائیسکل ہے لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اس طرح کی ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا، لیکن اب اس سوراخ میں سے آمدورفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا ''حضور وہ تیل تو سب ادھر اُدھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔''

میں نے کہا ''اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو یہ بھی مفید ہوتا ہے۔''

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئی۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں۔ چاں۔ چوں کی قسم آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ، کھڑ کھڑ۔ کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر۔ چرخ۔ چر۔ چرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہوجاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھونے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا

کہ انسان شمال کی سمت سیر کرنے کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔

اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لحہ بھر کو زور سے اوپر اُٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر تھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ۔۔۔کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضاء میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے، بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر اُدھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے سینوں سے لگا لیا۔ کھڑ کھڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی رہی تھی لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ، چچوں پھٹ، کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی اُدق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری تھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹھی کیلوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہو جانا ازحد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کر لوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا، گدی کو اونچا کیا، کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ معلوم ہوگا کہ میں دُور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ ''دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔'' گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرا ہاتھ اور میرا جسم دونوں ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کہ گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔ بائیسکل کی کھڑ کھڑ سے دوکان میں جتنے لوگ کام کر رہے تھے، سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا ''ذرا اس کی مرمت کر دیجئے۔''

ایک مستری آگے بڑھا، لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بیدردی سے ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب

جاڑا اور تبادلہ

بیدی صاحب کا سفارش کرنے کا بھی اپنا ہی انداز تھا۔ جن دنوں کشمیری لال ذاکر گوڑگاؤں میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر تھے فرید آباد کے ایک گرلز اسکول میں ایک ڈرائنگ ماسٹر تھے اور اسی اسکول میں ان کی بیوی بھی پنجابی پڑھاتی تھی۔ ان دونوں نے اسکول کی پرنسپل کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔ اُنھیں بلا کر ذاکر صاحب نے بہت سمجھایا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ پرنسپل کو تنگ کرتے رہے۔ اس پر ذاکر صاحب نے اُن میاں بیوی کو فاصلے پر الگ الگ اسکولوں میں ٹرانسفر کر دیا۔ اُس ماسٹر نے کسی طریقہ سے بیدی صاحب تک رسائی حاصل کر لی۔ اور ان سے ذاکر صاحب کے نام سفارشی چٹھی لینے میں کامیاب ہو گیا اور وہ چٹھی لے کر ذاکر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ لفافے پر ہاتھ سے لکھے ہوئے ایڈریس سے ہی ذاکر صاحب نے پہچان لیا کہ بیدی صاحب کا خط ہے۔ لفافہ کھول کر پڑھا تو اس پر لکھا تھا ''یہ میاں بیوی اِس وقت بڑی پریشانی میں ہیں، آنے والے جاڑے کے پیش نظر انہیں اکٹھا کر دیجیے اور ان کی دعائیں حاصل کیجیے۔''

خط پڑھ کر ذاکر صاحب مسکرائے تو ڈرائنگ ماسٹر نے بڑی جرأت کر کے پوچھا ''سر کیا لکھا ہے۔''

''آپ کے فائدے کی بات ہے آپ جایئے۔'' ذاکر صاحب نے جواب دیا اور فائل نکال کر ان میاں بیوی کو فرید آباد سے قریب ایک اسکول میں ان کے ٹرانسفر کے آرڈر جاری کر دیے۔

حالات کا اندازہ لگا لیا ہے لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا ''کس کس پرزے کی مرمت کرایئے گا؟''

میں نے کہا ''بڑے گستاخ ہو تم دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کرواور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟''

مستری نے کہا ''مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟''

میں نے کہا ''ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو۔''

کہنے لگا ''اگر آپ باقی چیزیں بھی ٹھیک کرا لیں تو اچھا ہو۔''

میں نے کہا ''اچھا کر دو۔''

بولا ''یوں تھوڑا ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جایئے۔''

''اور پیسے کتنے لو گے؟''

کہنے لگا ''بس چالیس روپے لگیں گے۔''

ہم نے کہا ''بس جی جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔''

تھوڑی دیر بعد ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا ''میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا ''بدتمیز کہیں کا، تو دو آنے پیسے مفت میں لے لئے؟''

بولا ''جناب آپ کو بائیسکل بھی مفت میں ملی ہوگی، یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ للو یہ وہی بائیکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطاء معاف ہونے میں نہیں آتی۔''

میں نے کہا ''واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔''

مستری نے کہا ''ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔''

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں نے بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کو چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس ل؟ ے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے

ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہوجاتا اور جنون کی حالت میں پہلے حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوئی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کی ناپاک فطرت سے آگاہ کردیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مرجاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہوسکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں میں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپیہ کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دُکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ یہ "بائیسکل" ہے۔

دکاندار کہنے لگا "پھر؟"

میں نے کہا "لوگے۔"

کہنے لگا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بیچتے ہیں ہم۔"

دکاندار نے مجھے ایسے نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کررہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا، پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کرسکتا آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے؟ آخر کار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا۔"

کہنے لگا "اچھا چڑھ گیا۔ پھر؟"

جرائم کی نوعیت

ہندوستان کے سابق ہوم منسٹر کیلاش ناتھ کاٹجو کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ علامہ انور صابری جب اسٹیج پر آئے تو کلام پڑھنے سے پہلے فرمانے لگے "وقت وقت کی بات ہے، میں اب تک وہی کا وہی شاعر ہوں اور کاٹجو صاحب وزیر بن گئے ہیں، حالانکہ انگریزوں کے دور حکومت میں ہم دونوں ایک ہی جیل میں رہ چکے ہیں۔"

کنور صاحب نے فوراً جملہ چست کیا "لیکن جرائم جدا جدا تھے۔"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟"

دکاندار بولا "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہوں۔ اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا، آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا "تم ہی بتاؤ۔"

کہنے لگا "سچ مچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے۔"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا "او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان، مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا

ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور اِدھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں، گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے جس میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت وشنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلہ پہیہ بالکل ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشاد کلاوہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو، کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ یہ دو پہیے کاہے کو لے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں، انہیں ہنسنے دو، اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا۔ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی ''بس حضرت غصہ تھوک ڈالیئے۔'' ایک دوسرے صاحب بولے ''بے حیا بائیسکل گھر پہنچ کے تجھے مزا چکھاؤں گا۔'' ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارا کر کے کہنے لگے ''دیکھا بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔''

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دُور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دِل جو کئی گھنٹوں سے کشمکش میں پیچ وتاب کھا رہا تھا، اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا چلتا گیا حتی کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے۔ اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازا کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے ''اندر آ جاؤ۔''

میں نے کہا ''آپ ذرا باہر تشریف لایئے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں۔''

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار اُن کی خدمت میں پیش کئے جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمائے تھے اور کہا ''مرزا صاحب آپ ہی اِن اوزار سے شوق فرمایا کیجیے میں اب اِن سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔''

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اُس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی۔

جہنم کی زبان

جن دنوں جوش ملیح آبادی ماہ نامہ ''آجکل'' کے مدیرِ اعلیٰ تھے، اُن کے دفتر میں اکثر شاعروں، ادیبوں اور مداحوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی، بسمل سعیدی، جگن ناتھ آزاد، بیدی صاحب اور مانی جائسی، جوش صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ پنڈت جی نے بیدی صاحب کو پنجابی زبان میں مخاطب کیا۔ جوش صاحب نے فوراً ٹوک کر کہا کہ پنڈت جی یہ تو جہنم کی زبان ہے۔

بیدی صاحب نے فوراً گزارش کی ''تو پھر جوش صاحب آپ بھی ابھی سے یہ زبان سیکھنا شروع کر دیں تاکہ آپ کو آخری جائے قیام میں تکلیف نہ ہو۔''

سیّد عارف مصطفیٰ

آج کیا پکائیں؟

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کائنات کا سب سے اہم سوال کیا ہے تو نہ تو میں آسمان و زمین کے وجود کی بابت پوچھے جانے والے کسی سوال کی جانب اشارہ کروں گا اور نہ ہی انسانی فطرت کے اسرار کے بارے میں کسی سوال کا حوالہ دوں گا۔۔۔ گو یہ سوال بھی خاصے اہم ہیں لیکن اِتنے اہم پھر بھی نہیں نہیں جتنا کہ یہ سوال کہ "بتائیں آج کیا پکائیں" اور یہ سوال میرے گھر میں کہ جسے میں اپنی کائنات کہتا ہوں، تقریباً روز ہی اٹھتا ہے اور بلا ناغہ و باقاعدگی سے صبح ابھی جبکہ ناشتہ جاری ہی ہوتا ہے، بیگم اس سوال کا ہتھوڑا لیئے میرے سر پہ آموجود ہوتی ہیں۔ اکثر تو میں چپ چاپ نکل بھاگتا ہوں لیکن کبھی کبھی نکل بھاگنے کے سبھی رستے مسدود ہوتے ہیں کیونکہ محض ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پہ وہ ہتھوڑا بدست موجود ہوتی ہیں اور وہ یہ ہتھوڑا اس وقت تک برساتی رہتی ہیں کہ جب تک اُن کی سانس پھول نہیں جاتی یا وہ یہ سوال ہی بھول نہیں جاتیں۔۔۔ لیکن بعد میں یاد آتے ہی پھر اسی سوال کا ہتھوڑا لیئے آدھمکتی ہیں اور مجھے درست طور پہ یوں لگنے لگتا ہے کہ مسئلہ کھانا پکانے سے زیادہ مجھے پکانے کا ہے کیونکہ اُن کے چلے جانے کے بعد میرے دلِ حزیں سے اور منہ سے ویسی ہی مسرت انگیز سیٹی نکلتی ہے کہ جیسے خوب پکائی کے بعد پریشر ککر میں سے بجتی سنائی دیتی ہے۔

پھر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ کچھ تکلیف دہ باتیں روز یا اکثر ہی کیوں ہوتی ہیں اور خوشگوار باتوں کو بار بار ہونے سے کیا موت پڑتی ہے؟ پھر خود کو اس ڈھنگ سے سمجھاتا ہوں کہ "صاحب بس یوں سمجھ سے کہ کچھ نہ کچھ چیزیں اکثر گھروں میں روز ہوتی ہیں جیسے ملنسار لوگوں کے گھروں میں روز کوئی نہ کوئی کوئی مہمان آکے پڑ جاتا ہے یا جیسے کچھ سلگتے بلکتے لوگوں کے بدن میں روز ہی صبح سے کوئی نہ کوئی درد جنم لے لیتا ہے اور وہ یہاں وہاں جسم کے کسی کسی نہ کسی حصے پہ ہاتھ رکھے ہمیشہ درد سے کراہتے سنے جاتے ہیں تو عین اس طرح یہ سوال اٹھنا آپ کے اپنے گھر کی چھوٹی سی دنیا کا مقسوم ہے اور اس پہ صبر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن کبھی کبھی خود کو سمجھانے کی یہ کوشش بے سود بھی رہتی ہے۔۔۔ کیونکہ یہ وہ دائمی بلکہ قائمی مسئلہ ہے کہ جو روز ہی چڑاؤنا کیئے دیتا ہے اور مجھے بے طرح ڈستا ہے اور بیگم بھی تازہ دم ہو کے ہر صبح میرے عین سامنے اپنے اس سوالی مورچے پہ آکے ڈٹ جاتی ہیں اور بلا ناغہ گفتگو کی پٹاری کھول کے اس سوال کا ناگ برآمد کرتی ہیں اور پھر یہ بین تا دیر بجتی رہتی ہے کہ "بتایئے آج کیا پکائیں"۔

ویسے یہ مسئلہ ایک میرے گھر سے ہی مخصوص نہیں کیونکہ پیٹ

توسب کے جسمانی سامان کا لازمی حصہ ہے اور اسی لیئے اس سوال کا ہتھوڑا بھی روز ہی ہر ایسے شریف صاحب خانہ کے سر پہ جم کے برستا ہے کہ جو گھر میں ناشتے کی فاش غلطی کرتا ہے لیکن جو لوگ اس سوال سے بچنے کے لیئے ناشتے سے قبل ہی دفتر کے نام پہ کبھی نکل بھاگتے ہیں تو ان کی زندگی ہر رات کے کھانے کے وقت ہی حرام کر دی جاتی ہے اور وہ اس سوال سے بچ پھر بھی نہیں سکتے۔۔۔
اس سوال سے ناواقف لوگ جو کہ محض کنوارے ہی ہو سکتے ہیں یا پھر ایک ماہ کے بعد ہی طلاق یا رنڈاپے کی نوبت تک پہنچ جانے والے (کیونکہ عموماً پہلے ماہ کسی بھی طرح کی دلہن سے کام کرانے کا رسک نہیں لیا جاتا کہ اپنا دل اور کھانا دونوں جلائے گی)۔

اِس سوال والے معاملے میں عجب ستم یہ ہے کہ بظاہر تو یہ سوال کوئی ایسا خاص گھمبیر معلوم بھی نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کے سوال میں تو مخاطب کی عزت افزائی کا پہلو چھپا معلوم ہوتا ہے۔۔ لیکن اس استفسار کی چبھن، اس کی حدت اور شدت کا احوال وہی لوگ جانتے ہیں کہ جو ایک عدد بیوی کے حامل ہیں اور روز ہی اس سوال کی سولی چڑھائے جاتے ہیں۔ کوئی مرد اس سوال کا صحیح جواب دے پائے، یہ کچھ یقینی بھی نہیں خواہ وہ آخری درجے کا ایک صلح جو اور مسکین سا شوہر ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس مسئلے میں صرف جواب دینا ہی ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اِس جواب کو بیگم کی طرف سے شافی و کافی باور کر لینے کی سند مل جانا بھی لازمی ہے اور یوں بیگم کا درجۂ اطمینان تک پہنچ جانا ہی گلوخلاصی کی واحد شرط ہے۔

میں دنیا بھر کی بات نہیں کرتا، لیکن مجھے اپنی کائنات کے سب سے بڑے مسئلے کو پوری دلجمعی و مکمل تندہی سے حل کرنا ہوتا ہے اور وہ بھی ایسے عالم میں کہ بیگم اس کے حل ہونے تک سر پہ موجود رہتی ہیں اور اس سچائی سے تو ہر وہ شخص واقف ہے کہ جو کبھی نہ کبھی خود طالبعلم رہ چکا ہو کہ کوئی ذہین سے ذہین طالبعلم بھی امتحان میں پرچہ کا وہ سوال ڈھنگ سے حل نہیں کر سکتا کہ جب اس دوران خشمگیں سی صورت لیئے کوئی ممتحن اس کے سر پہ ہی کھڑا رہے اور پھر یہ سوال بھی تو وہ ہے کہ جس کے جواب میں نقل کی سہولت بھی موجود نہیں۔

اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ بیگمات کے اس روزمرہ کے سوال کہ ”آج کیا پکائیں“ کے نتیجے میں ان کی پکائی کا عمل کچن سے زیادہ کچن کے باہر سرانجام پاتا ہے اور کھانا پکنے سے بہت پہلے ہی ہم جیسے شوہر حضرات ضرور پک جاتے ہیں لیکن دوسری بیگمات کی طرح چونکہ میری بیگم کے لیئے بھی یہ مسئلہ کسی عالمی مسئلے سے بھی زیادہ اہمیت لیئے ہوتا ہے چنانچہ وہ مجھے اس میں کھینچ لینا عین ضروری بلکہ لازمی سمجھتی ہیں۔ میں اپنی سی کوشش ضرور کرتا ہوں کہ ان کے اس ”معمولی“ سے سوال کا کوئی جواب ایک آدھ گھنٹے ہی میں دے سکوں لیکن میرا صبر اور میری بصیرت روز ہی اس آزمائش کا شکار رہتی ہیں۔ آیئے آج آپ کو بھی اس کی ایک جھلک دکھاتا ہوں۔

یہ دیکھیئے، یہ میرے گھر کا کسی ایک دن کا صبح کا روٹین منظر نامہ ہے اور حسب معمول میری بیگم نے اس وقت مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور یہی سوال کسی پتھر کی طرح مجھے کھینچ مارا ہے اور میں بدحواسی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہوں لیکن بدحواسی کو چھپانے اور پُراعتماد نظر آنے کے لیئے میں بیٹھے بیٹھے ٹانگ ہلانا شروع کر دیتا ہوں جس سے میرا پیر سامنے رکھی تپائی پہ لگ جاتا ہے اور اس پہ رکھی چائے کی پیالی فرش پہ گر پڑتی ہے اور پھر یہ منظر نامہ میری بیگم کی صفات کو بیان کرنے سے عاجز الفاظ کے تابڑ توڑ استعمال اور شور سے جیسے یکا یک بھر سا جاتا ہے۔ صاف صفائی ہو جانے اور میری ہجو میں کئی بیانات دے چکنے اور میرے اِرد گرد سے، ٹھیس لگنے کے امکان سے گر پڑنے والا سب سامان دور کر دیئے جانے کے بعد یہ منظر نامہ وہیں سے جڑ جاتا ہے کہ جہاں سے ٹوٹا تھا۔

”ارے اتنی دیر کیوں لگا رہے ہو سیدھی طرح کیوں نہیں بتا دیتے کہ آج کیا پکے گا؟؟“ بیگم نے غرانا شروع کر دیا تھا۔

کسی بڑے جھگڑے سے بچنے کے لیئے میں حسب عادت پہلے تو یہ کہہ کر جان چھڑانے کی فوری تدبیر کا سہارا لیتا ہوں اور بڑی فیاضی سے کہہ اٹھتا ہوں ”جو جی چاہے پکالو“ لیکن اکثر یہ چال کامیاب نہیں ہوتی کیونکہ ادھر سے جواب میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ

’’چلو آج کھانے کو رہنے ہی دیتے ہیں۔‘‘ جس پہ میرے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں کیونکہ میں بھوک کا بہت کچا ہوں اور یہ ’’رہنے دیں‘‘ والے الفاظ گویا صورِ اسرافیل معلوم ہوتے ہیں، تب میں بتیسی نکال کے کہتا ہوں کہ ’’آج آلو گوشت پکا لو‘‘۔۔۔!

’’لیکن وہ تو گزشتہ ہفتے ہی پکایا تھا۔۔۔‘‘

میں ایسے موقع پہ اپنے جبڑے بھینچ لیا کرتا ہوں تاکہ شروع ہی میں کوئی لفظ ایسا نہ نکل جائے جو میری ناگواری بالکل واضح کردے، باوقار نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے میں اِدھر سے اُدھر نظر گھماتا ہوں پھر چھت کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر بے بس نظر کھڑکی کی طرف جاتی ہے پھر کہیں سے کوئی اشارہ یا مدد نہ ملنے پہ بے بس ہو کے کندھے اچکا کے کہتا ہوں ’’بھئی کچھ بھی پکا لو۔۔۔‘‘

’’کچھ بھی۔۔۔! یہ کونسی ڈش ہے بھلا کچھ بھی؟‘‘ بیگم نے گویا میری نقل اتاری۔

’’اچھا چلو دھوئیں والی مرغی بنالو‘‘ میں نے دانت نکالے۔ جس چیز کے دام گرے ہوں اسے پکوانے میں ہمیشہ بڑی مسرت پاتا ہوں۔

’’وہ تو گزشتہ ہفتے دس بارہ دن پہلے ہی پکی تھی‘‘ بیگم نے یاد دلایا۔

’’تو چلو اروی گوشت بنالو‘‘ میں نے ایک اور تجویز پیش کی۔

’’اسے تو گھر کے صرف آدھے ہی لوگ کھاتے ہیں!‘‘ بیگم نے تاویل پیش کی۔

’’نہاری بنالو!!‘‘ میں نے چمک کے کہا

’’وہ ابھی چار دن پہلے ہی بنی تھی‘‘ بیگم نے وضاحت کی۔

پہلے اُن دس ہزار روپوں کا حساب دو جو پچھلے مہینے لوٹ کر لے گئے تھے!

"اخاہ۔۔۔ پائے بہت لذیذ بناتی ہو تم، آج ہو جائیں پھر پائے؟" میں نے تعریف کے رستے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"خدا کا خوف کریں۔۔۔اتنا کولیسٹرول ہوتا ہے اس میں، اور آپ کا تو بلڈ پیشر بھی ہائی رہتا ہے" بیگم نے جیسے میڈیکل کی کتاب ہی کھول لی۔

"اچھا مچھلی لے آؤں؟" میں نے گویا حد ہی کر دی۔

"اتنی گرمی میں؟ اور پھر آپ کو مچھلی کی پہچان بھی کہاں ہے؟ مچھلی کے نام پہ جو شے آپ لاتے ہیں وہ ہوتی تو مچھلی کی شباہت والی ہی ہے لیکن پہچانی بڑی مشکل سے جاتی ہے پھر چھانٹ کر پوری کوشش کر کے ایسی افلاطون مچھلی لاتے ہیں کہ کثرتِ فکر سے گوشت مکمل ناپید ہو گیا ہو بس کانٹوں کا انبار ہی رہ گیا ہو جیسے۔۔۔آپ کی لائی مچھلی اتنی باسی ہوتی ہے کہ پکتے ہوئے باس گلی کے آخر تک جاتی ہے۔۔۔ میں اسے جیسے ہی کڑھائی میں ڈالتی ہوں دائیں بائیں کے گھروں سے نجانے کتنے لوگ کھانسنے اور بڑبڑانے لگتے ہیں۔"

شرمندگی کا یہ طولانی بیان بہت دیر جاری رہ سکتا تھا اگر میں موضوع فوراً ہی نہ بدل دیتا "کیوں بیگم۔۔۔چکن کڑھائی اچھی رہے گی نا؟"

"پچھلی بار بنائی تھی تو زیادہ مزا نہیں آیا تھا آپ کو۔۔۔ایک بار بھی تعریف نہیں کی تھی آپ نے جبکہ ہمیشہ بہت تعریف کرتے تھے پہلے۔۔۔!"

"تو اس سے کیا ہوا؟"

"میں نے تو بڑی شرمندگی محسوس کی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اب ایک برس سے پہلے نہ بناؤں گی چکن کڑھائی"

"آخر ایک برس ہی کیوں؟"

"تاکہ اس کا کھویا ذائقہ بحال ہو جائے اور پرانے والے کی یاد بھول جائے۔"

"اچھا بریانی بنا لو۔۔۔یا پھر۔۔۔قورمہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں منمنایا۔

"آخر کیوں یہ بار بار بریانی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں آپ؟؟ جب دیکھو بریانی، جب دیکھو بریانی! ابھی اس مہینے ہی چار شادی ولیموں میں یہی بریانی اور قورموں پہ تو بڑھ چڑھ کے ہاتھ صاف کیا ہے آپ نے۔" بیگم نے ہاتھ نچائے۔

"اچھا تو کوئی سبزی ہی بنا لو۔"

"مثلاً۔۔۔!"

"یہ کہ بھنڈی ایکدم ٹھیک رہے گی!" مجھے جیسے راہ سوجھ گئی تھی۔

شادی کے سات ماہ بعد میں ملک سے باہر چلا گیا۔ تین ماہ بعد مجھے خبر ملی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹا عطا فرمایا ہے۔ میں بہت خوش تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بڑھنے لگا چلنے لگا بولنے لگا۔ پھر تین سال کے بعد میں نے کسی کو بتائے بغیر وطن واپس جانے کا ارادہ کیا۔ جب تین سال بعد اپنے گاؤں پہنچا تو نقشہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ بہت سے نئے لوگ، نئی شکلیں تھی۔ محلے کے بچوں کے لیے چاکلیٹس لے کر آیا تھا جو گلی میں ہی بانٹنا شروع کر دیں۔ چاکلیٹس ختم ہونے پر گھر چلا تو ایک بچہ میرے پیچھے پیچھے گھر آ گیا۔ میں نے اسے کہا "بیٹا چاکلیٹس تو ختم ہوگئی ہیں اپنے گھر جاؤ" اتنے میں میری بیگم سامنے سے آ گئی۔ خیر یوں اچانک مجھے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی اور خوشی سے رونے لگی۔ اور بتانے لگی کہ یہ تمہارا ہی بیٹا ہے جسے جانے کا کہہ رہے ہو۔ میں بہت خوش ہوا چوما، پیار کیا بیٹے کو۔ پہلی بار جو دیکھا تھا مجھے اس لئے بجائے ابو کے مجھے انکل کہنے لگا۔ کھلونے چیزیں وغیرہ جو لایا تھا تو خوشی خوشی سارا دن گزار دیا اس نے۔ لیکن رات ہوئی جب سونے کی تیاری کی۔ اس سے پہلے کہ میں لیٹتا۔ بیٹے نے رونا اور ضد کرنا شروع کر دی کہ اس انکل کو کمرے سے باہر نکالو۔ بہت بہلانے اور سمجھانے کے باوجود اس نے ماں کی ایک نہ مانی اور اپنی ضد پر قائم رہا۔ ماں پھر ماں تھی ہار ماننی ہی پڑی اور مجھے کمرے سے باہر نکال دیا۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی، صاحبزادے کہنے لگے کہ باہر تو نکال دیا ہے اب اندر سے کنڈی بھی لگاؤ۔ اس طرح تین سال بعد پہلی رات گھر سے باہر گزارنی پڑی۔ یہ واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

ارسلان بلوچ

''لیکن آپ کے دو بچے تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے ۔۔۔کیا انہیں ، بھوکا ماردوں ؟؟'' بیگم غضبناک لہجے میں بولیں۔

میں نے فوری اپنے ناخنِ تدبیر سے یہ گرہ کھولی ''اچھا یوں کرو کہ آپ بھنڈی کو گوشت میں ڈال دو تو سب بچے کھالیں گے۔''

''نہیں پھر تو بالکل نہیں کھائیں گے ، گوشت بھی خوامخواہ ضائع ہوگا۔''

میں تنگ آچکا تھا، بیزاری سے کہا '' تو کوئی اور سبزی پکالو۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔!'' بیگم بھی تنگ آئی لگ رہی تھیں لیکن پھر بھی لہجہ مستحکم تھا۔

''میرا خیال ہے لوکی مناسب ہے۔'' میں نے صلح جویانہ انداز میں مشورہ دیا۔

''کیوں کیا چند دن پہلے جو لوکی پکائی تھی اس کا حشر یاد نہیں؟ چار دن تک ساری آپ نے ہی کھائی تھی۔'' بیگم نے یاد دلایا تو یکا یک جھرجھری سی آگئی اور دفعتاً میرے رونگٹے یکدم کھڑے ہوگئے۔ ''نہیں نہیں بھئی لوکی کو رہنے دو۔''

بیگم نے لقمہ دیا ''کدو اور ٹینڈے کو تو خود آپ بھی مارا باندھے ہی کھاتے ہیں، پھر بچوں کے صبر کا امتحان کیوں لوں؟''

''میرا خیال ہے ابھی کوئی دال چاول ہی پکالیں تو بہتر رہے گا'' میری آواز جیسے کنوئیں سے آئی۔

''بچوں کو تو ایک ملکہ مسور کی کالی دال کے سوا اور کوئی دال نہیں بھاتی ، الٹ پلٹ کے وہی بار بار پکتی ہے، اسے بھی کہاں تک پکاؤں!'' بیگم ترنت بولیں۔

''اچھا یوں کرو کہ خشکہ ہی بنالو تمہارے خاص رائتے کے ساتھ کیا مزا دیتا ہے۔'' میں نے مسکہ لگا کے معاملے کو نپٹانے کی کوشش کی۔

''اپنے کئی بچوں کو نزلہ زکام نے جکڑا ہوا ہے اور آپ کو چاول کی سوجھ رہی ہے وہ بھی دہی کے رائتے کے ساتھ '' بیگم نے جلے کٹے انداز میں وضاحت کی۔

''اوہو۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا تھا!!'' خوشدلی سے اپنی کوتاہی کا فوری اعتراف اکثر اچھے نتائج کا موجب بنتا ہے۔ بیگم بھی ذرا دیر کو خاموش ہوئیں اور پھر ہاتھ نچا کے گویا ہوئیں۔ ''اِتنی دیر لگا دی اور ابھی تک ایک ذرا سی بات نہیں بتا سکے آہ کہ آج کیا پکائیں؟''

''چلو یوں کرو کہ بچوں کو ہوٹل سے نہاری منگوا کے کھلا دو۔'' میں نے ایک آسان حل یہ سوچ کے پیش کیا کہ اس سے بیگم کو ابھی پکانے کے کام سے چھوٹ مل جائے گی تو دل کا نرم پڑنا یقینی ہے۔

''وہ جو منجھلے کا پیٹ چل پڑا تھا، کیا بھول گئے آپ۔۔۔اس پہلے جو نہاری لائے تھے کتنی بھاری پڑی تھی اُسے بلکہ گھر میں ہم سب کو، کتنے پریشان ہوئے تھے اُس کے دستوں کی وجہ سے، حیرت ہے آپ کو یاد ہی نہیں جبکہ خود آپ کتنے دن ڈاکٹروں کے پاس لیئے لیئے پھرے تھے!'' بیگم کے لیئے میری یہ پکی پکائی رعایت رائیگاں ہی رہی۔

''ارے بس ٹھیک ہے پھر۔۔۔ ہوٹل نہیں مگر تم گھر ہی میں بنالو نہاری۔'' میں شدید اکتاہٹ کا شکار ہو چلا تھا۔

''آپ خود ہی تو کہتے پھرتے ہیں ہر جگہ کہ نہاری تو بس ہمن کے ہوٹل ہی کی مزا دیتی ہے۔۔!'' بیگم نے وار کیا۔

میں زچ ہو کے بولا ''بھئی کڑھی پکانے میں تو کوئی حرج نہیں؟''

''ابھی ڈیڑھ ماہ میں دوسری بار دو ہفتہ پہلے ہی بنائی تھی تو بچے بسورر ہے تھے کہ کیا ابا کی جیب کٹ گئی ہے؟'' بیگم کھوکھیائیں

''ہائیں۔۔۔ کیا تم نے بچوں کو ایسا بے لگام کردیا ہے بیگم!! ایسی زبان درازی؟ توبہ توبہ۔۔۔ باپ رے۔۔۔ میرا تو دل جل کے کباب ہوگیا ہے۔'' میں نے ترش اور اونچے لہجے میں جھلا کے کہا۔

''ارے تو یوں گول گول کیوں گھماتے ہیں ۔۔۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ کباب بناؤ ۔۔۔ چلو ٹھیک ہے کباب بناتی ہوں ۔۔۔ بہت دن بھی ہوگئے ہیں۔۔۔!''

محمد ایوب صابر

ہم آج تک اپنے فکاہیہ مضامین کے ذریعے بہت سے پرندوں اور جانوروں سے چھیڑ خانی کر چکے ہیں۔ بس ایک جانور ایسا ہے جس پر نہ لکھنے کا ہم نے پکا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے سوچا کہ کتے پر نہیں لکھیں گے۔ اس کی ایک وجہ یہ کہ بہت ہی ''کتا موضوع'' ہے، اس پر خواہ مخواہ قلم گھسائی کیوں کریں؟ ویسے بھی ہمیں کتے جیسے بھونکو جانور سے ''کتکاریاں'' کرنے کی کی ضرورت ہے مگر ہوا یوں کہ ایک خبر کے مطابق امریکی ریاست کیلیفورنیا کے شہر ''سان ڈیاگو'' میں کتوں کے لئے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا افتتاح کر دیا ہے۔ ہوٹل میں کتوں کے لئے ایل سی ڈی ٹی وی اور نرم گدے والے بستر مہیا کئے گئے ہیں۔ اس ہوٹل میں ایک رات کا کرایہ ۲۵ سے لے کر ۱۰۰ ڈالر تک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کتے کرایہ دے کر گدے پر بیٹھ سکتے ہیں گدھے پر نہیں۔ یہاں کتوں کے بھونکنے پر کوئی پابندی نہیں۔

میرا اپنا تعلق ہوٹل انڈسٹری سے ہے اس لئے مجھے کتوں کے ہوٹل سے کاروباری رقابت محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے آج تک کسی سیاح کو کتے سمیت کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دیتے ہوئے نہیں سنا ہے۔ بعض دفعہ کچھ یورپی سیاح مع کتا ہوٹل میں قیام کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ ایسے سیاح کے لئے کمرے میں اور کتے کے لئے اسٹور روم میں ٹھہرنے کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مذکورہ سیاح کا دل ساری رات کتے میں اٹکا رہتا ہوگا۔

ہمارے وطن میں کتے رکھوالی اور لڑائی کی غرض سے پالے جاتے ہیں بعض دفعہ کتوں کی لڑائی پر انسان آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ کتوں سے کھوجی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ کتا بے چارہ چور کا کھوج تو لگا لیتا ہے لیکن لوٹا ہوا مال واپس دلانا کتے کی ذمہ داری میں قطعی شامل نہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگوں کو خواہ مخواہ کسی معروف شخصیت سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کا لاعلاج مرض ہوتا ہے۔ ایک دن ہمارے گاؤں کے ایک لندن ریٹرن خود کو برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس (جن کو ولی عہد بنے ایک عہد گزر گیا ہے) کا رشتہ دار ثابت کرنے پر بضد تھا۔ ہم نے کہا کہ جناب! شنید ہے کہ آپ اور پرنس چارلس کا کتا آپس میں کزن ہیں، واقعی کیا کتا رشتہ نکالا ہے۔ اس پر موصوف شرمندہ ہونے کی بجائے ضد پر اتر آئے کہ پرنس چارلس اور وہ دودھ شریک بھائی ہیں۔ میں نے کہا کہ

گپیں مت ہانکو، لیکن وہ جناب ثابت کرنے پر تلے رہے اور فرمانے لگے کہ میں تمھیں اپنی بات کا ثبوت دیتا ہوں کہ لندن قیام کے دروران میں جس دُکان سے دودھ لیتا تھا، پرنس چارلس کا ملازم بھی اُسی دُکان سے دودھ لیتا تھا اس طرح ہم دودھ شریک بھائی ہیں۔

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ امجد اسلام امجؔد کا تحریر کردہ پی ٹی وی ڈرامہ ''وارث'' پاکستان میں کتوں کا رول اہم کرنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ اگر چوہدری حشمت علی، اس طرح کتوں کے پیچھے خوار نہ ہوتا تو کوئی بھی چوہدری کسی کتے کو دہشت کی علامت نہ سمجھتا۔ آج کل ہم سنتے ہیں کہ فلاں چوہدری یا وڈیرے نے غریب ہاری یا مزدور پر کتے چھوڑ دیئے ہیں۔ ہم تو ویسے ہی ناخواندگی میں آگے اور ترقی میں پیچھے چلنے والی قوم قرار پاتے ہیں مگر خود کو تہذیب یافتہ قوم کہنے والے بھی اس معاملے میں حد سے گزر گئے جنہوں نے ''گوانتانا موجیل'' میں انسانوں کو کتوں کے برابر حقوق دینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

میں نے ایک دفعہ خواجہ خوامخواہ سے پوچھا کہ تم اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہتے ہو یہ بتاؤ! تم نے کبھی کوئی اچھا کام بھی کیا ہے۔ خواجہ یاد کرنے کے انداز میں اپنے سر کے بالوں میں انگلی گھمانے لگا، میں نے پوچھا کہ کیا کیسٹ ریوائنڈ کر رہے ہو، خواجہ نے کہا کہ، ایک دفعہ ایک آدمی آرام سے چلتا ہوا اپنے گھر جا رہا تھا، میں نے اُس کے پیچھے کتا چھوڑ دیا، وہ جلدی گھر پہنچ گیا۔ میں نے کہا شرم کرو، اس کو تم اچھا کام کہہ رہے ہو۔

ہر ملک میں پولیس کتوں سے جاسوسی کا کام لیتی ہے۔ کتے میں سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق ہمارے ملک میں آج کل نشہ بھی خالص میسّر نہیں۔ ایک دن نشئی نے دکھ بھرے لہجے میں شکایت کی کہ نشے میں بھی ملاوٹ ہو رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم لوگ کیسے یقین کرتے ہو کہ نشہ خالص ہے یا نہیں؟ اس نے بتایا کہ اس کے لئے کتے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کتا سونگھ کر نشے کے اصلیت کا اشارہ دیتا ہے۔ اس نے انکشاف کیا کہ اب تو میرا کتا بھی نشئی ہو گیا ہے کیونکہ وہ نشہ آور شے سونگھنے کے بعد ہی کسی پر بھونکنے کے لئے راضی ہوتا ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ کتے کو گھی نہیں پچتا۔ شاید وہ بھی ہضم کرنے کے لئے نشہ کرتا ہے۔ ہم روزمرہ گفتگو میں سنتے ہیں کہ کتے کی دُم بارہ برس نلکی میں رکھی، پھر دیکھا تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ ذرا سوچئے! اگر کتے کی دُم سیدھی ہو جاتی تو کون سی خوشحالی آجانی تھی؟ ہم آج تک اپنا ملکی نظام تو سیدھا کر نہیں پائے اور کتے کی دُم سیدھی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ ایک نشئی سگریٹ پی رہا تھا کہ اُس کا باپ آ گیا۔ نشئی نے باپ کے ڈر سے جلتا سگریٹ شرٹ کی جیب میں چھپا لیا۔ باپ نے غصے سے کہا، تم سگریٹ پی رہے تھے۔ بیٹا کہتا ہے! نہیں تو۔ باپ نے کہا پھر تمھاری جیب سے دھواں کیوں نکل رہا ہے۔ بیٹا فوراً کہتا ہے! آپ نے بات ہی دل جلانے والی کی ہے تو دھواں کیوں نہ نکلے۔

ایک خبر کے مطابق اب کتوں کی جگہ چوہوں سے دھماکہ خیز اشیاء کا سراغ لگایا جائے گا۔ یہ خبر کتوں کے لئے بھی کسی دھماکے سے کم نہیں ہے۔ آج تک کتوں نے سراغرسانی میں اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک دن چوہوں کے ہاتھوں اُن کی درگت بنے گی۔ وہ منصب جس پر آج تک کتے فائز تھا اب چوہوں کے پاس چلا گیا ہے۔ اِس سے ثابت ہو گیا کہ کوئی بھی عہدہ دائمی نہیں ہے۔ ایک وقت تھا جب چوہے بلی سے ڈرتے تھے، اب اُنہوں نے ایک ہی وار میں کتوں پر فتح حاصل کر لی ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ دنیا میں اس قدر دھماکے کتوں کی غفلت سے ہو رہے ہیں۔ اب چوہوں کو دھماکوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا کر دیا جائے گا، دیکھئے کیا بنتا ہے۔

میرے خیال میں اِن دھماکوں پر تحقیقات سے زیادہ ضروری ہے کہ ان دھماکوں کی وجوہات پر تحقیق کی جائے۔ کتوں یا چوہوں پر ذمہ داری ڈالنے سے صورتحال میں بہتری کی کوئی امید نہیں ہے البتہ انسانوں کے درمیان اخوت اور رواداری سے اِن دھماکوں کو روکا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آنکھیں

ہنسپتالیات

اُردو شاعری میں آنکھ وہ عضوِ محبوب ہے جس پہ شعرا حضرات نے دل، قلم اور چشمِ بصیرت و بصارت کو وا کر کے بہت کچھ لکھا ہے۔ غزل میں محبوب کا سراپے کا بیان اُس کی آنکھ سے ہی شروع کیا جاتا ہے۔ آنکھ کو جسم کے عالیشان محل کا دروازہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسی کے ذریعے بہت سی معلومات دماغ تک پہنچتی ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ظریفانہ شاعری میں امراضِ چشم میں بھی شعراء نے ظرافت ڈھونڈ نکالی ہے۔ آنکھوں کی حُسن و دلفریبی پر تو بہت قصیدے لکھے جاچکے ہیں مگر آنکھوں کی بیماریوں پہ اس طرح لکھنا کہ مریضِ چشم تھوڑی دیر کے لئے بیماری کے کرب سے نکل کر مُسکرا لے، ایک صاحبِ ظرافت ہی کے بس کی بات ہے۔ نظر کی کمی، موتیا اور اس کا علاج بذریعہ لینز، بھینگا پن، آشوبِ چشم جیسے موضوعات ظریفانہ شاعری ہی میں سموئے جاسکتے ہیں۔

آنکھیں یوں تو اردو شاعری کا ایک اہم موضوع رہا ہے اور اردو غزل میں محبوب کی چشمِ غزال سے بات شروع کردی جائے تو بے شمار اشعار اس ضمن میں تحریر کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن مزاحیہ شاعر نہ صرف محبوب بلکہ محبوب کے والدِ گرامی کی آنکھوں میں بھی آنکھیں ڈال سکتا ہے

بقول ڈاکٹر مظہر عباس رضوی ۔

خوب کرتی ہیں پھر تو خوار آنکھیں
جب دکھاتا ہے ہم کو یار آنکھیں

شب کے پچھلے پہر ڈراتی ہیں
اُس کے ابا کی تھانیدار آنکھیں

کب غمِ عشق تھا؟ الرجی تھی!
دے گئیں دھوکا اشکبار آنکھیں

چوٹ لگتی ہے دل پہ اِن سے بہت
دیکھ یوں زور سے نہ مار آنکھیں

کیسے اب وہ نظر چُرائیں گے
ہم دکھائیں گے بار بار آنکھیں

غم والم، حزن و ملال اور یاس و حرماں کو اردو کی عشقیہ شاعری میں بڑا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے کہ اس کے بغیر عاشقِ صادق کی صداقت پہ یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ مگر ظریف شاعر اپنے رونے میں بھی ایک لطافت کا پہلو نکال لیتا ہے۔ مثلاً جگت موہن کہتے ہیں

ہم لاہور کے حاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ تپش کشمیری صاحب کھانا کھا چکے تھے، لیکن مجھے کھانا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں ان کے چند دوست آئے جو پاس والے میز پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے تپش صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا "آیئے کھانا تناول فرمایئے۔"

تپش صاحب نے شکریہ ادا کیا "خدا آپ کو بہت بہت دے۔۔۔ میں گھر سے کھا کر آیا ہوں۔"

اُن کے دوست نے بڑا اصرار کیا کہ وہ ضرور کھائیں۔ آخر تنگ آ کر وہ اُن کے پاس بیٹھ گئے اور بارہ روٹیاں اور سالن منگوائی۔ اس کے بعد فرنی کی چار پلیٹیں کھائیں اور خدا کا شکر ادا کر کے وہاں سے اُٹھے اور میرے پاس چلے آئے۔۔۔ اُن کے اُس دوست کی حالت قابل رحم تھی۔

تپش کاشمیری از سعادت حسن منٹو

چشم نے میری اشکباری کی
کاشتکاروں نے کاشتکاری کی

اور پھر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ عاشق صادق ،فراق یار میں رو رو کر اپنا منہ اور آنکھیں سجا لیتا ہے اور ڈاکٹر صاحب ہیں کہ ڈاکٹرانہ عینک استعمال کرتے ہوئے بیمار دل کو ادویاتِ چشم تھما دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مظہر عباس

آبدیدہ خوں چکیدہ تھا فراقِ یار میں
ڈھل گئی تھی آنسوؤں میں ایک عاشق کی صدا
عشق پُر آشوب میں تھا مبتلا لیکن اسے
ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دے دی آنکھوں کی دوا

عاشقی وصال کے تصور کے بغیر ادھوری ہی رہتی ہے۔ اشاروں اور کنایوں سے محبوب کو اپنی جانب متوجہ کرنا ہر عاشق کا مشغلہ رہا کرتا ہے، مگر مزاحیہ شاعر اس معاملے میں بڑی گہری نگاہ رکھتا ہے اور اس کی نظر دور تلک جاتی ہے بقول اسد جعفری۔

میں سمجھ بیٹھا ہوں جاناں جس کو پیغامِ وصال
وہ تمھاری آنکھ جھپکانے کی عادت ہی نہ ہو

اور انگلستان میں بیٹھے بلبل کاشمیری مزید محتاط ہو جاتے ہیں۔

مغرب میں آنکھ مارنا معمول کا سلام
مشرق میں یہ معاملہ وجہ تضاد ہے

ممتاز مزاحیہ شاعر شوکت جمال تیر نظر کا شکار ہو کر کہتے ہیں۔

خنجر بکف وہ ڈھونڈتے پھرتے تو ہیں مجھے مگر
تیرِ نظر سے جاں بہ لب داخل ہوں ہسپتال میں

ماہر امراضِ چشم

عام ڈاکٹروں کی طرح ماہر امراض چشم بھی اپنی فیس سے دستبردار نہیں ہونا چاہتے اور ان سے تکرار مریض کے لئے کسی بڑی پریشانی کا باعث بھی بن سکتی ہے بقول ڈاکٹر مظہر عباس۔

یہ کہہ رہے تھے مطب میں طبیبِ نکتہ چیں
ہمیں دکھاتا ہے آنکھیں مریضِ چشمِ حسیں
زبان دیکھیں اگر تو زباں چلاتا ہے
جو فیس مانگو تو ہوتا ہے خوب چیں بہ جبیں

اور

چشم کے ماہر سے چشمک دیکھ کر
دے نہ دے وہ "رانگ" عینک دیکھ کر
آ نہ جائے ہاتھ پر اپنے ہی چوٹ
مار لیکن دیکھ چابک دیکھ کر

بعض اوقات معاملات اس وقت گھمبیر صورت حال اختیار کر لیتے ہیں جب رقیب آئی سرجن ہو اور محبوب کی انکھوں کا آپریشن کرانا پڑ جائے۔ ایسے موقع پہ ڈاکٹر عزیز فیصل دست بہ دعا نظر آتے ہیں

دوستو تم دعا کرو کہ رقیب
شہر کا اک ہی آئی سرجن ہے
میرے خوابوں کے فولڈر کی خیر
چشمِ جاناں کا آپریشن ہے

نظر کی کمی

امراض چشم میں نظر کی کمی سب سے زیادہ عام ہے بلکہ بڑھتی

ہوئی عمر میں یہ ہر ایک کا مسئلہ ہے۔میڈیکل زبان میں اسے presbyopia کہا جاتا ہے اور پینتالیس برس کے بعد اکثر خواتین وحضرات معنک نظر آتے ہیں۔

اک دھند سی ہے جس میں ہیولا سا ہے کوئی
ہے کون میرے سامنے مجھ کو خبر کہاں
اب مائینس تھری کا بھی چشمہ اتر گیا
"اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں"

انور مسعود

دنیا دار و چشمِ دنیادار بالکل ٹھیک ہے
دیدہء دیندار لیکن انتہائی ویک ہے

چونچال سیالکوٹی

عینک

اور اس کم نظری کا علاج عینک سے کیا جاتا ہے عینک کو شائد اس لئے بھی عینک کہا جاتا ہے کہ یہ عین ناک کے اوپر براجمان ہوتی ہے۔مولانا حاتم علی نے اس آلہء بصارت کی کیا خوب تصویر کشی کی ہے۔

مدِنظر جناب کو عینک کا شغل ہے
بیساکھیاں لگائی ہیں پائے نگاہ میں

جبکہ انور مسعود، انعام الحق جاید، ڈاکٹر مظہر عباس، نسیم سحر اور پھل آگروی عینک کی خوبیوں پہ اس طرح رقم طراز ہوتے ہیں،

لطف نظارہ ہے اے دوست اسی کے دم سے
یہ نہ ہو پاس تو پھر رونقِ دنیا کیا ہے
تیری آنکھیں بھی کہاں مجھ کو دکھائی دیتیں
میری عینک کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

انور مسعود

جنگی دھوپ کے نظارے نے کر دی عشق کی آنکھ تباہ
چھ نمبر کی عینک لگ گئی اتنی ہوئی کمزو نگاہ
کس سے کہوں اب کیا ہونا ہے اسکے بزم میں آنے پر
لوگ ہوتے ہیں چشم براہ اور میں ہوتا ہوں چشمہ براہ

انعام الحق جاوید

کہا یہ ماہرِ امراضِ چشم نے مجھ سے
فروغ دیدہ وری کی دوا کچھ اور نہیں
تجھے تو چاہیئے پہنے رہے سدا عینک
"ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں"

ڈاکٹر مظہر عباس

کچھ دکھائی نہیں دیتا جنہیں عینک کے بغیر
اُن کا دعویٰ ہے کہ عینک ہے نظر کی چابی

نسیم سحر

لگا کے رکھتا ہے چشمہ جو اپنی آنکھوں پر
مجھے تو یار وہ کانا دکھائی دیتا ہے

پھل آگروی

تہہِ غازہ چھپی ہے سب عبارت
نہیں آساں ہے اس کو یار پڑھنا
لگا ایسی ہمیں عینک نظر کی
کہ آجائے رُخِ دلدار پڑھنا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آپریشن، موتیا، لینز

اس کے علاوہ آنکھ کے بہت سے دیگر امراض بھی نظر کی کمی کا باعث بن سکتے ہیں جس میں سب سے زیادہ سفید موتیا کی بیماری شامل ہے۔اس بیماری میں آنکھ کے اندر کا عدسہ دھندلا پڑ جاتا ہے

ایک بار جگر، شوکت تھانوی اور مجروح سلطانپوری دو پہر کے وقت کہیں کام کے لیے باہر نکلے تھے تو ارادہ کیا گیا کہ نماز ادا کی جائے۔شوکت صاحب ایک کام کیلئے چلے گئے۔جگر صاحب مسجد کے بجائے ایک ریسٹورنٹ میں جا گھسے۔
مجروح نے کہا۔"جگر صاحب یہ مسجد نہیں ریسٹورنٹ ہے۔"
جگر نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے۔سوچا کہ وقت تنگ ہے۔اللہ کو تو خوش کر نہیں سکتا، اس کے بندوں کو ہی خوش کر لوں، آیئے۔"
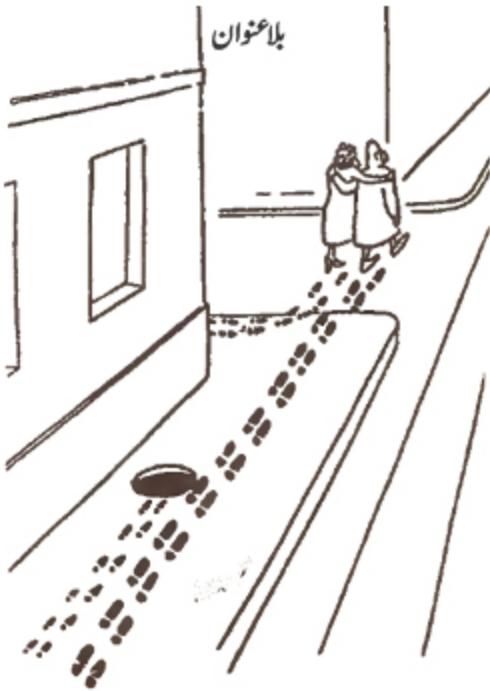
جس کی وجہ سے روشنی کی ترسیل میں رکاوٹ ہونے لگتی ہے ۔نظر کی کمی جب عینک سے نہ ٹھیک ہوسکتی ہوتو پھر اگلا مرحلہ اس کا علاج بذریعہ آپریشن کیا جاتا ہے ۔ان تمام موضوعات کو ہمارے مزاحیہ شاعروں نے کس چابکدستی سے اپنے کلام کی زینت بنایا ہے اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

موتیا

رنگ خوشبو گلاب دے مجھ کو
اِس دعا میں عجب اثر آیا
میں نے پھولوں کی آرزو کی تھی
آنکھ میں موتیا اُتر آیا

اطہر شاہ خان جیدی

میرے پیارے اللہ میاں تیرا کرم نرالا ہے
اس کی آنکھ میں قیمتی لینز میری آنکھ میں جالا ہے

فاروق قیصر

اتنا مہنگا لگایا ''لینز'' کہ اب
ہوگئیں خوب مالدار آنکھیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اُس کی آنکھوں کا آپریشن کر
پھانس کو کہہ رہا جو بھالا ہے

عظمت اللہ خان

ہے واقعی کمال یہ کنٹیکٹ لینز کا
اک بحرِ نیلگوں جو تری چشمِ تر میں ہے

سرفراز شاہد

آپریشن کے بعد جب مریض ایک سبز رنگ کی پٹی باندھ لیتا ہے یا کالی عینک پہن لیتا ہے اس کے بارے میں ضمیر جعفری یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

جانے اپنی آنکھوں کو کیسی لاگ لاگی ہے
طوطا نصف طوطی ہے کاگا نصف کاگی ہے
ہم بھی شعر لکھیں گے ایک ایک مصرعے کے
ایک آنکھ سوئی ہے ایک آنکھ جاگی ہے

آشوبِ چشم

آنکھوں کی بیماریوں میں آشوبِ چشم سے کون واقف نہیں ۔یہ ایک ایسی بیماری ہے جو بہت سے مختلف جراثیم سے پیدا ہوسکتی ہے۔ڈاکٹر مظہر عباس کہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر بھی ہیں آشوبِ چشم کی متعدی بیماری کے مختلف پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

عاشق سے کہہ رہے تھے یہ آنکھوں کے ڈاکٹر
دستورِ عشق رہ گیا باتیں بگھارنا
ہو حالِ دل کے واسطے بس نامہ و پیام
آشوبِ چشم پھیلا ہے ، آنکھیں نہ مارنا!

ڈاکٹر مظہر عباس

بتاؤ ہم کو نہ انگلش بدن کے اعضا کی
ہمیں پتہ ہے کہ انگلش میں آنکھ Eye، ہے
وہ رو کے بولے ارے بے خبر ہے درد بہت
رواں ہے چشم سے چشمہ کہ آنکھ آئی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس

ملنے سے بھی یار گریزاں آنکھوں سے بھی دور
اس آشوبِ چشم سے کتنے طوطا چشم ہوئے

اسد جعفری

لوگ جسے آنکھوں کی مستی کہتے ہیں
ممکن ہے وہ آنکھوں کی بیماری ہو

سرفراز شاہد

نزدیک آ رہے ہیں زمانے وصال کے
مشکل یہ آ پڑی ہے کہ آنے لگی ہے آنکھ

شوکت جمال

کلر بلائینڈ

یہ اکثر موروثی بیماری ہوتی ہے کہ جب انسان کچھ خاص رنگوں میں تمیز نہیں کرسکتا تک ڈاکٹر صاحب اس بیماری کا کچھ اور ہی فائدہ بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں

پوچھا کسی نے ماہرِ امراضِ چشم سے
رنگوں میں گر تمیز نہ ممکن ہو کیا کریں
کہنے لگے کہ اس میں تردد کی کیا ہے بات
توڑیں اشارے خیر سے اور ڈرائیور بنیں

ڈاکٹر مظہر عباس

بھینگا پن

انسانی ساخت کی کمزوریوں کا مذاق اُڑانا اگرچہ قابلِ ستائیش نہیں مگر کبھی کبھی مزاح نگاروں سے یہ فعل بھی سرزد ہوجاتا ہے:

میں نے سمجھا کہ مجھے دیکھ رہا ہے شائد
ترچھی نظروں کا یہ انداز بھی دھوکا نکلا
بعد میں کچھ نہ ملا مجھ کو ندامت کے سوا
جب اسے غور سے دیکھا تو وہ بھینگا نکلا

اسد جعفری

کنکھیوں سے بہت تکتا ہے اس کو
وہ آخر کار بھینگا ہو گیا نا

عنایت علی خان

کیسے ہوں گی چار
آنکھیں اس کی آنکھوں سے
بھینگا اپنا یار

نسیمِ سحر

عطیہ چشم

اور پھر جب آنکھیں بصارت کھو بیٹھتی ہیں اور کسی کام کی نہیں رہتیں تو جدید سائینس کی بدولت قرنیہ کی پیوندکاری کسی نابینا کو صاحبِ بصارت کرسکتی ہیں۔ ہمارے شاعر اپنی آنکھیں بطور عطیہ دینے پر راضی تو ہیں مگر بقول انور مسعود ؎

اس شرط پہ چاہے کوئی لے لے مری آنکھیں
دیکھے نہ حسینوں کے سوا اور کسی کو

آتشِ گل اور شعلۂ طور

گونڈہ کے ایک مشاعرہ میں جگر مرادآبادی کے ساتھ اسٹیج پر اور بہت سے شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ جگر صاحب کے نئے مجموعہ ''شعلۂ طور'' کا موازنہ ان کے پہلے مجموعہ ''آتش گل'' سے کیا جا رہا تھا۔ ایک مقامی شاعر جو جگر صاحب سے بغض رکھتے تھے اِس ذکر سے کافی پریشان تھے۔ جب ان کے پڑھنے کا وقت آیا تو اتفاق سے ان کے سامنے لٹکتا ہوا گیس بھبھک گیا اور اس میں سے سرخ رنگ کی لپٹیں نکلنے لگیں۔ اس پر وہ شاعر بولے کہ ذرا اس ''آتش گل'' کو میرے سامنے سے ہٹاؤ۔ میری آنکھوں کے لئے اس کی روشنی کافی ہے۔
جگر صاحب اس جملے میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ گئے لیکن خاموش رہے۔ منتظمین نے جب نیا گیس لا کر سامنے رکھا تو جگر صاحب بولے ''لیجئے جناب اب تو آپ کے سامنے شعلۂ طور'' لا کر رکھ دیا ہے۔ اس سے آپ کی نگاہیں ضرور خیرہ ہوجائیں گی۔

کائنات بشیر، جرمنی

ڈگڈگی والے بھیا!

جمہورے اوپر کی۔۔۔آسمان
آسے پاسے کی۔۔اِنسان

اے ڈراموں والے ڈائریکٹر بھیا،

یہ گانا تمھاری نذر۔۔!

آج کل تم خوب ڈگڈگی بجا کر اپنا رنگ جما رہے ہو۔ جو کبھی صرف پی ٹی وی پہ بجا کرتی۔ تمہاری ڈگڈگی میں واقعی سحر تھا، اس کی لئے اتنی سُریلی کہ ٹریفک جام ہو جاتی۔ دوکانیں سرِ شام بند ہو جاتیں۔ کسی نامہ نیم کو لوڈ شیڈنگ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لوگ کھانا پینا مغرب کے بعد پہلی فرصت میں کر لیتے اور تمھارا اکلوتا ڈرامہ ان کے لیے کسی سویٹ ڈش سے کم نہ تھا۔ اب نمکین آئیٹم میں کلاسیکل ناچ نچتے رہیں، شوشے چھوٹتے رہیں۔ بجلی گرتی رہے، دسترخوان سجتے ہیں۔۔۔ تم ہفتے میں ایک دن اپنی باری پر ڈرامے کی قسط دے کر چلے جاتے اور ناظر بیچارہ اگلے ہفتے تک تمھاری راہ میں آنکھیں بچھائے رہتا۔ دوسرے لوگ کیا پروگرام پیش کرتے گھر بیٹھے تمہارا دھیان ان کی طرف بھی مبذول رہتا۔ مقابلے کی فضا تمہاری اَنا کو اور بڑھاتی۔ خوب سے خوب تر کرنے کی خواہش متحرک رکھتی اور تم ٹائم پاس قسم کا کچھ بھی للو پنجو پیش کر کے اپنا گراف ہرگز کم نہ کرتے۔

پَر اب تمھیں کیا ہو گیا ہے میرے مداری بھیا!

لگتا ہے تم پہ کلچر کی یلغار ہو گئی ہے۔ تم ناظر کو ایک منٹ کے لئے بھی اِدھر اُدھر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ڈراموں پہ ڈرامے اور سوپ پہ سوپ بنا رہے ہو۔ سیاست سے اُنھیں اپنی اور کھینچنا چاہ رہے ہو۔ ڈیلی سوپ دکھا دکھا کر تم نے بینا ناظرین کو نکما اور ویلا بنا دیا ہے۔ میوہ جات کے بھاؤ بڑھا دیئے ہیں۔ گھروں میں بہو بیٹیوں کی جگہ ماسیوں کا رواج دے دیا ہے۔ ساس بہو کے جھگڑوں کے راز فاش کر دیئے ہیں، نند بھاوج کی دل لگیوں، سوکن سوکن کے کھیل کو اور بڑھاوا دے کر معاشرے میں اتھل پتھل مچا دی ہے۔ مرد کے چار حقوق میں سے دو کو تو تم نے عام دوام بخش دیا ہے۔ نئی نسل تمہارے ڈرامے دیکھ کر پروان چڑھ رہی ہے۔ اور وقت کا کیا کہنا۔۔! دن رات کے بیشتر گھنٹے، منٹ، سیکنڈ تمھاری نذر ہو رہے ہیں۔ ایک قسط ختم ہوتی نہیں کہ دوسری کا انتظار۔۔۔ انتظار سے یاد آیا کہ حال ہی میں ایک ڈرامہ اس موڑ پر ختم ہوا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولنے والے نے دروازے کی کنڈی پہ ہاتھ رکھ دیا اور ساتھ ہی قسط ختم۔۔۔ پورا ہفتہ انتظار رہا کہ دروازے پہ

جناب، آپ کو عربی کیسی آتی ہے؟
سر جیسی پاکستانی کرکٹرز کو انگلش آتی ہے!

ارسلان بلوچ

کون ہوگا۔ دل دہلتا رہا، سانس سوکھتا رہا۔۔ اگلی قسط میں پتہ چلا کہ دروازے پہ دودھ والا تھا۔ تو کیا دودھ والے کے لیے تم نے اتنا انتظار کروایا۔

ایک اور ڈرامے میں تم نے سونے کے لیے ہیروئن کو اتنا اونچا تکیہ دے دیا کہ اس کی گردن میں بل پڑنے کا پکا اندیشہ تھا۔ ایسے میں ناظر کا دھیان پورا تکیے پہ ٹکا ہے اور کہانی ہے کہ ہاتھ سے چھوٹی جا رہی ہے۔ یہ تو حد کر دی ڈائریکٹر بھیا تم بھی بڑے کمال کے ہو، شمال کے ہو۔

ایسا ہی کچھ حال پڑوس والے بھائی بندو کا ہے۔۔ اب ڈرامہ تو ڈرامہ ہے چاہے انڈیا کا ہو یا پاکستان کا۔۔ کہانی گھر گھر کی ہو یا ان کہی، تنہائیاں۔۔ دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں کو کچھ تو چاہیئے۔

ڈرامہ شاستری سسٹر میں تم نے رجعت کو انو سے ایک مسئلے پہ بات کرنے کے لیے ایسی جگہ پر بلا لیا۔ جہاں ایک طرف کھائی ہے اور دوسری طرف گہرا پانی۔۔ مسئلہ اتنا خطرناک نہیں تھا جتنی خطرناک جگہ تھی۔ اس مسئلے پر تو پائیں باغ میں بھی بات ہو سکتی تھی۔ بلکہ چاروں اور پھیلی ہریالی، سبک ہوائیں، خوبصورت منظر ان کے مسئلے کو گھمبیرتا سے نکال کر کوئی ہلکا پھلکا حل پیش کر سکتے تھے۔ دونوں خوشی خوشی اپنے گھر کو روانہ ہوتے۔ دیکھنے والا بھی چین کی بنسی بجاتا، سکون سے نیند کی وادی میں اتر جاتا۔ لیکن کہاں جی، (تم نے دیکھنے والے کی پوری نہیں پڑنے دی) لگتا ہے تمھارا ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے شائد پانی میں دھکا دلوانے کا ارادہ تھا۔ مسئلے کا یہ حل سوچا تھا تم نے۔۔؟ پھر آخر وقت اپنا ارادہ بدل دیا۔ ادھر ڈرامہ دیکھنے والا پورا وقت کھائی اور پانی کے اوپر سفر کرتا رہا اور اس کی طرف سے مسئلہ جائے بھاڑ میں۔۔!

اور ایسی ہنگرم بازی ہوئی ڈرامہ سسرال سمرن کا۔۔ میں تو تم جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھس آئے اور کئی دن تک گھستے رہے، داد دینی پڑے گی تمھاری کہ تم نے ناظر کو اتنا کم عقل، کمزور نظر، بیچارہ غریب قسم کا سمجھ لیا ہے کہ وہ تمہاری کارستانی پہ غور نہیں کر پائے گا کہ سمرن کی بہن رولی، وہی رولی جو بالکا ودھو میں بچپن گزار کر پل بڑھ کر جوان ہوئی، تم نے اسے ایسے جھمکے پہنا دیئے جن میں ایک جھمکے کا موتی ٹوٹا ہوا تھا جو اچھا خاصا خلا بخش کر جھمکے کے ڈیزائن کو بدنما اور دیکھنے والے کو الجھن میں ڈال رہا تھا۔ جیسے لوگ سونے کا دانت لگوا لیتے ہیں اور مخاطب کا پورا دھیان وہیں پہ اٹکا رہتا ہے، یہی حال ڈرامہ دیکھنے والے کا تھا۔ اب رولی کا دوسرا جھمکا دیکھنے کی فرصت کسے تھی۔ سواِسی پہ دھیان ٹکا رہا۔ ہاں مانا کبھی ہوتا ہوگا یہ جھمکا دیدہ زیب اور خوبصورت، جب اس کی چمک دمک نرالی ہوگی۔ جگر جگر کرتا ہوگا۔ اس کے موتی ذرا سے ہلنے سے موج میں آ جاتے ہوں گے، جانے کن نظروں نیا سے دیکھا ہو گا۔۔ پَر اب تو جانے کتنے ڈرامے بھگتا کر وہ رولی تک پہنچا تھا اور رولی بیچاری نے اسے پہن بھی لیا اور ناظر کا دھیان فوراً کہانی سے ہٹ کر جھمکے پہ مبذول ہوگیا۔ دیدہ دلیری یہ کہ وہ جھمکا کئی دن تک رولی کو پہنایا جاتا رہا اور ایک دن تم نے وہ جھمکا ناظر کو عقل سے پیدل، گنوار، بدھو سمجھتے ہوئے اسے رولی کے دوسرے کان میں پہنا دیا۔ واہ بھئی واہ کیا کہنے، کہانی واقعی آگے بڑھ رہی تھی۔۔ اب دیکھنے والے کو ڈرامے کی ہر قسط کا انتظار رہنے لگا کہ آج رولی وہ جھمکا کس کان میں پہنے گی، دائیں میں کہ بائیں میں۔۔؟ ڈرامے کی اپنی کہانی کتنی آگے بڑھ گئی۔ سمرن گھر آ گئی یا نہیں، پریم جی نے اسے قبول کر لیا کہ نہیں۔۔؟ یہ ناظر کو بالکل نہیں پتا۔۔!

چھوٹی بہو۔۔ زی ٹی وی کا ایک مشہور ڈرامہ، جو دو سال چلتا رہا۔ ماننا پڑے گا تمھاری خامیوں کے باوجود ناظر اسکے ساتھ لسوڑے کے لیس کی طرح چپکا رہا۔ پہلے تو تم نے ہیروئن کے باپ سے اتنی شد ہندی بلوائی کہ اسے جاننے کے لیے انڈین ناظرین بھی ڈکشنری کھولتے ہوں گے۔ پھر پہلی بار دیکھنے میں آیا کہ تم نے اس کے ہیرو کے لپ اسٹک بھی لگوا دی۔ کبھی اس کے ہونٹ تربوزی لگنے لگتے کبھی جامنی تو کبھی عنابی۔۔ دیکھنے والے لپ اسٹک کے شیڈ دیکھتے رہ جاتے۔ اس سے پہلے ڈراموں میں ہیرو

کے شیپ شدہ ابرو دیکھ کر شبہ پڑتا تھا اب لپ اسٹک دیکھ کر تو وہ گمان بھی دور ہو گیا۔ گمان دور کرنے کے لیے بہت شکریہ بھیا ،ویسے یہ لپ اسٹک لگانیکا مطالبہ ہیرو کا تھا یا ہیروئن کا۔۔؟

عشق کا رنگ سفید۔۔اس ڈرامہ کا تو عنوان بڑے اچنبھے کا باعث بنا۔ کوئی شاعروں سے پوچھے عشق کے تو رنگ ہزار۔ ستاروں کی طرح جھلملاتے، قوسِ قزح کی طرح پھیلتے۔ اور کہانی میں،

ہیروئن بیوہ ہے دھانی اور ہیرو وکیل بابو ولم۔۔!

الم، چلم جھپ لائی ریدنیا کو چھوڑ

تیری گلی آئی رے آئی رے

ہو سکے تو یہ گانا بھی کسی قسط میں فلما لینا۔ آجکل ڈراموں میں گانوں کو خوب جگہ ملنے لگی ہے۔

ہاں تو بات یہ ہے کہ ایک قسط میں تم نے بابو جی کے کہنے پر اس کم بخت تریپوراری (جیسے مال واڑی) کے ہاتھوں دھانی کو اغوا کرا لیا۔ ولم خود بخود پتنگ کے پیچھے ڈور کی طرح چلا آیا۔ موت کے ہاتھوں کھیلتے ہوئے دونوں فرار ہو کر ایک گھر میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ادھر مرن جوگا تریپوراری شکاری کتے کی طرح انھیں ڈھونڈتا، سونگھتا پھر رہا ہے۔ بابو جی علیحدہ تلملا رہے ہیں۔ ایسے گھمبیر حالات میں دھانی، ولم کو چھپ چھپ کر گھر کے اندر رہنا چاہیے۔ کوئی ضرورت نہیں انھیں مندر جانے کی اور بس اسٹینڈ پر جا کر دشمنوں کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنے کی۔۔اب ایسے میں کیا واجب تھا کہ تم انھیں گھر کے لان میں چہلیں کرتے، پانی سے کھیلتے ہوئے دکھاتے۔ تمہیں نہیں پتہ، ایسے میں ناظر کا سانس کتنا سوکھتا ہے کہ کسی باڑ، جنگلے یا نیچی دیوار سے دشمن کے آدمی نہ دیکھ لیں۔ اب عشق کی منزلیں وہ متوالے پار کر رہے ہیں اور بی پی دیکھنے والے کا سفر کر رہا ہے۔۔ ممکن ہے اگلی قسطوں وہ دونوں خیر خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائیں لیکن ناظر کو تو تمہارے طفیل ڈاکٹر کا منہ تاکنا پڑ سکتا ہے نا۔۔!

ڈیلی سوپ کی دونوں طرف بھر مار ہے۔ حالانکہ اس میں تمھارا اور تمہارے اداکاروں کا اتنا ہی نقصان ہے۔ چونک گئے نا، سمجھ سکو تو سمجھو لوڈ گڈی والے بھیا!

کیونکہ قدر کھو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔۔ وہی شکلیں وہی صورتیں جو شروع میں حسین و پرکشش لگتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن اپنی آب و تاب کھونے لگتی ہیں۔ ان کا میک اپ، کپڑے، صورت، سیرت واضح ہونے لگتی ہے۔ بندہ خود ہی سوچے کہ جو اداکارہ رات دن ٹی وی پہ ہوگی وہ اصل زندگی کی ذمہ داریاں کہاں نبھا پائے گی۔ اس کا پھوہڑ پن تو ڈرامہ میں روٹی بیلتے ہوئے واضح ہونے لگتا ہے۔

ویسے تم سے ایک شکوہ اور بھی بنتا ہے کہ سین میں کھانے کی ٹیبل پہ لاتعداد کھانے تو دکھا دیتے ہو۔ لیکن چائے کافی کے لیے اداکاروں کے ہاتھوں میں خالی مگ تھما دیتے ہو۔ جسے وہ چسکیاں لے لے کر پینے کی ایکٹنگ کرتے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا کنجوسی۔۔ ڈرامے کے اندر ڈرامہ۔۔؟ اس سے تو اچھا ہے کہ مگ میں گرم پانی ڈال دیا کرو۔ کم سے کم چینیوں کی روایت پوری ہو جائے گی۔

پھر سوپ میں ایک سین ختم ہونے کے بعد دوسرا سین شروع ہونے پر تمہارا کیمرہ پورے شہر پر گھوم جاتا ہے یا نئی نئی بنی شاہراہیں اور جلیبی کی طرح بل کھاتی موٹر وے نظر آتی ہیں۔ جسے کئی ڈراموں، سیریل میں دیکھ چکے۔ میری سہیلی میری بھابھی۔۔ میں تم نے ناظرین کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔ بھلا بتاؤ، ایسے موقع پر گاڑی کی تیز ہیڈ لائیٹ استعمال کرنے کی کیا تک ہے۔۔؟ کہ ناظر کو اپنی آنکھیں بچانے کے لیے ٹی وی سکرین سے منہ موڑنا پڑتا ہے۔ ورنہ تم نے تو اسے آنکھوں والے ڈاکٹر کے ہاں پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ تم۔۔انتظار فرمائیے۔۔ کی شیلڈ دکھلا دیا کرتے۔ اب کیسے کہیں اور کیا کیا کہیں۔۔؟

سُونا۔۔سُونا۔۔سُن لونا۔۔!

کہ ڈرامہ بناتے بناتے تم بڑے وہ ہو گئے ہو۔ ہاں ہاں ڈنکے کی چوٹ کہیں گے کہ تم بڑے ڈرامہ باز ہو گئے ہو۔ اور بزبانِ خاموشی کہہ رہے ہو ۔

نہ میں کوئی دھوکا کراں نہ کوئی ہیرا پھیری

نال پریم دے بیٹھ کے دیکھو میری ہتھ صفائی

محمد ظہیر قندیل

ہماری بددعاؤں میں اثر پروردگار آئے!

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی سیٹھ کی صورت ہو خدایا میری
ہو میرا کام امیروں کی حمایت کرنا
درد مندوں کی ضعیفوں کی مرمت کرنا
بھائی بھائی میں لڑانے کا ہنر دے مجھ کو
لیڈروں کی طرح پتھر کا جگر دے مجھ کو

یوں تو میں کالا نہیں، پر زبان میری بہت کالی ہے، میری گھٹی میں پڑی ہوئی گالی ہے، میرا ابا زیچہ نالی ہے، نالی بھی گندی والی ہے، میرا دماغ عقل سے خالی ہے، اس لیے کہا سنا معاف! سنا ہے آپ کے بڑے بھائی کی ایک سالی ہے، سنا ہے وہ بہت نخرے والی ہے، سنا ہے اس کے گالوں پر لالی ہے، سنا ہے اس کے کان میں ایک بالی ہے، سنا ہے کہ دوسری اس نے کھالی ہے، سنا ہے کئی بار اس نے اپنی شادی ٹالی ہے۔۔۔ اگر موقع دیں تو یہ خادم بھی آج کل خالی ہے۔ حضور غصے والی کیوں شکل بنالی ہے؟ ۔۔۔ مجھے غصہ نہ دلایئے، مجھے یاد نہ کرایئے کہ زبان میری کالی ہے۔ ”ہماری بددعاؤں میں اثر پروردگار آئے“

ہمارا حق اگر مارے تجھے دو سو بخار آئے
منگیتر کی سنے جب کال، موبائل بھی جل جائے
کئی دن بیکری میں ہی پڑا باسی پڑا کھائے
ہماری بد دعاؤں میں اثر پروردگار آئے

مجھ سے زیادہ مظلوم کون ہوگا، میری ولادت ہی میرے والدین کے لیے جھٹکا ثابت ہوئی، بارہویں بچے پر کون خوشیاں مناتا؟ قصور والدین کا تھا سزا مجھے ملی، شہد کی گھٹی کی جگہ دوا مجھے ملی، کھسرے بھی ناچنے آئے تو افسوس کا اظہار کر کے چلے گئے، خوف سے جب بھی والد کی جفا یاد آئی، اپنے دادا کی خطا یاد آئی۔ پیدا ہوتے ہی مجھ سے پوچھے بغیر رلایا گیا، مجھ سے پوچھے بغیر نہلایا گیا، حتیٰ کہ میرا نام مجھ سے پوچھے بغیر رکھ دیا گیا، نام کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر سب مجھے کاکا کہہ کر پکارنے لگے، تکلیف مجھے تب ہوتی جب خوب صورت لڑکیاں بھی مجھے کاکا کہتیں۔ میری صحت دیکھ کے مجھے فاقہ کہتیں۔ مجھ سے بڑے بہن بھائیوں نے مجھ پر خوب ہاتھ صاف کیے، کچھ تو میرا فیڈر ہی چھین کر پی جاتے، میں بھوک سے روتا تو اماں کہتی صبح سے ایک لٹر دودھ پی چکا ہے پھر بھی

روتا ہے۔ بھوکا کہیں کا۔ مجھے بھائیوں کے اترے ہوئے کپڑے نصیب ہوتے، افسوس تو اس وقت ہوتا جب بھائیوں کے دھلے ہوئے جمپر پہنائے جاتے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو احساس ہوا سگ باش برادر خورد مباش۔ مجھے تو یہ کہاوت یوں اچھی لگتی ہے سگ باش برادر سگ مباش۔۔۔۔ مجھ پر ستم ڈھائے گئے، قہر ڈھائے گئے، میں نے بھی خوب خوب بددعائیں دیں۔۔۔۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ مگر افسوس صد افسوس کبھی کسی بددعا کا اثر نہ ہوا۔ مگر یہ سننے کو ضرور ملا تمھاری زبان ہی کالی ہے۔ ٹوتھ پیسٹ سے، ماؤتھ واش سے، یہاں تک کہ شیونگ کریم سے بھی کلیاں کیں مگر زبان کا رنگ نہ بدلا۔۔۔۔ نہ رنگ بدلا نہ بددعاؤں میں اثر آیا۔ پھر صاحبِ صدر آپ ہی بتایئے کیا میں اس کالی زبان کا اچار ڈالوں یا مربا بناؤں۔۔۔۔ میری دو عادتیں گھر میں بہت مشہور ہیں ایک بددعائیں دینا۔۔۔۔ دوسری بھی یہی ہے۔ مگر اثر ہے کہ کوسوں دور ہے۔ میرے محلے کے لڑکے کی زبان میں اتنا اثر ہے کہ اس نے ایک بار بددعا مانگی۔ ’’یا اللہ میرا ابا مر جائے۔‘‘ دوسرے ہی دن اس کا ہم سایہ مر گیا۔ دیکھیے موت کا فرشتہ محلے میں آیا تو سہی۔۔۔ ایک پڑوسی نہ سہی دوسرا ہی سہی۔ میں نے سب سے بڑی بہن کو بددعا دی اللہ کرے تجھے، شرابی، بے ایمان اور گھٹیا

یہ دھاندلی ہے۔۔۔ میں اِن صاحب سے پہلے آیا تھا۔

شوہر ملے اگلے ہی دن اس کا رشتہ ایک سیاست دان سے طے ہو گیا۔ میں نے محلے کے لڑکے کو دعا دی اللہ کرے تجھے اونچا عہدہ ملے۔آج کل وہ کھمبے پر چڑھ ٹیلی فون ٹھیک کرتا ہے۔میں نے ایک اور لڑکے کو بد دعا دی اللہ کرے تو اندھا ہو جائے۔وہ آج کل کرکٹ امپائر ہے۔

یا خدا دے مرے دشمن کو بہت سی عزت
جانتا ہوں ، ہے اثر میری دعا کا الٹا

بد دعاؤں کے بھی کئی رنگ ہیں، کئی ڈھنگ ہیں، ہر طبقہ، ہر معاشرہ اپنے مطلب کی بد دعائیں دیتا ہے۔طالبِ علم کی بد دعائیں اسکول سے شروع ہوتی ہیں اور اسی پر ختم ہوتی ہیں، بارش ہو تو بد دعا کرتا ہے یا تو اسکول گر جائے، یا سیلاب آجائے۔ استاد نہر میں نہاتا دکھائی دے تو بد دعا: اللہ کرے ڈوب جائے۔ چھٹی ہو جائے۔استاد بھینس کے پاس سے گزرے۔اللہ کرے بھینس اسے ٹکر ہی مار دے۔اور تو اور مضامین کو بھی بد دعائیں: یہ میتھ منحوس کہیں سڑ جائے۔اف یہ بائیو! غرق ہو جائے، جان چھوٹے، مینڈکوں پر ذرا ترس نہیں کھاتے، اسے لیب میں ننگا لٹا لیتے ہیں اور پھر اف توبہ اس کی تو جان ہی نکال لیتے ہیں۔ کیمسٹری، عجیب مسٹری ہے، گندھک کیتیزاب میں کہیں ڈوب سڑے۔فزکس، اوہ میرے خدا موشن لاز کے خالق کو موشن لگ جائیں۔اردو کی غزلیات اور ان کی تشریحات! یا اللہ یہ آفات ہیں آفات۔میر اور غالب خود تو مر گئے، ہمیں ذلیل کر گئے۔ان کا محبوب اگر انھیں منہ نہیں لگاتا تھا تو اپنے منہ کی بد بو کا علاج کراتے، ہمارے اوپر تو یہ عذاب نہ ڈھاتے۔

نہ چھیڑو دردمندوں کو نہ جانے دل سے کیا نکلے
ہر اک بل میں نہ انگلی دو، نہ جانے بل سے کیا نکلے

بہت ہو گیا! اب مجھ سے بد دعائیں برداشت نہیں ہو رہیں۔
لیجیے اب میں بد دعائیں کرنے لگا ہوں

اللہ کرے۔۔۔بھارتیوں کے ٹینکوں میں کیڑے پڑیں۔اللہ کرے۔۔۔۔مودی کے تالو میں چھالا نکل آئے۔ اللہ کرے۔۔۔۔انڈین توپوں کو بواسیر ہو جائے۔اللہ کرے۔۔۔۔سیف علی خان کی ایک اور شادی ہو۔۔۔شادی کی رات وہ دلہن کا گھونگھٹ اُٹھائے۔۔۔آگے سے ابا مانکل آئے ابا ما نہیں تو اسامہ نکل آئے اور وہ بھی بن لادن۔اللہ کرے۔۔۔سارے بھارتی فوجی اپنے جہازوں کی طرح ''جہاز'' ہو جائیں۔اللہ کرے۔۔۔سارے بھارتی مرد ہیجڑے بن جائیں اور ہیروئینیں ہم سب میں تقسیم ہو جائیں۔۔۔اللہ کرے۔۔۔ دیپیکا پڈوکون، میرے بغیر قلفی کھائے تو اس کی قلفی گر جائے۔اللہ کرے۔۔۔دیپیکا کے تمام ہیرو چولھے کو کموڈ سمجھ کر اس پر بیٹھ جائیں۔اللہ کرے۔۔۔لوڈ شیڈنگ کرنے والے کے لوٹے میں مرچیں پڑیں۔۔اللہ کرے۔۔۔مہنگائی کرنے والے ماؤتھ واش کرنے لگیں تو تیزاب ان کے ہاتھ میں آجائے۔۔۔اللہ کرے۔۔۔مجھ سے زیادہ لائق بچوں کے پین جیب میں لیک ہو جائیں۔۔اللہ کرے۔۔۔دہشت گردوں کی شلواروں میں بچھو گھس کر ''اتی'' پا دیں۔اللہ کرے۔۔۔پاناما لیکس کرنیوالے کے دونوں پاؤں پینٹ کے ایک ہی پائنچے میں پھنس جائیں۔۔۔ اللہ کرے۔۔۔۔مری تحریر پر نہ ہنسنے والوں کا فیس بک اکاؤنٹ ہیک ہو جائے۔۔۔اللہ کرے۔۔۔وہ انگلش بولنے لگیں تو انھیں ''میرا'' یاد آجائے۔۔۔ہماری بد دعاؤں میں اثر پروردگار آئے

عاشق کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو میاں کنگال ملے
مرغی بھی کبھی نہ ہاتھ آئے جا تجھ کو چنے کی دال ملے

گالوں میں ترے پڑ جائیں گڑھے چہرے پہ نکل آئے چیچک
یہ ریشمی زلفیں جھڑ جائیں لگ جائے جوانی میں عینک
سسرا بھی تجھے خوں خوار ملے اور ساس بڑی چنڈال ملے
عاشق کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو میاں کنگال ملے

ہر سال ہو تیری گود ہری بچے ہوں تجھے دو چار درجن
پنکچر ہو ترے ناز و نخرے ہو تیری اداؤں کا ایندھن
ٹو بال ہے ٹیبل ٹینس کا، جا تجھ کو میاں فٹ بال ملے
عاشق کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو میاں کنگال ملے

خرّم بٹ

گدھا کون؟

سنا ہے گدھے سے کسی نے پوچھا کہ تم گدھے کیوں ہو تو اپنے لمبے کان ہلا کر کہنے لگا ''کیونکہ میں گدھا ہوں۔'' گدھے کے گدھے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسکی ولادت ہی گدھی کے ہاں ہوئی۔ وگرنہ وہ شیر، لومڑ یا ہرن بھی ہو سکتا تھا۔ نوعمری میں وہ گدھے کا بچہ کہلاتا ہے۔ اگرچہ تادمِ مرگ وہ گدھے کا بچہ ہی رہتا ہے لیکن جوان ہونے پر اسے گدھے کے بچے کی بجائے صرف گدھا کہ کر پکارا جاتا ہے۔ گدھے کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی ہمیشہ طاری رہتی ہے۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ گدھے کی آنکھیں رنجیدہ ہوتی ہیں لیکن انہیں ہم سنجیدہ بھی کہ سکتے ہیں۔ گدھا ایسا جانور ہے جسکا رویہ ہمیشہ گدھوں والا ہی رہتا ہے۔ انسان اور گدھے کا ساتھ نیا نہیں بلکہ آدم سے لے کر اب تک گدھا انسانوں کی لازوال خدمت پر معمور ہے۔ راستوں کا یاد رکھنا مسلسل اور انتھک محنت کرنا اور مالک کی وفاداری گدھے کی ایسی خصوصیات ہیں جو اسے انسانی معاشرے میں عزت تو نہ دلاسکیں لیکن ان خصوصیات ہی کی وجہ سے وہ انسان کی غلامی پر مجبور ہے۔ محض دو وقت کے گھاس پھونس کے عوض گدھے کو انسان کی غلامی کرتے ہزاروں سال بیت گئے لیکن وہ پھر بھی گدھا ہی رہا۔ اگرچہ بعض اوقات ضرورت کے وقت لوگ گدھے کو بھی باپ بنا تو لیتے ہیں لیکن محض ضرورت پوری ہونے تک۔ گدھے کے سر سے سینگ غائب ہونا گدھے کے عدم تشدد والے رویہ کی دلیل ہے۔ گدھے کے صبر کی انتہا کہ انتہائی غصے میں بھی محض ایک آدھ دولتی ہی جھاڑتا ہے وہ بھی شاذ و نادر۔ گدھے کی زندگی میں شاید دو ہی خوشیاں ہیں پہلی خوشی تو گدھی ہے جسے دیکھتے ہیں وہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتا ہے اور دوسری خوشی ریتلی مٹی ہے جس میں بہت شوق سے وہ الٹ بازیاں لے کر غسل کرتا ہے۔

کچھ دن قبل ایک گدھے والے کو گدھے پر ڈنڈے برساتے دیکھا۔ گدھا چونکہ شاید صراطِ مستقیم کا قائل ہے اس لیے ناک کی سیدھ میں چل رہا تھا اور اس کی کمر پر اسکی طاقت سے کچھ زیادہ ہی بوجھ لدا ہوا تھا میں نے پوچھا بھائی بوجھ اٹھا کر چل تو رہا ہے کیوں ڈنڈے مار رہے ہو بے چارے کو تو کہنے لگا کہ کیونکہ چلتے گھوڑے کو چابک نہیں مارنی چاہیے اور یہ گدھا ہے میں اسکی اس منطق پر خود کو گدھا محسوس کرنے لگا۔

انسان کے گدھے پر ڈھائے جانے والے جبر اور ظلم و ستم کی ایک طویل داستان ہے۔ اس کے گوشت کے بنے مزیدار پکوانوں

سے لے کراس کی کھال کے جوتوں اور جیکٹوں تک۔اس کی چربی کی کاسمیٹکس جسے انسان جانے انجانے میں اپنے چہروں پر ملتے ہیں۔مال برداری کے ساتھ ساتھ اسے ریڑھوں پر بھی جوتا جاتا ہے۔میدانوں اور پہاڑوں پر گدھا انسان کے لیے یکساں خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ان سب خوبیوں سمیت نبیوں کو اپنی پیٹھ پرسواری کروانے کے باوجود عزت و احترام کے حوالے سے گدھے کو انسانوں میں وہ مقام نہ مل سکا، جو دوسرے خونخوار جانوروں اور پرندوں نے پایا۔بھنبھوڑ کر،نوچ نوچ کر کھانے اور دوسرے کو شکار کرنے والوں کو انسانی معاشرے نے وہ مقام دیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔کوئی خود کو شاہین تصور کرتا ہے تو کسی کا نام شیر خان ہے اور کسی کو اس کی چیرہ دستیوں کے باعث چیتے کا خطاب دیا جاتا ہے حیرت اس بات پر کہ دانشوروں اور شاعروں نے بھی اپنی تحریروں میں شیروں، چیتوں، شاہینوں اور ان جیسے خونخواروں کو ہی رول ماڈل بنا کر پیش کیا۔یعنی طاقت اور جبر یہاں باعثِ تکریم ہے معاشروں میں جبر اور تشدد شاید اس لیے بھی زیادہ ہے کہ رول ماڈل جانور بھی حملہ کرنے والے اور اور نوچ کھانے والے ہی بنائے گئے۔اور یوں گدھا بے چارا حالات کا مارا اپنی تمام تر مشقت انسان دوستی اور وفاداری کے باوجود خود کو نہ منوا سکا کہ کہ کوئی طرم خان اپنے بیٹے کو میرا پیارا گدھا بیٹا کہہ کر پکارے بلکہ ہر کوئی اپنے بچے کو شیر پتر ہی کہتا ہے چاہے بیٹے میں گیدڑ کی سی خصلتیں ہی کیوں نہ پائی جاتی ہوں۔سکولوں میں اساتذہ ہوم ورک نہ کرنے والے طالب علم کو از راہِ تضحیک گدھے کا لقب دیتے وقت یہ بالکل بھی نہیں سوچتے کہ گدھے نے کبھی کام چوری نہیں کی۔وہ تو مسلسل اور انتھک محنت کا استعارہ ہے۔اگرچہ امریکہ نے اس حوالے سے گدھے کی زات پر ایک احسان عظیم یوں کیا ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنا انتخابی نشان گدھا رکھ لیا وہ بھی شاید اس لیے کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ گدھے نہیں ہیں محض انکا انتخابی نشان گدھا ہے۔

کیا کبھی کسی نے یہ سوچا ہے کہ جس کو ہم گدھا کہتے ہیں کیا وہ ہمیں انسان بھی سمجھتا ہوگا؟ سوال اگرچہ مشکل ہے لیکن اسکا

غالباً ۱۹۰۹ء کی بات ہے کہ مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔اے وکیل میرٹھ نے مولانا حالی کو اپنی شادی میں پانی پت بلایا۔شادی کے بعد مولانا حالی اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور بعض دوسرے بزرگ بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے مسکراتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ تنہا سے کہا ''اب اپنا تخلص بدل دیں، کیونکہ اب آپ تنہا نہیں رہے۔'' اس پر مولانا نے فرمایا ''نہیں مولوی صاحب یہ بات نہیں۔تن ہا تو یہ ابھی ہوئے ہیں۔'' اس پر تمام مجلس مولانا حالی کی جودتِ طبع پر حیران رہ گئی۔

جواب ہم تلاش کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں خود پر گدھے کی سی سنجیدہ کیفیت طاری کرنی ہوگی۔گدھے کی نظر سے خود کو اور دنیا کو دیکھنا ہوگا۔اگرچہ انسان اشرف لمخلوقات ہے لیکن اپنے اردگرد نگاہ دوڑائیں تو لاکھوں کروڑوں میں ایسے کتنے ہیں جو آپ کو اشرف مخلوق کے منصب پر پورے اترتے دکھائی دیں گے؟ یعنی انسان کو اپنے فکر و عمل سے ہی خود کو اشرف ثابت کرنا ہے۔ہو سکتا ہے جب ہم ایک سنجیدہ گدھے کی نگاہ سے اپنے معاشرے کو دیکھیں تو ہمیں انسانوں کی کھال اوڑھے خونخوار بھیڑیے، شیر، چیتے لکڑبھگو، بدمست ہاتھی، سانڈ، گینڈے، مکار لومڑ اور بندر بھی دکھائی دیں جنہوں اپنی بھوک اور حوس کی بنیاد پر بہت سے معصوم ہرن اور خرگوش نما انسانوں کو اپنی خوراک بنا رکھا ہے۔جو فصلوں کھیتوں، کھلیانوں اور چراگاہوں پر قابض ہیں۔گدھے کی سی سنجیدہ آنکھ سے دیکھنے پر آپکو بہت سے گدھے نما انسانوں کا بھی ہجوم دکھائی دے گا جن پر ضرورت سے زاید بوجھ لدا ہوا ہے اور سسک سسک کر زندگی کے ریڑھے کو گھسیٹ رہے ہیں۔اور ان پر مسلسل رعونت اور ظلم کے ڈنڈے برسائے جا رہے ہیں۔چند لومڑوں نے شیروں اور سے مل کر کتنے ہی محنتی ایماندار گدھوں کو محض دو وقت کے کھانے کے عوض یرغمال بنا رکھا ہے۔اور یہ گدھے اس لیے گدھے ہی ہیں کہ یہ خونخوار نہیں بن سکتے تھے۔

کیا کبھی کسی نے سوچا ہے کہ جس کو ہم گدھا کہتے ہیں کیا وہ ہمیں انسان بھی سمجھتا ہوگا؟ یا پھر ہو سکتا ہے کہ گدھوں کو ہم جیسے انسانوں کے بیچ رہ کر اپنے گدھے ہونے پر فخر ہو۔

سیّد ممتاز علی بخاری

کہتے ہیں دیوار اور دروازے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دیوار نہ ہو تو پھر دروازہ بھلا کس کام کا؟ جس طرح دیوار دیدار میں رکاوٹ کا دوسرا نام ہے اسی طرح دروازہ دیدار کے لیے ایک پُل کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ سنا ہے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں لیکن آج تک ہمیں اُن کے کان نظر نہیں آئے اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ اُن کانوں کی شکل و صورت کیسی ہے؟ ان کا سائز کیا ہے؟ ان کی طاقت کتنی ہے؟ ہماری تحریر میں جابجا آپ کو لفظ گیٹ **(Gate)** نظر آئے گا۔ دراصل معزز دروازوں کو انگریزی زبان میں گیٹ کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ چھت کے سوا گھر نہیں ہو سکتا لیکن چُپ شاہ کے نزدیک دیواروں کے بغیر گھر نہیں ہو سکتا۔ عورتوں کو چار دیواری کا درس دینے والے اکثر حضرات اپنی راہ میں ایک دیوار بھی برداشت نہیں کرتے۔ دیوار کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا وہاں سے راستہ نہیں بنا سکتا۔ صرف چور اور ڈاکو اپنی مرضی سے جہاں سے چاہتے ہیں راستہ بنا لیتے ہیں چاہے وہاں دیوار ہو یا بیمار۔ یار لوگ تو دار کو بڑا دروازہ کہتے ہیں بلکہ بل گیٹس کو بھی ''گیٹ'' (دروازہ) ہی سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک بھی وہ دروازہ ہی ہے دولت بے پناہ کا۔

خیر آج ہم نے سوچا کہ آپ حضرات کو مختلف قسم کی دیواروں اور دروازوں کی اقسام سے متعارف کروا لیں تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

۱۔ کالج کے دَر و دیوار یہ دیواریں بڑی خوش قسمت ہوتی ہیں۔ ان پر آئے دن نت نئے سیاسی گروہ اپنی تشہیر کے لیے چاکنگ کرتے ہیں پھر اُن پر پینٹ یا رنگ پھر جاتا ہے۔ اگلے روز ایک نئی عبادت یوں جگمگا رہی ہوتی ہے جیسے کہ اُسی کے لیے یہ دیوار بنائی گئی ہو۔ بعض اوقات اوپر تلے تحریر کی گئی چاکنگ بارش وغیرہ سے دھل کر کچھ یوں بن جاتی ہے کہ لکھنے اور پڑھنے والے دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے کچھ اسی طرح کی وال چاکنگ دیکھی جس میں لکھا تھا کہ 25 ستمبر کو ملک کے مشہور و معروف حکیم صاحب میں کرکٹ کا ایک نمائشی میوزیم ہے جس میں تھیٹر کے بڑے فنکار بھی شامل ہوں گے۔ قربانی کی کھالیں ہمیں دے کر ٹکٹ بک کروائیں ورنہ حکومت ذمہ دار نہ ہو گی۔ حکیم صاحب کے جسم میں کرکٹ گراؤنڈ، کرکٹ میں تھیٹر کے فنکاروں کا کھیل، اور کرکٹ کا میوزیم بڑے عجیب و غریب انکشافات تھے لیکن سب سے انوکھا انکشاف یہ تھا کہ قربانی کی کھالوں کا ایک نیا مصرف بھی سامنے آ گیا تھا۔ جب ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ بارش اور بادو باراں نے نصف درجن اشتہاروں کا بھرتہ بنایا ہوا ہے۔

عموماً کالج کے گیٹوں کو بھی زنانہ اور مردانہ کالج کے حوالے سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بوائز کالج کے گیٹ عموماً

ویران ہوتے ہیں جبکہ گرلز کالج کے گیٹوں پر زیرِ تعلیم طالبات کے علاوہ بے شمار لڑکے بھی نظر آتے ہیں۔ بعض تو لڑکیوں کے خونی رشتہ دار ہوتے ہیں اور بعض جنونی رشتہ دار بننے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ ہم تو یونیورسٹی کے دَر و دیوار کو بھی اسی فہرست میں رکھا کرتے ہیں۔ البتہ مخلوط تعلیم دلانے والے اداروں کے گیٹ بہت پُر رونق بنے رہتے ہیں۔۔۔ ہمیشہ! یوں تو روزانہ قوم کے مستقبل کے یہ ضامن وقت مقررہ پر اپنے فرائض سر انجام دینے کے لیے موجود ہوتے ہیں لیکن ایک روز ایسا بھی آتا ہے جب گرلز اور بوائز کالجوں کے گیٹ ایک سا منظر پیش کرتے ہیں اور وہ دن ہوتا ہے اتوار کا۔ اکثر اوقات کالجز کے یہ دروازے اور دیواریں سیاسی تنظیموں کے درمیان نزاع کا باعث بنتے ہیں۔ کہیں جھنڈے لگانے، اکھیڑنے پہ جھگڑا، کہیں چاکنگ کرنے مٹانے کی لڑائی تو کہیں کسی سیاسی تنظیم کی ہڑتال پر گیٹ کے کھلے رہنے یا بند رہنے پر چپقلش۔۔۔!

۲۔کوچۂ محبوب کے دَر و دیوار ایک مشہور قول ہے کہ محبوب کی گلی کا کتا بھی عشاق کو محبوب ہی ہوتا ہے کیونکہ اس کا اُن کے محبوب کی گلی سے ایک تعلق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے محبوب کے گھر کے دَر و دیوار تو خصوصی اہمیت کے حامل ہوئے۔ یار لوگ تو محبوب کے گھر کی دہلیز کو اتنا متبرک سمجھتے ہیں کہ کئی ایک تو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اس سمت سجدوں کی اجازت مانگتے پھرتے ہیں۔ محبوب کے آشیانے کی دیواروں کو لمس کی حس بہت ہی طاقت ور ہوتی ہے۔ اس لیے عموماً عاشق اُن سے لپٹ لپٹ کر روتے ہیں۔ اگر عشق کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہو تو پھر عاشق محبوب کے دَر و دیوار کو ایک نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دیوار اور دروازے میں فرق اتنا ہوتا ہے کہ دروازے پر سکیورٹی گارڈ یا گھر کے کسی نگران کی نظر ہوتی ہے جبکہ دیواروں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ اسی لیے وہ دروازوں کے بجائے دیواریں پھلانگنا آسان سمجھتے ہیں کیونکہ یہ آسان راستہ بھی ہوتا ہے اور محفوظ بھی۔

اگر آپ ہماری اردو شاعری کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ محبوب کے دروازے پر ایک نادیدہ رکاوٹ لگی ہوتی ہے۔ اس رکاوٹ کو عبور کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اکثر جوشیلے مگر بزدل عاشق جو آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے

یہ باتیں تری ۔۔۔

دعوے دار ہوتے ہیں ان سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ وہ ان نادیدہ جالوں کو توڑ پائیں جو محبوب کے گھر کی دہلیز پر لگے ہوتے ہیں۔

کچھ حضرات تو محبوبہ کے بھائیوں کو بھی دیوار سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن ان دیواروں کو پھلانگنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اکثر عاشق یہیں سے واپس ہو لیتے ہیں۔ ڈر کر یا مار کھا کر۔۔۔۔۔!

۳۔ ٹھیکے والے دَرودیوار یہ دروازے اور دیواریں ٹھیکے داروں نے بنائی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض دیواریں تو آدھی بنی ہوتی ہیں اور بعض کی تعمیر تو مکمل ہو چکی ہوتی ہے لیکن یہ بنتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔ عموماً ٹھیکے دار حضرات پیسے تو پورے سامان (میٹریل) کے لے لیتے ہیں لیکن استعمال کرتے وقت ڈنڈی بلکہ ڈنڈا مارتے ہیں اور بقایا سامان (میٹریل) کے پیسے اپنے جیب میں ڈال دیتے ہیں تاکہ مرنے کے بعد دوزخ میں ایک عظیم الشان محل کی تعمیر کی جاسکے۔

اسی لیے ٹھیکے والی دیواریں ایسی ہوتی ہیں کہ ذرا کسی نے ٹیک لگائی اور یہ دھڑام سے نیچے۔ ان دیواروں پر اگر غلطی سے کوئی کوا آکر بیٹھ جائے تو یہ اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ ہم نے ایک بار مشہور مفکر چُپ شاہ سے پوچھا کہ یہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون کی عمارتیں جہازوں کے ٹکرانے سے کیسے گریں؟ تو انہوں نے انکشاف کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ جہاز تو جہاز اگر کوئی اڑتا مچھر بھی ان عمارتوں سے ٹکرا جاتا تو بھی ان عمارتوں نے زمین بوس ہو جانا تھا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بتانے لگے کہ دراصل یہ عمارتیں ٹھیکے پر تعمیر کی گئی تھیں۔ ٹھیکے پر تعمیر ہونے والی عمارتوں کے اندر ایک اور کجی رہ جاتی ہیں اور وہ یہ کہ ایسی عمارتوں کے دیواریں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، ہوا کے دباؤ سے۔

چُپ شاہ کے نزدیک پیسا ٹاور کا ٹیڑھا ہونا اس کی ٹھیکے پر کی گئی تعمیر کی پہچان ہے۔ ہم ساری ٹیڑھی دیواروں کو ٹھیکے داروں کی غلطی نہیں قرار دے سکتے کیونکہ کئی دیواریں اتنی نیک ہوتی ہیں کہ وہ رکوع و سجود کے لیے کعبے کی سمت جھک جاتی ہیں اور ہم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ شاید ٹھیکیدار نے دیوار کی تعمیر میں کوئی ڈنڈی ماری

فلمی اخبار کے ایڈیٹر مجازؔ سے انٹرویو لینے کے لئے مجازؔ کے ہوٹل پہنچ گئے۔۔۔انہوں نے مجازؔ سے ان کی پیدائش، عمر، تعلیم اور شاعری وغیرہ کے متعلق کئی سوالات کرنے کے بعد دبی زبان پوچھا ''میں نے سنا ہے قبلہ، آپ شراب بہت زیادہ پیتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟''

''کس نامعقول نے آپ سے یہ کہا کہ میں شراب پیتا ہوں'' مجاز نے کہا۔

''تو پھر آپ سگریٹ کثرت سے پیتے ہوں گے؟''

''نہیں میں سگریٹ بھی نہیں پیتا، شراب نوشی اور سگریٹ نوشی دونوں ہی بری عادتیں ہیں۔ اور میں ایسی کسی بری عادت کا شکار نہیں۔'' مجاز نے جواب دیا۔

ایڈیٹر نے سنجیدہ لہجہ میں پوچھا ''تو آپ میں کوئی بری عادت نہیں ہے؟''

مجاز نے اتنی ہی سنجیدگی سے جواب دیا ''مجھ میں صرف ایک ہی بری عادت ہے۔۔۔کہ میں جھوٹ بہت بولتا ہوں۔''

ہوئی ہے۔ کچھ یہی حال ٹھیکے پر بنائے دروازوں کا ہے۔ کبھی زنگ آلود لوہے کو پینٹ (رنگ و روغن) کر کے فروخت کیا جاتا ہے تو کبھی اس پرانی لکڑی کو جسے اندر سے کیڑوں نے کھا لیا ہو، رنگ و روغن کر کے منہ مانگے دام وصول کیے جاتے ہیں۔ ایسے دروازے اکثر موت کے ہرکارے کے ساتھ مل کر اپنے مالک سے دغا کر جاتے ہیں اور انسان کو زمین کی پستیوں سے بلند آسمان کی وسعتوں میں پہنچا دیتے ہیں۔ ان دروازوں سے تو سوچ کے دروازے زیاد مضبوط ہوتے ہیں۔

۴۔ وی آئی پی دَرودیوار یہ دَرودیوار اپنی اہمیت کے حوالے سے سب سے منفرد اور ممتاز ہوتے ہیں۔ ملک کے اندر پائی جانے والی اعلیٰ مقتدر شخصیات اور اہم اداروں کے اردگرد اسی قسم کے دروازے اور دیواریں ہوتی ہیں۔ یہ دیواریں اونچائی میں تمام دیواروں سے اونچی ہوتی ہیں اور دروازے ہوشیار اور حساس۔ دیواروں نے خار دار تاروں والا لباس پہنا ہوتا ہے۔ عام دیواروں کے برعکس ان دیواروں کے کان نہیں ہوتے البتہ

آنکھیں ہوتی ہیں اور ان گنت تعداد میں جن کے اندر عقاب کی نظروں سے پھرتی ہوتی ہے۔ وی آئی پی دروازے بھی دوسرے دروازوں سے کچھ الگ ہی شان رکھتے ہیں۔ وہاں بے شمار سکیورٹی گارڈز ان کی حفاظت پر مامور ہوتے ہیں اور یہ دروازے بازبان ہوتے ہیں۔ یہ بول کر بتا سکتے ہیں کہ آنے والا انسان کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ دلہن کی خاموشی اقرار کی علامت سمجھی جاتی ہے جبکہ ان دروازوں کی خاموشی انسان کے پرامن اور سادہ ہونے کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔ اگر ان دروازوں میں سے کوئی ایسا ویسا آدمی گزر جائے تو یہ چیخ چیخ کر آسمان بادلوں سمیت اپنے سر پر اٹھا لیتے ہیں اور نتیجتاً پورا ماحول سنگینوں کی زد میں آ جاتا ہے اور اگر بات کچھ زیادہ شدت کی ہو تو پستولوں کی گھن گرج کے ساتھ گولیوں کی بونداباندی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دروازے عام دروازوں سے کافی مہنگے ہوتے ہیں۔ ایسے در و دیوار VIPs کو عام لوگوں کی پہنچ اور رسائی سے دور رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے دواؤں کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھا جاتا ہے اور رکھا جانا چاہیے۔

۵۔ تاریخی دَرودیوار جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ ان دَر و دیوار کی اہمیت مسلمہ ہے۔ چاہے غیر مسلموں کے دیس ہی میں کیوں نہ ہوں۔ پہلے تذکرہ کرتے ہیں دیواروں کا تو صاحبو! دیوارِ برلن اور دیوار، عراق (جو امریکہ نے 2003 کے عراق پر قبضے کے بعد بنائی تھی) بہت مشہور ہیں۔ ان دیواروں کا یہی کام ہے کہ وہ بنی نوع انسان میں تفریق پیدا کر سکیں اور ان کے درمیان نفرت کے بیج بو سکیں لیکن ایک ایسی تاریخی دیوار بھی ہے جو بنی نوع انسان کی حفاظت کے لیے تعمیر ہوئی وہ ہے دیوارِ چین۔۔۔! تاتاریوں کے حملوں سے بچنے کے لیے یہ دیوار بنانے والوں کے علم میں بھی نہیں تھا کہ لوگ چاند سے جا کر اس دیوار کو تکتے رہیں گے۔ ایک دیوار ان دنوں انڈیا بھی لائن آف کنٹرول پر بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک تاریخی دیوار سکندر نے بھی بنائی تھی جس میں یاجوج ماجوج کو قید کر دیا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے سیاستدان کیسے اس دیوار کو پھلانگ آئے۔ باقی قوم ابھی قیامت کی منتظر ہے۔ دروازوں یعنی گیٹوں کے حوالے سے ہمیں پچھلے زمانوں میں کچھ روایات ملتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ہر شہر پناہ کا ایک بلکہ کئی گیٹ ہوتے تھے۔ لیکن آج کل کے دور میں سوائے لاہور کے کسی بھی شہر کے دروازوں کا ذکر نہیں ملتا۔ اس شہر میں لوہاری گیٹ، بھاٹی گیٹ، موچی گیٹ وغیرہ موجود ہیں۔ یہ سارے گیٹ انگریزوں سے بھی پہلے کے بنے ہوئے ہیں اور مغلیہ سلطنت کی یادگار ہیں۔

۶۔ عام دَرودیوار اس قسم کے درودیوار آپ کو ہر طرف نظر آئیں گے۔ یہ دیواریں اتنی ہی کمزور ہوتی ہیں جتنے ان کے مکین غریب ہوتے ہیں۔ یہ گھر کی حفاظت کی خاطر تعمیر کی جاتی ہیں لیکن چور حضرات ان سے مک مکا کرنے کے بعد ان کو پھلانگ کر گھر والوں کو ان کے سرمائے سے محروم کر دیتے ہیں۔ پھر لوگ پولیس کو رپورٹ تک نہیں کروا سکتے۔ اس لیے کہ چوروں نے اتنی رقم چھوڑی ہی نہیں ہوتی کہ مظلوم بے چارہ پولیس والوں کو تحفے میں دے سکے اور تحفے کے بغیر تو ہمارے ہاں پولیس والے صرف ''کمال'' کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری پولیس اور جاپانی ایک ہی فلسفے پر عمل پیرا ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا فرق ایسا ہے جو ہماری پولیس کی عظمت کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جاپانی حضرات تحفے لینے اور دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور ہماری پولیس صرف تحفے لینے کی مشتاق ہے۔

کچھ اسی قسم کی دیواریں اور گیٹ سڑکوں کے بھی ہوتے ہیں۔ سڑک کی دیواریں مفرور مجرم جیسی ہوتی ہیں تبھی تو ان کو لوہے کی سلاخوں سے باندھا ہوتا ہے یا پھر سٹیل یا ایلومینیم کی تاروں سے۔۔۔! چُپ شاہ کا کہنا ہے کہ شاید دروازوں کی اہمیت یہیں تک محدود رہتی لیکن بھلا ہو امریکہ کے صدر نکسن کا جس نے واٹر گیٹ سکینڈل کا حصہ بن کر گیٹوں کو ایک نئی زندگی دی۔ اسی طرح دروازے حسین حقانی اور منصور اعجاز کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے میمو گیٹ سکینڈل تخلیق کیا اور اکیسویں صدی میں بھی دروازوں کا بول بالا کیا۔

شوکت علی مُظفّر

بیوی کی مار

ہمارے دیرینہ دوست مَلک صاحب تو ملنگ ٹائپ ہیں ہی مگران کی اہلیہ تو اُن سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔اس کا ثبوت ہمیں وقتاً فوقتاً ملک صاحب کی ظاہری حالتوں سے ہوتا رہتا ہےاور کبھی کبھارتو یہ خود بھی اہلیہ کے قصے سناتے رہتے ہیں جس سے ان کی گھریلوصورتحال کا علم رہتا ہے۔مگرآج صبح صبح ہی ملک صاحب کواپنے دروازے پر پا کر ہمیں حیرت ہوئی... حیرت اس بات پرنہیں کہ وہ نمازِ فجر کے بعد ہی ہم سے ملاقات کے لیے آگئے بلکہ حیرت ان کے سوجے ہوئے منہ کودیکھ کر ہوئی، جا بجا ناخن کی خراشیں ان کے چہرے پر واضح تھیں۔ایک آنکھ تو اتنی سوجی ہوئی تھی، مَلک ہمیں کوئی بھوت لگ رہا تھا۔ہم نے دریافت کیا ''کیا ہوا؟ کہیں ڈاکوشاکو تو گھر پرنہیں آگئے جنھوں نے لوٹ مار کے دوران یہ حالت بنادی ہو؟؟''

''ہونہہ ڈاکو...جس گھر میں تمہاری بھابھی جیسی عورت ہو اس میں ڈاکوبھی آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ یہ سب کیا دھرا بھابھی کا ہے؟''

''اورنہیں تو کیا...پتہ نہیں کہاں سے اسے یہ خبر مل گئی کہ جب سے انسانی حقوق کے قومی ادارے نے کہا ہے کہ سعودی عرب میں شوہروں پر تشدد کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ رکن شوریٰ اور مملکت کے ممتاز عالم دین شیخ عبدالحسن نے فتویٰ دیا کہ تشدد کی شکار خواتین کواپنے شوہروں کی پٹائی کا حق حاصل ہے تو آج صبح صبح جب میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے بھی جواب دیا، مجھے غصہ آیا اور ایک تھپڑ رخِ روشن پر جڑ دیا...بس پھر کیا تھا...کب تک شمع جلی کچھ یادنہیں،وہاں سے جان بچا کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔''

ابھی یہ بات ہوہی رہی تھی کہ بھابھی بھی آتی دکھائی دیں۔ ملک صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً مخالف جانب دوڑ لگادی۔ہم روکتے رہ گئے مگر وہ تو نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے،البتہ بھابی محترمہ ہمارے سامنے کھڑے ہوکر غصے سے گھورے جارہی تھیں

''آپ نے ہی انہیں مشورہ دیا ہوگا بھاگنے کا۔''

ہم اس بات کا مناسب جواب دینے ہی والے تھے کہ بھابی نے فرمایا ''اب دیکھنا،ان جیسے شوہروں کا کیا حال ہوتا ہے... اب تو فتویٰ مل گیا...کب تک بھاگتے پھریں گے، بڑے آئے بیویوں پر ہاتھ اُٹھانے والے۔''

ہم نے بڑی مشکلوں سے بھابھی کو سمجھایا کہ شوہر سر کا تاج ہوا کرتے ہیں، اُنہیں اس طرح گلیوں میں نہیں رولتے اور یہ فتویٰ سعودیہ میں شوہروں کا تشدد بڑھنے کی وجہ سے دیا گیا پاکستان کے لیے نہیں، تو جھٹ سے بولیں ''بیویاں بھی گھر کی ملکہ ہوتی ہے، جانور نہیں کہ جب چاہا مار پیٹ شروع کردی چاہے پاکستان ہو، سعودیہ ہو یا کوئی اور ملک۔''

ہمیں یقین تھا کہ یہاں جانور سے مراد اُن کے ذہن میں ''محنتی جانور'' ہوگا جسے خوامخواہ ہی مار پڑتی رہتی ہے اور ضرورت کے وقت لوگ باپ بھی بنا لیتے۔ خیر بھابی آندھی کی طرح آئی تھیں اسی طرح لوٹ گئیں اور ہمیں ملک صاحب جیسے لوگوں پر ترس آنے لگا جو خوامخواہ ہی بیویوں پر محض رعب جمانے کی خاطر یا ویسے ہی مردانگی کے زعم میں مار پیٹ سے کام لیتے ہیں۔ مذکورہ فتویٰ کے بعد تو اُنہیں بھی اینٹ کا جواب اینٹ سے ہی ملنے کی توقع ہے کہ عورتوں کی فطرت ہے، پیار بھی حد سے بڑھ کر اور مار ۔۔۔وہ تو ملک صاحب کے ایک تھپڑ کے بدلے پڑنے والے گھونسوں اور خراشوں سے واضح ہے۔

مذکورہ فتویٰ آجانے سے ہم نے چند شادی شدہ حضرات سے اِس بابت مستقبل کے بارے میں دریافت کیا تو چند ایک نے کہا ''اِس سے ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ ہماری بیوی تو پہلے ہی ہر بات کا جواب برابر چکانے کی عادی ہے۔'' ایک صاحب نے فرمایا ''اب تو لگتا ہے گھر میں بھی ہیلمٹ پہن کر گھومنا پڑے گا کہ کچھ پتا نہیں کچن سے کون سا برتن کب برس جائے۔'' ایک اور صاحب کے بقول ''بیوی کو مارنے کا حق مل جانا غیر فطری سی بات معلوم ہوتی ہے، البتہ تنگ آمد بجنگ آمد ایسی بیویاں (تشدد زدہ) کسی فتوے کے انتظار سے قبل ہی، موقع ملتے ہی جان چھڑاتی آئی ہیں، کچھ اپنے شوہروں کو قتل کردیتی ہیں یا پھر گھر چھوڑ دیتی ہیں۔'' ایک سرکاری ملازم کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں ''بیویاں بہت پکاتی (دماغ) ہیں۔ بری ہوں تو ان سے خدا کی پناہ ہے مگر اچھی ہوں تو اور زیادہ پکاتی ہیں اب مستقبل میں نجانے کیا صورتحال ہوگی، گھر میدان جنگ بنے ہوں گے۔''

ایک محترمہ نے فرمایا ''فتویٰ آجانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، سوائے ان عورتوں کے جو پہلے اس قسم کی حرکتیں کرتی رہتی ہیں، اب اُنہیں جواز مل گیا اور خوشی بھی ہوئی ہوگی کہ خواتین کے حقوق مردوں سے کم نہیں لیکن پاکستانی معاشرہ، مشرقی معاشرہ کہلاتا ہے اور اسلام کے ساتھ ساتھ مشرقی رسم و رواج میں بیویوں کی اکثریت اپنے شوہروں کے تشدد کو بھی پیار کا ہی حصہ سمجھ کر برداشت کرتی ہیں اور گھر ٹوٹنے سے بچانے کے لیے اپنی آخری سانس تک کوششوں میں لگی رہتی ہیں۔'' ایک لیڈی ڈاکٹر کے خیالات ''پاکستانی بیویاں جتنی بھی پڑھ لکھ جائیں اکثریت اپنے شوہروں پر ہاتھ اٹھانے سے گریز ہی کرتی ہیں اور ان کی مار پیٹ کو بھی مزاجی خدا کا تحفہ سمجھ کر ہنسی خوشی سہہ لیتی ہیں اور حرفِ شکایت تک زبان پر نہیں لاتیں، بہت کم ایسی ہوں گی جو اس انتہائی اقدام کی جانب راغب ہوتی ہوں گی۔'' ایک محنت کش نے کہا ''ہماری بیوی ہمارے سامنے بول نہیں سکتی وہ مارے گی کیسے۔۔۔؟ چاہے دس فتوے آجائیں۔''

بہر حال یہ فتویٰ اپنی جگہ لیکن عورت کائنات کا حسن ہے اور بدذوق انسان ہی خوبصورتی کے بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔ ویسے بھی عورت کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے، اِسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے تو ٹوٹ سکتی ہے، اچھے شوہر وہی ہیں جو ایسا موقع ہی نہ آنے دیں کہ ان کی اہلیہ کا ہاتھ ان کے گریبان تک آئے۔۔۔ ورنہ آج کی عورت بھی بروس لی اور سنجے دت کی فلمیں دیکھ دیکھ کر داؤ پیچ سیکھ چکی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو، مرد حضرات ولن بننے کی کوشش کریں تو ہیروئن مار مار کے زمین چاٹنے پر مجبور کردے۔ اور خواتین کو بھی یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ شوہر بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں، ضد پر آجائیں تو کسی کی نہیں سنتے، مارے اور زیادہ بگڑ جاتے ہیں جبکہ پیار سے ہر بات مان جاتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شوہر کتنی عمر کے بچے ہوتے ہیں تو سمجھ لیجئے، اتنی چھوٹی عمر کے بچے کہ اگر چار بیویاں مل کر بھی پالیں تب بھی ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔۔۔!!

محمد اشفاق ایاز

یہ دنیا عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔ عجائبات وہ ہی نہیں جن سے عجائب خانے بھرے ہوئے ہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے کچھ واقعات بھی ہیں جنہیں دیکھ کر یا پڑھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے اور دل بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ''کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟'' حالانکہ اس وقت تک تو بہت کچھ ہو بھی چکا ہوتا ہے۔

سکاٹ لینڈ سے تازہ تازہ خبر آئی ہے کہ وہاں ایک مرغی کو قانون پر عمل نہ کرنے پر گرفتار کرلیا گیا ہے اور یہ خبر پاکستانی اخبارات میں باتصویر ایسے شائع ہوئی ہے جیسے اس مرغی کا تعلق حکمران خاندان سے ہو اور اس کے گھر سے فرار ہونے سے کئی خاندانی پوشیدہ راز افشا ہونے کا اندیشہ ہو۔ ہوا یوں کہ اسکاٹ لینڈ کے شہر ڈنڈی میں ایک مرغی ایسٹ مارکیٹ گیٹ کی ایک مصروف سڑک کو عین رش کے اوقات میں عبور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں سے گزرنے والی ایک گاڑی کے مالک نے جب مرغی کو یوں آزادانہ اور بے حجابانہ سڑک سے گزرتے دیکھا تو اس کی غیرت نے جوش مارا، حالانکہ اگر اس مرغی کی جگہ کوئی میم برہنہ حالت میں بھی گھوم رہی ہوتی تو اس کی غیرت ''سائلنٹ'' پر ہی لگی رہتی کیونکہ وہاں شخصی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے مگر وہاں کوئی نوجوان لڑکی نہیں بلکہ ایک مرغی تھی جو سڑک کے بیچوں بیچ کسی کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ اس شخص نے فوراً پولیس کو فون کر ڈالا۔ یہاں آکر خبر نگار خاموش ہے کہ کہیں اس مرغی کو اکیلے دیکھ کر گاڑی کے مالک کی نیت میں فتور تو نہیں آ گیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے مرغی کو پکڑنے کی کوشش کی ہو۔ جب ہاتھ نہ آئی تو ''تھو کڑوی'' کا نعرہ بلند کیا اور پولیس کو بلا لیا۔ پولیس بھی ایسی فرض شناس کہ فوراً جائے وقوعہ پر پہنچی۔ گاڑی کے مالک نے اصل بات تو چھپالی۔ صرف اِتنا بیان دیا کہ اس مرغی کی وجہ سے لوگوں کو مصروف سڑک پر سفر جاری رکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس بیان کو حتمی جانتے ہوئے پولیس نے مرغی کو گرفتار کیا اور پولیس اسٹیشن لے گئی۔ اب پولیس نے اس مرغی کے اصل وارثوں کی تلاش کے لیے جانوروں کی تنظیم سے رابطہ کرلیا ہے اور مالک کے نہ ملنے تک اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اس ادارے کو سونپ دی گئی ہے۔ خبر نگار نے یہ بھی کہا ہے کہ پولیس کی جانب سے یہ اپیل بھی کی گئی ہے کہ اگر کسی کو اُس مرغی کے مصروف ترین سڑک پار کرنے کی وجہ معلوم ہو تو وہ رابطہ کر کے آگاہ کریں۔

ہمارے خیال میں خبر کا آخری حصہ بہت ہی اہم ہے۔ اُس انگریز پولیس کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لگتا ہے اسے مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ ٹریننگ کے اس اہم حصے کے لئے اسے پاکستان کی پولیس سے رابطہ کرنا چاہئے۔ پاکستانی پولیس ہے اس مت ماری انگریز پولیس کو بتا سکتی ہے کہ ''مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے'' کی اصل تشریح کیا ہے۔ اور اس کا استعمال کہاں کہاں کیا جا سکتا ہے۔ جب اس مرغی کو پولیس سٹیشن لے ہی گئے تھے تو پھر بھلا اسے جانوروں کی تنظیم کے حوالے کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

انگریز باغی مرغی کے گھریلو، سماجی، رفاعی اور سیاسی کردار کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ تفتیش کو آگے بڑھایا جائے۔ یہ پتہ چلانا ضروری ہے کہ مرغی صاحبہ گھر سے ناراض ہو کر نکلی تھی، بغاوت پر اتر آئی تھی، کسی کے بہکاوے میں آگئی تھی یا حقوق مرغیاں کی میر کارواں بن کر روڈ بلاک کرنے کے چکر میں تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انڈے دے دے کر زندگی سے اِتنا تنگ آچکی ہو کہ خودکشی کے ارادے سے مصروف سڑک پر آنکلی ہو۔

ایک ایسی ہی بے باک اور لیڈر نما مرغی پاکستان کے ایک تھانے میں چلی گئی۔ پھر ''تیری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ'' جانا اس نے کہاں تھا، بڑے ادب اور احترام کے ساتھ تھانے کے باورچی خانے لے جائی گئی۔ جب تک اس کے مالک کو خبر ہوئی کہ وہ اسی تھانے میں داخل ہوتے دیکھی گئی تھی، اُس وقت تک اس کا گوشت صاحب لوگوں کے خون کا حصہ بن چکا تھا۔

یہاں مجھے وہ میراثی یاد آرہا ہے جس کے گھر چوہدری صاحب کا مرغا کچھ جگتیں کچھ لطیفے سننے چلا آیا۔ میراثی کو علم تھا کہ چوہدری صاحب کو یقین ہوگا کہ ان کا پیارا مرغا اُسی کے گھر آیا ہے۔ میراثی نے مرغے کو ذبح کر کے اس کی کھال گھر کے دروازے پر لٹکا دی اور گوشت پکا کر کھا گیا۔ حسب توقع تھوڑی دیر بعد چوہدری صاحب اُس کے گھر میں داخل ہوئے اور اس سے مرغے کا پوچھا۔ میراثی بھی خاندانی تھا، فوراً بولا ''جی چوہدری صاحب آپ کا مرغا اِدھر آیا تھا۔ اس نے اپنی وردی یہاں اتاری اور بھیس بدل کر کسی مرغی کے ساتھ گاؤں سے باہر چلا گیا ہے۔''

یہ تو پھر مرغیوں کا حال ہے۔ ایک اچھے بھلے انسان کو ایک رات تھانے کی حوالات میں گزارنا پڑ جائے تو صبح تک اُسے اپنا نام ٹھیک طرح یاد نہیں رہتا۔ تھانے والے اسے کچھ اس طرح ''روحانی وجسمانی مراقبے'' کی مشق کراتے ہیں کہ نہ اُس کا ذہن پہلے جیسا رہتا ہے نہ جسم۔ اِسی پر بس نہیں بلکہ اگر کوئی گاڑی ایک رات کے لئے تھانے کی چار دیواری میں کھڑی رہے تو صبح تک اس کا مالک بھی اسے پہچان نہیں سکتا۔ میوزک ڈیک، ایل سی ڈی وغیرہ اس مہارت سے غائب کی جاتی ہیں کہ جیسے یہ گاڑی میں تھی ہی نہیں۔ اس کے ٹائر اگر نئے ہوں تو پھر وہ خود بخود اس گاڑی سے کھسک کر گھومتے ہوئے ''صاحب'' کی گاڑی کے نیچے لگ جاتے ہیں۔ انجن اگر اچھی حالت میں ہو تو۔۔۔۔ بس وہاں اتنا نشان رہ جاتا ہے کہ گاڑی اگر واپس کرنی ہی ہو تو ایک دفعہ سٹارٹ ہو کر گھر تک خیریت سے پہنچ جائے۔ آگے اللہ مالک ہے۔

گزشتہ دنوں ایک قصاب کو گدھے کو ذبح کر کے اس کا گوشت بناتے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ شخص انتہائی ایماندار تھا۔ جب مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس نے اپنے اقبالی بیان میں اعتراف کیا کہ وہ گدھے ذبح کرتا تھا لیکن ان کا گوشت دکان پر عام لوگوں کو فروخت کرنے کی بجائے ''صاحب'' لوگوں کے گھروں میں سپلائی کیا کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے علاقے کے آوارہ کتوں کو بھی ان ''صاحب'' لوگوں کے باورچی خانوں تک پہنچا دیا تھا۔ وجہ پوچھی گئی تو بغیر ہچکچاہٹ بولا ''یہ ہر دوسرے تیسرے روز میرا چالان کر دیتے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ میں انہیں مفت گوشت مہیا کیا کروں۔ مجھے اس کا یہی حل نظر آیا۔ آج تک مجھے کسی ''صاحب'' کے گھر سے شکایت نہیں آئی''۔ اس قصاب کے اعترافی بیان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر سرکاری ''صاحب'' ڈھیٹ کیوں ہوتے ہیں کہ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوتے یا اگر ذرا سی بات بھی ناگوار گزرے تو بھونکنا کیوں شروع کر دیتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی انگریز باغی مرغی کی جسے پولیس نے جانوروں کی تنظیم کے حوالے کر دیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس مرغی نے اس تنظیم کی تحویل میں انڈے دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تو وہ انڈے کس کی ملکیت تصور ہوں گے۔ کیا اُنہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا یا اصل مالک کے انتظار میں اُنہیں فریج میں اکٹھا کیا جاتا رہے گا۔ اِس بات کا بھی خدشہ ہے کہ اگر اصل مالک کا پتہ چل گیا تو وہ کہیں پولیس اور جانوروں کی تنظیم پر مرغی کو حبسِ بے جا میں رکھنے کے الزام میں ہرجانے کا دعویٰ ہی نہ کر دے کیونکہ معمولی معمولی بات پر ہرجانے کے دعوے یورپ میں عام سی بات ہے۔ ہم لوگ جو سمجھتے ہیں کہ یورپ والے ایماندار ہیں تو وہ ایویں ہی ایماندار نہیں، اُنہیں ہرجانے کا خوف ایماندار بنائے رکھتا ہے۔

ہم پاکستانیوں کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ یہ مرغی سکاٹ لینڈ میں پکڑی گئی۔ اگر یہ ہندوستان میں پکڑی جاتی تو الزام پاکستان پر آجاتا کہ اسے دہشت گردی کی کاروائیوں کے لیے انڈیا بھیجا گیا ہے۔ پہلے ہی انڈین آرمی کئی کبوتر پکڑ کر عالمی میڈیا کو دکھا چکی ہے، جن کے متعلق عالمی رہنماؤں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُنہیں پاکستان نے اپنے خاص دہشت گردانہ مقاصد کے لئے انڈیا بھیجا ہے۔ کمپیوٹر کی دنیا کے ارب پتی بل گیٹس نے گزشتہ دنوں اعلان کیا تھا کہ وہ غریب ممالک میں ہر خاندان میں مرغیاں تقسیم کریں گے۔ مقصد یہ کہ اس مرغی پال سکیم سے غریب خاندان اچھی خاصی رقم کما کر اپنے بچوں کی کفالت کر سکتے ہیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ بل گیٹس کی مرغیاں پاکستان پہنچنے سے پہلے برائلر مرغیاں پہنچ چکی ہیں۔ جو پاکستانی گھریلو لڑکیوں کی طرح اتنی حیادار ہیں کہ جہاں بٹھاؤ، ذبح ہونے تک وہیں بیٹھی رہتی ہیں۔ دو چار قدم تو دشمن بھی تکلیف گوارہ کرتے ہیں مگر یہ برائلر مرغیاں دور بیٹھی چپ چاپ اپنے سامنے اپنی ہم جنسوں کو ذبح ہوتے اور خون میں لت پت پھڑکتے دیکھتی ہیں، مجال ہے کہ ایک حرف بھی شکایت کا اپنی زبان پر لائیں۔ اُنہیں ان کے میکے (مرغی خانے) سے نکال کر دو دو دن کھانے پینے کو کچھ نہ دیں پھر بھی کوئی شکوہ زبان پر نہیں لاتیں۔ اِن مرغیوں کو دیکھ کر صدیوں پرانا محاورہ غلط ہو گیا ہے "کڑ کڑ کہیں اور انڈے کہیں"۔ یہ کیسی مرغیاں ہیں کہ نہ اِن کی کڑ کڑ سنائی دیتی ہے اور نہ انڈے دکھائی دیتے ہیں۔

اِن مرغیوں سے ہمیں اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب ہمارے ماسٹر جی ذرا سی غلطی یا سبق یاد نہ کرنے پر ہمیں مرغا بنا دیا کرتے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ طالبات کو بھی سکولوں میں مرغا ہی بنایا جاتا تھا۔ ساری عمر سر کھپانے کے باوجود ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ ماسٹر جی ہمیں مرغا ہی کیوں بنایا کرتے تھے۔ مرغی کیوں نہیں؟ ایک بزرگ ماسٹر جی سے جب ہم نے یہی سوال کیا تو شرما کر کہنے لگے "تہذیب اِس کی اجازت نہیں دیتی۔" اب بھلا مرغے سے مرغی بننے میں کون سی تہذیب آڑے آ گئی، لیکن ہمیں جواب نہ مل سکا۔ اب زمانہ بہت بدل چکا ہے، نہ وہ ماسٹر جی رہے اور نہ سکولوں میں مرغے بننے بنانے کا رواج رہا۔ پہلے مار کھا کر بھی ماسٹر جی کا احترام کیا جاتا تھا، اب "مار نہیں پیار" نے ماسٹر جی سے پیار اور شاگرد سے احترام دونوں چھین لئے ہیں۔

ایک بار مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ایک مسلم الثبوت استاد اُٹھے اور انہوں نے طرح کا ایک مصرعہ دیا۔

چمن سے آ رہی ہے بوئے کباب

بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی لیکن کوئی گرہ نہ لگا سکا۔ ان میں سے ایک شاعر نے قسم کھالی کہ جب تک گرہ نہ لگائیں گے، چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ چنانچہ وہ ہر صبح دریا کے کنارے نکل جاتے اونچی آواز سے الاپتے "چمن سے آ رہی ہے بوئے کباب"

ایک روز ادھر سے ایک کم سن لڑکا گزرا، جونہی شاعر نے یہ مصرعہ پڑھا، وہ لڑکا بول اٹھا۔

کسی بلبل کا دل جلا ہوگا

شاعر نے بھاگ کر اُس لڑکے کو سینے سے لگایا۔ یہی لڑکا بڑا ہو کر جگر مراد آبادی کے نام سے مسلم الثبوت استاد بنا۔

حماد احمد، لاہور

دانت نکالنا

کہتے ہیں کہ انسانی خواہشات دانتوں کی طرح ہوتی ہیں۔ جب دانت میں درد ہوتا ہے، تو زندگی عذاب ہوکررہ جاتی ہے۔ایسی صورت میں حل صرف یہی ہوتا ہے کہ خراب دانت کو"منہ" سے نکال باہر کیا جائے۔۔

اسی طرح ضرورت سے زیادہ خواہشات زندگی کو مشکل بنا دیتی ہیں۔ ضرورت پڑنے پر غیر ضروری خواہشات کو بھی "زندگی کے منہ" سے باہر نکال دینا چاہئے۔تاکہ زندگی کو"آرام" آسکے۔

آپ نے یہ تو سنا ہی ہوگا "علاج دنداں، اخراج دنداں"۔ دانتوں میں عقل داڑھ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ اس وقت نکلتی ہے جب آدمی عقل سے فارغ ہو چکا ہوتا ہے۔ دانت نکلوانا ایسا حساس معاملہ ہے کہ اس کے لئے دندان ساز کے پاس جانے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔

دانت کے مریضوں کے لئے بہت زیادہ احتیاط کرنا بھی انتہائی ضروری ہے

ایک صاحب دانت نکلوانے کے لئے گئے تو ڈاکٹر نے انہیں منہ کھولنے کو کہا، جس پر انہوں نے منہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی کھول دیا۔ ڈاکٹر نے منہ کھولنے کی مقدار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:۔"جناب! مناسب منہ کھولیں۔۔۔ میں نے آپ کا دانت "باہر کھڑے ہوکر" ہی نکالنا ہے"۔

دانت نکلواتے وقت جیب میں کھلے یا ٹوٹے ہوئے پیسے ہونا بھی ضروری ہیں۔

ایک شخص نے دانت نکلوایا تو اس کے پاس ڈاکٹر کو دینے کے لئے کھلے پانچ سو روپے نہیں تھے، چنانچہ اس نے ڈاکٹر کو ایک ہزار کا نوٹ دیا۔ڈاکٹر نے دراز میں بغور دیکھا اور مریض کو کہا "بقایا پانچ سو روپے تو نہیں ہیں۔ ایسا کرو کہ ایک دانت ہی اور نکلوا لو۔"

دانت نکلوانے کے لئے کسی ایسے معالج سے رجوع کرنا چاہئے جس کا ہاتھ نرم ہو اور وہ زیادہ تکلیف میں مبتلا نہ کرتا ہو۔

اک مریض ڈاکٹر سے بولا "آپ نے سائن بورڈ پر بالکل درست لکھا ہے کہ یہاں پر دانت بغیر تکلیف کے نکالے جاتے

ہیں۔"

ڈاکٹر:۔"ہاں درست ہے۔۔لیکن تمہارا اس وقت یہ بات کرنے کا آخر مطلب کیا ہے؟"

مریض:۔"یہی۔۔۔کہ آپ نے میرے دانت تو نکال دیے لیکن تکلیف نہیں نکالی۔ وہ وہیں کی وہیں ہے۔آپ نے واقعی "بغیر تکلیف" کے صرف اور صرف دانت ہی نکالے ہیں"۔

منہ کے پنجرے میں اِتنے زیادہ دانت بیک وقت قید ہوتے ہیں کہ کئی مرتبہ ڈاکٹرز کو بھی غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ کونسا دانت نکالنا تھا اور کونسا نہیں۔

ایک مریض نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ کئی دنوں سے میرے دانت نکال رہے ہیں اور ہمیشہ غلط دانت ہی نکال دیتے ہیں۔

ڈاکٹر بولا کہ میں آج وعدہ کرتا ہوں کہ صحیح دانت نکالنے میں کامیاب ہو ہی جاؤں گا۔

مریض حیرانگی سے بولا کہ وہ کیسے ڈاکٹر صاحب؟۔

ڈاکٹر بولا "جناب آپ کے منہ میں دانت ہی اب صرف ایک باقی رہ گیا ہے۔"

آئیں۔اب آپ کو گھر بیٹھے دانت نکالنے کے آسان ترین طریقے بتاتے ہیں۔

پہلا طریقہ تو یہی ہے جو آخری واقعے میں بتایا گیا ہے۔کسی ڈاکٹر سے اپنے سارے کے سارے دانت نکلوالیں۔اس کے بعد خالی ہو جانے والے مسوڑھوں پر سارے کے سارے دانت مصنوعی لگوا لیں۔ چونکہ نقلی دانت ہیں۔اس لئے گھر بیٹھے ان دانتوں کو جب چاہے منہ سے باہر نکال لیں اور جب چاہے دوبارہ لگالیں۔

دوسرا اور آسان ترین طریقہ کار یہ ہے کہ لطیفوں کی کسی اچھی سی کتاب کا "اپ ڈیٹڈ ورژن" خرید لیں۔اسے پڑھنا شروع کریں اور جتنی دیر چاہیں، گھر بیٹھے ہی دانت نکالتے رہیں۔

ہینگ لگے گی، نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے گا۔گھر بیٹھے بیٹھے دانت نکل آئیں گے۔اور کیا چاہیے؟

راشد حمزہ

جوائنٹ فیملی سسٹم

جوائنٹ فیملی سسٹم کے بہت سارے فائدے ہوں گے لیکن جو سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے وہ آپ کی پرائیویسی کا برقرار نہ رہنا ہوتا ہے۔ جب آپ اپنی مائنڈ سیٹ ایسی بناتے ہیں جس میں دوسروں کی پرائیویسی کا خیال رکھنا سب سے مقدم ہوتا ہے تب آپ کی اپنی پرائیویسی شدید خطرات سے دوچار ہوجاتی ہے۔ فطری طور پر جس طرح آپ اپنے اردگرد کے لوگوں سے پیش آتے ہیں، اُن سے بھی چاہتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ آپ ہی کی طرح برتاؤ کریں، دوسروں سے آپ کی پرائیویسی کا خیال رکھنے کا یہی احساس آپ کو ذہنی طور پر شدید کوفت سے دوچار کرتا ہے۔

جوائنٹ فیملی سسٹم میں اگر صبح کسی ایک کے ہاں بچہ جنم لیتا ہے تو شام کو کسی دوسرے کی شادی ہوجاتی ہے، اس طرح آپ مستقل اور مسلسل کنفیوژن میں گھرے رہتے ہیں کہ گزشتہ صبح جو بچہ پیدا ہوا تھا وہ چھوٹے چاچا کے ہاں ہوا تھا یا بڑے چاچا کے ہاں، اور اس سے گزشتہ ہفتے جس بچے کا ختنہ ہوا تھا وہ کس کزن کا تھا، خیر سے پٹھانوں میں بچے پیدا کرنے اور کرانے کی حتمی و ختمی عمر تو ہوتی نہیں اوپر سے ملاؤں نے خاندانی منصوبہ بندی کو بھی ایسے ناجائز قرار دیا ہے کہ پٹھان اس کے بارے میں سوچنا بھی دوزخ میں پہنچنے کا پروانہ سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات آپ یہ خبر بھی سن سکتے ہیں کہ مبارک ہو آپ کا چاچا ہوا ہے، جو بے حد نومولود ہے آپ ایک دفعہ پھر سے بھتیجا بن گئے ہیں۔ آپ پورے سکول بچوں کے نام یاد کرسکتے ہیں لیکن جوائنٹ فیملی سسٹم میں اپنے چچیروں ممیروں وغیرہ وغیرہ اور اُن کے بے تحاشا امڈنے والے بچوں کے نام یاد نہیں رکھ سکتے۔ یوں آپ نامعلوم افراد کے درمیان گزر بسر کرتے ہیں۔ اگر صبح آپ اپنا کمرہ سجا کر تسلی سے لاک کرکے بھی نکل جائیں تو رات تک کسی کے بچے نے کسی دُرز میں سے راستہ نکال کر آپ کے کمرے کا بینڈ باجا بجادیا ہوگا۔ اگر آپ تفتیش شروع کریں گے تو ہر ماں اپنے بچے کے سر کی قسم کھا کر اس کو معصوم ثابت کرنے کا بھرپور اور مدلل طریقے سے مقدمہ لڑیں گی۔ اگر غلطی سے آپ نے بہت ساری ماؤں کے صف میں سے کسی کے بچے پر زیادہ دیر تک نگاہیں گاڑ دیں تو پھر نیا تماشا شروع ہوجاتا ہے، رونا دھونا اور ''صرف اس گھر میں ہم ہی ہیں کیا؟'' کی گردان، اپنے خاوندِ نامدار سے شکایتیں اور گلے، سسرال کی غیبتیں اور میکے کے قصیدے۔۔۔ یہ شیطان کی آنت کی طرح ایک نہ ختم ہونے والا

سلسلہ ہے، جس کا نی انجام خدا ہی جانے۔

ویسے بھی جب اِتنے سارے نامعلوم افراد کے درمیان آپ رہیں گے تو واردات بھی نامعلوم افراد کے ہاتھوں ہی ہوں گے اور کسی کی کیا مجال جو نامعلوم افراد تک پہنچ کر اس کی سراغرسانی کی جرأت کر سکے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوجاتا ہے آپ اپنے کمرے میں گہری نیند میں غرقاب ہوکر مزے لے رہے ہوں گے اور ایسے میں دروازے پر ایسے گھونسے چلیں گے جیسے ہتھوڑہ گروپ آن موجود ہوا ہو، باوجود اس کے کہ آپ کو ایسی بھی آوازیں سنائی دیں گی ''آپ سو نہیں رہے تو ذرا دروازہ کھول دیجئے، ہمیں ایک ضروری کام ہے۔'' ارے بھائی بندہ سونے سے پہلے ہی تو دروازہ بند کرتا ہے۔'' جب آپ دروازہ کھولیں گے تو آپ کا دور کا چاچا اور چچی بغیر اجازت کے کمرے میں داخل ہوں گی اور بیڈ کے نیچے دیکھ کر جاتے جاتے کہیں گی ''ہم ذرا اپنا بچہ لینے آئے تھے، شام کو یہیں کھیل رہا تھا ہم بھول گئے تھے۔

آپ ذرا دیر پھر سوئے تو ماں آجائیں گی ''بیٹا جی ذرا دروازہ کھول لیجئے کہ میں آپ کے لئے چائے لائی ہوں۔'' آپ نے کہہ رکھا تھا کہ آج کسی ٹیسٹ کی تیاری کر رہا ہوں۔ دروازہ کھولنے سے پہلے آپ سٹڈی ٹیبل پھر سے سیٹ کرتے ہیں، بلینکٹ بیڈ سے سائیڈ پر رکھتے ہیں تاکہ ماں کو سونے کے تمام ثبوتوں میں سے کوئی ثبوت دکھائی نہ دے۔ آپ چائے وصول کرتے ہیں، ماں دعا دے کر رخصت ہوجاتی ہے۔ آپ پھر سے سوجاتے ہیں اس دفعہ کافی رات گزرنے کے بعد دروازے پر نرم خرامی سے ایسی دستک ہوتی ہے جو فکر اور پریشانی کی کیفیتوں سے لبریز ہوتی ہے۔ آپ دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھتے ہیں۔ اِس دفعہ آپ کی نزدیک کی چچی ہوتی ہے، بیٹا ذرا اپنے فون سے اپنے چاچا کو فون تو ملانا۔۔۔ کہاں رہ گیا فلاں کا مسئلہ تھا، سلجھانے گیا تھا۔'' آپ دل ہی دل میں نہایت بری گالی کے ساتھ کہیں دوسروں کے مسئلے سلجھانے والے ہمارے مسئلے کیوں بن جاتے ہیں؟ فون پر پوچھتے ہیں تو وہ بتاتے ہیں کہ جی بس پہنچنے والا ہی ہوں۔۔۔''

ذرا ایک قدم اور پیچھے۔۔۔صحیح پوز نہیں آرہا ہے۔۔۔

آج کل تو چارجر کا بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اگر کسی کمرے کا پلگ خراب ہے تو وہ یا تو آپ کا چارجر لے جاکر چیک کرے گا یا پھر آپ کے کمرے میں اپنا موبائل رکھے گا، یوں ایک بڑی الجھن تو یہ شروع ہوجاتی ہے کہ اُس کے موبائل کی آلودگیاں بھی آپ کے کمرے کا حصہ بن جاتی ہیں، جیسے لوگوں کے کال پر کال میسج پر میسج۔۔۔ یوں مسائل سلجھانے اور معرکے سر کرنے میں رات گزر جاتی ہے اور دن یہ سوچ کر کہ کدھر جائیں گے رات کا ٹھکانہ تو گھر ہی ہے۔

خانزادہ خان

پاتھ تو اچھے ہوتے ہیں

زندگی فطرت کے وائرلیس سٹیشن سے جڑی رہتی ہے اگر اُسے اُمید حوصلے اور قوت کے سگنل کا پاتھ ملتا رہے، بالکل ویسے ہی جیسے کمپیوٹر میں کوئی فائل اُسی وقت کھلتی ہے جب اُسے مطلوبہ ریڈر سوفٹ ویئر کا پاتھ مل جائے۔ قدرت نے حضرت آدم کے کالبدِ خاکی میں روح پھونک کر اُسے فردوسِ بریں بخش دیا مگر گندم کی سلطانی سے بچنے کی تلقین کی تا کہ اُسے جنت میں نئے سے نیا پاتھ ملتا رہے لیکن آدم اپنی نسیانی جبلّت کے حصار میں آ گیا اور سب بھول بیٹھا۔

کام لیا ہے تو نے ایک سوچی سمجھی نادانی سے
نام مٹایا تو نے اپنا جنت کی پیشانی سے
اونچی ہے انسان کی عظمت گندم کی سلطانی سے
اے آدم کی پہلی بھول
تیرا میرا ایک اصول

پروردگار کے حوصلے لامحدود ہیں قدرت نے انسان کو ایک نئے امتحان سے گزارنے اور بطورِ خلیفہ آزمانے کے لیے اُسے کرۂ ارضی کا پاتھ دے دیا۔ انسان ظلوماً جہولا ہونے کی بنا پر منتقم مزاج بھی ہے جب اس نے دیکھا کہ اسے فردوس بریں سے کرۂ ارضی پر منتقل کر دیا گیا ہے تو اُس نے اپنے زمین پر منتقل ہونے کا انتقام خود زمین سے لینا شروع کر دیا اور بجائے خود زمین پر منتقل ہونے کے اس کے جامد قطعات کو اپنے نام پر انتقال کرنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ پاتھ اس کی ہوس کو کسی تسکین کی منزل پر نہ پہنچا سکا۔ لامحدود کی خلش اور ھل من مزید کی تڑپ اُسے ایک سے ایک نئے موڑ سے ہمکنار کرتی رہی۔ انسانی فکر جب راست پاتھ پر رہی تو وہ نظری بلندی اور عظمت کے نئے سرچشموں کا کھوج پاتی رہی لیکن جب پست فکری کا شکار ہوئی تو نمرود اور فرعون کی راہ پر چل نکلی اور اُس وقت تک چلتی رہی جب تک کہ کسی فریادی کی آہ کو اُس کے مقابل پاتھ نہ مل گیا ہو۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ، دے دو راہ جانے کے لیے

آغا شورش کاشمیری کے مذکورہ بالا شعر کے وزن کا ہی ایک

شعر جو اکثر اقبال سے منسوب کر دیا جاتا ہے اُس میں ایک ایسے عقاب کا ذکر ہے جو تندیٔ بادِ مخالف سے گھبرایا ہوا ہے اور بادلِ نخواستہ ہی اپنی اُڑان جاری رکھے ہوئے ہے جبکہ اقبال کا شاہین جدھر کا رخ کرتا ہے وہاں نیا سے نیا پاتھ اُس کا استقبال کرتا ہے۔

صحرا است کہ دریا است تہ بال و پر ما است

اقبال کا شاہین کسی پاتھ کا خوف نہیں کھاتا بلکہ اپنے سنگِ میل خود وضع کرتا ہے۔ جب یہ شاہین چالیس سال تک اُڑان بھر چکتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پر بوسیدہ اور بوجھل ہو رہے ہیں اُس کی چونچ کنڈلی ہو چکی ہے اور اس کے پنجے پس ہو چکے ہیں جو اسے پلٹنے جھپٹنے اور شکارِ زندہ کی لذت سے کہیں بے نصیب نہ کر دیں تو یہ شاہین ایک فیصلہ کرتا ہے یہ ایک بلند و بالا چٹان کا انتخاب کرتا ہے اُس پر بیٹھ کر اپنے پر نوچ ڈالتا ہے، اپنی چونچ اور پنجوں کو رگڑ رگڑ کر ختم کر ڈالتا ہے اور پھر تین ماہ تک انتظار کرتا ہے جب تک کہ اُسے نئے بال و پر، نئی چونچ اور پنجے حاصل نہ ہو جائیں۔ یوں وہ پُر دم ہو کر ایک نئے جنم کے ساتھ ایک نئی زندگی کے پاتھ پر شاہین وار اُڑان بھرتا ہے اور اسے تیس سال کے لیے زندگی کا ایک نیا پاتھ میسّر آ جاتا ہے۔

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

پرانے وقتوں کے بادشاہ جمہور میں نیک نامی پانے کے لیے اپنے محلات اور قلعوں کے پچھواڑے پروان چڑھنے والی طوائفوں کو بھی ریاست بدری کا راستہ دکھایا کرتے تھے، یہ کام خالص عوامی مفاد میں کیا جاتا تھا حالانکہ اُن بادشاہوں کے اپنے شاہین بچوں کی بلند پروازی کو صحبتِ زاغ سے متاثر ہونے کے شدید خطرات پیدا ہو جاتے تھے۔ معاشرے کی تطہیرِ مسلسل کے لیے طوائفوں کی طرح کرپٹ طبقے کو بھی محفوظ پاتھ ملتا رہنا چاہیے تا کہ عام پاکستانی معاشرہ اس ریہہ سے محفوظ ہوتا رہے، بھلے طوائفوں کی طرح یہ بھی الگ بستیاں اور شہر ہی کیوں نہ بسا لیں۔

جس طرح زندگی کو اپنا پاتھ آکسیجن، پانی اور خوراک کے ذریعے ملتا ہے، ایسے ہی قوموں اور ملتوں کو اُن کا پاتھ اقدار، روایات، قانون اور آئین کی سربلندی سے ملتا ہے۔ حکومتوں کی ذمہ داری صرف اِتنی ہی نہیں ہوتی کہ وہ آئین و قانون کی بالا دستی قائم رکھیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ نئی نسل کو نظری و فکری پاتھ بھی دیتی رہیں تا کہ جمہور کے نئے سے نئے ہیرو اس پاتھ پر چل کر منصۂ شہود پر آتے رہیں جو انہیں فرقوں سے نکال کر ''اھدنا الصراط المستقیم'' والے پاتھ پر ڈالتے رہیں۔ پاتھ ملتے رہنے چاہیں کیونکہ پاتھ تو اچھے ہوتے ہیں۔

جگن ناتھ آزادؔ مشفق خواجہ سے ملنے گئے تو بات چیت میں بار بار اپنی کتابوں کی غرقابی کا تذکرہ بڑے دردناک انداز میں کرتے رہے اور یہ بھی کہتے رہے ''اس میں نہ صرف مطبوعہ کتابیں ضائع ہوئیں بلکہ کچھ غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی برباد ہو گئے۔''

خواجہ صاحب جب آٹھ دس دفعہ سیلاب کی دلخراش داستان سن چکے تو عرض کیا ''اگر اجازت دیں تو ایک درد انگیز واقعہ بلاتشبیہ میں بھی عرض کروں۔''

آزاد صاحب نے کہا ''سنایئے!''

خواجہ صاحب بولے ''چند برس قبل ایک مشہور ادیب کے ہاں اتفاق سے آگ لگ گئی۔ اس میں ان کے کتب خانے کی بہت سی نادر کتابیں اور غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے کچھ دوست اظہار ہمدردی کے لئے آئے اور آتش زدگی کے واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ البتہ ایک دوست نے اپنے جذبات کا اظہار اس انداز سے کیا۔ ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے جہاں مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوس ناک ہے وہاں غیر مطبوعہ تصانیف کا غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔ یقیناً یہ آپ کا نقصان ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے بچ گئے۔''

اس پر جگن ناتھ آزادؔ ہنسنے پر مجبور ہو گئے اور باقی جتنے دن وہاں رہے انہوں نے کتابوں کی غرقابی کا ذکر نہیں کیا۔

عامر راہداری

آرٹ

آرٹ کی کئی قسمیں ہیں پاکستان میں ہر قسم کا آرٹ پایا جاتا ہے لیکن آج کل سب سے مشہور آرٹ کسی کو لوٹنے کا آرٹ ہے اور اُلو بنانے کا آرٹ صرف سیاستدان جانتے ہیں۔ ان مذکورہ آرٹس کو عرف عام میں چونا لگانا کہتے ہیں اور چونا لگانا بھی خود اپنی صنف میں ایک آرٹ ہے۔ ہمارے نصاب میں مڈل تک ایک مضمون آرٹ کا بھی ہوتا ہے (مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ پتا نہیں اس کا انسانی زندگی میں کیا کام ہے) میری ڈرائنگ بھی یوسفی صاحب کی طرح بہت اچھی تھی، وہ تو چلو کم از کم انگور تو بنا لیتے تھے۔۔۔ میں تو پیپر میں دائرہ بنا کر اس کے ساتھ ''دائرہ'' نہ لکھتا تو استاد مجھے ''چوکور'' بنانے کے ۲۰ میں سے ۲۰ نمبر دے دیتا تھا۔

اب تو خیر موبائل لے کر دیا جاتا ہے لیکن بچپن میں بچوں کو رنگوں کی ڈبیا اور ڈرائنگ پیپر لے کر دیئے جاتے تھے جس سے بچے یہ سیکھتے تھے کہ مختلف دیواروں پر کون سا رنگ اچھا لگ سکتا ہے، بلکہ اکثر والدین تو بچوں سے آئیڈیا لیا کرتے تھے کہ دیواروں پر اس دفعہ کون سا رنگ اچھا لگے گا۔۔۔؟

آرٹ کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے اس سے چند ایسے افراد مصروف رکھے جا سکتے ہیں جن کا انسانی زندگی میں سوائے بیروزگار رہنے کے اور کوئی کام نہ ہوتا۔ دنیا میں آرٹ گیلریاں لگتی اور لوگ فن پارے دیکھنے جاتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں بھی آرٹ گیلریاں لگتی ہیں لیکن لوگ حسن پارے دیکھنے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں شادی کرنا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں عورتیں ہمیشہ کامیاب رہتی ہیں۔ ویسے سنا ہے شاعری بھی ایک آرٹ ہے لیکن ہمارے خیال میں شاعری کسی کو کامیابی کے ساتھ سنانا اس سے بھی بڑا آرٹ ہے۔

تجریدی آرٹ بھی کمال کا فن ہے۔ جسے کچھ بھی نہ آتا ہو اسے تجریدی آرٹ ضرور آتا ہے۔ کہتے ہیں تجریدی آرٹ وہ واحد ہنر ہے جو بچہ ماں کے پیٹ سے سیکھ کر آتا ہے۔ اس ہنر کے نمونے اکثر گھروں کے فرش اور گلیوں کی اطراف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بچپن کے اس آرٹ کو عرف عام میں ''گلکاریاں'' کہا جاتا ہے۔ تجریدی آرٹ، آرٹ کی وہ قسم ہے جس میں آپ کچھ بھی بنا دیں، کچھ نہ بھی بنا ہو تو کچھ نہ کچھ ضرور بن جائے گا۔ اِس آرٹ کے لئے سب سے ضروری چیزیں رنگ اور کاغذ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں تجریدی آرٹ کو سیکھنے کے لئے آپ کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو، عقل بالکل بھی نہیں ہونی چاہیے۔ تجریدی مصوری اور تجریدی افسانہ وہ صنفیں ہیں جن میں تخلیق کار کو خود بھی پتہ نہیں ہوتا کہ آخر میں کیا بنے گا۔ اچھی چیز بن گئی تو تخلیق کار پھولے نہیں سماتا اور بری چیز بن گئی تو اسے تجریدی نمونہ کہہ کر پھر بھی پھولے نہیں سماتا۔

اِسی طرح مشہور مصور پکاسو کے گھر چوری ہوگئی۔ پولیس نے کہا ''آپ تو خود مصور ہیں، ہمیں چوروں کی تصویریں بنا دیں تو ہم چور آسانی سے پکڑ لیں گے۔''

پکاسو نے تصویریں بنا دیں۔ دو گھنٹے بعد پولیس نے دو طوطے، تین گائیں اور ایک گھوڑا پکڑ لیا۔ ویسے وہ انسانوں کو بھی پکڑ سکتے تھے لیکن وہاں کی پولیس بھی شاید پاکستانی پولیس کی طرح تھی جنہیں انسان صرف اس صورت میں نظر آتا ہے جب وہ غریب ہو۔

سلمان باسط

میر اور ہم

قدرت نے ہمیں جب سے اُردو ادب کی خدمت کے لیے چنا ہے، اردو شاعری کے بہت سے سربستہ راز ہم پر منکشف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اکثر اوقات اشعار کی نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آئی غلط شرح تاریکی میں ملفوف کسی شب اچانک ہم پر اصل ہیئت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔اس کے بعد ایک بے کلی دل میں بس جاتی ہے۔اردو ادب کی زبوں حالی کا خیال آتے ہی ہم اتنے رقیق القلب ہو جاتے ہیں کہ غرفۂ چشم خشک ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ نیند پپوٹوں کو الوداع کہ کر کسی اور منطقے کی طرف جا نکلتی ہے۔ ہم کسمسا کر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔قلبِ حزیں میں سکون کی جگہ تفکر وافر مقدار میں اُمڈا چلا آتا ہے۔ جب اردو شاعری اور اس کی تاریخ کے لیے ہمارے اندر جذبۂ ترحّم فشار کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے تو ہم تڑپ کر اپنے آرام دہ بستر سے اٹھتے ہیں اور تلامذۂ ادب کی خیر خواہی کی خاطر اپنے ذہنِ رسا میں کلبلانے والے افکارِ پریشاں کو قرطاس پر منتقل کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔

امشب ہم پر ایک اور عقدہ وا ہوا۔ میر تقی میر کے نام سے موسوم ایک شہرۂ آفاق شعر کی حقیقت ہم پر آشکار ہوئی۔ ہوا کچھ یوں کہ تقریباً نصف شب کا عمل ہوگا۔ہم گہری نیند سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ مقدور بھر خواب بھی دیکھنے میں منہمک تھے کہ ہمارے حجلۂ خواب کے درِ مقفل پر حجابانہ سی دستک ہوئی۔ دستک کچھ مانوس سی تھی۔ہم فوراً بھانپ گئے کہ ہو نہ ہو پھر کوئی عالمِ بالا کی نوائے سروش ہے۔ لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور ایسی کیفیت میں فطری طور پر در آنے والی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں پوچھا ”ارے بھائی کون ہے؟ کیا اُفتاد آ پڑی اِس پہر؟“

دروازے سے کچھ منمنانے کی آواز کان پڑی۔ ہم سمجھ گئے کہ اُردوئے معلّٰی کا کوئی سائل ہے۔ ناچار اٹھ کر دروازہ کھولا تو میر تقی میر کو لانبی زلفوں اور نشیلی آنکھوں سمیت دروازے پر پایا۔ ہم نے لاکھ چاہا کہ چہرے پر خوش گواری کا تاثر برقرار رہے مگر آدھی رات کے وقت جب کوئی گہری نیند سے مستفید ہو رہا ہو اور اپنے مطلوبہ رنگین خواب بھی دیکھ رہا ہو تو ایسے میں کوئی مخل ہو کر درسی کتب جیسا ماحول پیدا کر دے تو آپ ہی ایمان سے کہیے، چہرے پر بشاشت کہاں سے آئے۔ خیر ہم دروازہ کھول کر بے اعتنائی سے بستر کی طرف لوٹ آئے۔ میر دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ پھر لجلجاتے

ہوئے لب کشا ہوئے،" حضور اجازت ہو تو پائے مبارک کے قریب فرش نشیں ہو جاؤں؟"

میر کا یہ جملہ سنتے ہی ہمیں انکساری لاحق ہوگئی۔ ہم نے ناگواری کی چادر کو طوعاً کرہاً اتارا اور خوش اخلاقی کا حصیر بچھا کر میر کو اپنے پاس برابر میں بٹھا لیا۔ میر بیچارے پاسِ ادب میں بہت نہ نہ کرتے رہے مگر ہم ایک ایسے شخص کو اپنے برابر کیسے نہ بٹھاتے جو کبھی خود کو خدائے سخن کہلواتا رہا ہے۔

"جی؟" ہم نے تمہید کو اختصار میں بدلتے ہوئے آمد کا مقصد دریافت کیا۔ میر جیسے انتظار میں تھے۔ فوراً ہی گویا ہوئے "حضور اِس نامناسب وقت میں ناحق تکلیف دینا ہرگز نہ چاہتا تھا۔ پر کیا کریں کہ عالمِ بالا سے چھٹی ہی اس وقت ملتی ہے۔ وہاں جس سے بات کرو آپ کا رطب اللسان ہے۔ کیسے کیسے عقدوں کی گرہ آپ نے کھولی ہے۔ آپ کتنے شعرا کی دلبستگی کا سامان بنے ہیں۔"

ہم دلبستگی والی بات پر ذرا سا ٹھٹکے اور تیوری پر ہلکا سا بل ڈالا ہی تھا کہ میر جھٹ سے بولے "میری مراد ہے کہ آپ نے اپنی دانش کے سرچشمے سے کتنے ہی شعرا کی فہم کی لاج رکھی ہے۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ عرض یہ کرنا تھی کہ بعض کج اداؤں اور عاقبت نااندیشوں نے کچھ اشعار مجھ سمیت بہت سے شعرا کے نام کے ساتھ جڑ رکھے ہیں۔ میں وہاں اوپر بیٹھا دانت کچکچاتا رہتا ہوں لیکن کر کچھ نہیں پاتا۔ میری یہ حالت دیکھی تو غالب دہلوی قریب آئے اور بتایا کہ وہ بھی کچھ اسی طرح کی عرضی لے کر آپ کے درِ فیض پر حاضر ہوئے تھے اور بامراد لوٹے تھے۔ آپ سے ملتمس ہوں کہ میری دادرسی فرمایئے۔"

ہمارا دل پسیجنے لگا۔ آنکھوں کے گوشے میر کی لجاجت اور اپنا ترفع دیکھ کر بھیگنے لگے۔ ہم نے گلوگیر آواز میں کہا "میر میاں آپ چنداں ملال نہ کیجیے۔ جو کہنا ہے بے جھجک کہیے۔ غالب دہلوی نے اگر ہمارا پردہ چاک کر ہی دیا ہے تو آپ بھلا کیوں محروم رہیں۔ کہیے۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔"

میر نے اُسی کھسیائے ہوئے انداز میں کہا" حضور اکثر شعرا تو اپنے اشعار کی ملکیت کا مقدمہ آپ کے پاس لے کر آتے ہیں لیکن اس بار معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ہم اپنے ضمیر کی عدالت میں طویل عرصے سے کھڑے ہیں۔ زندگی میں ہی یہ بوجھ اتارنا چاہتے
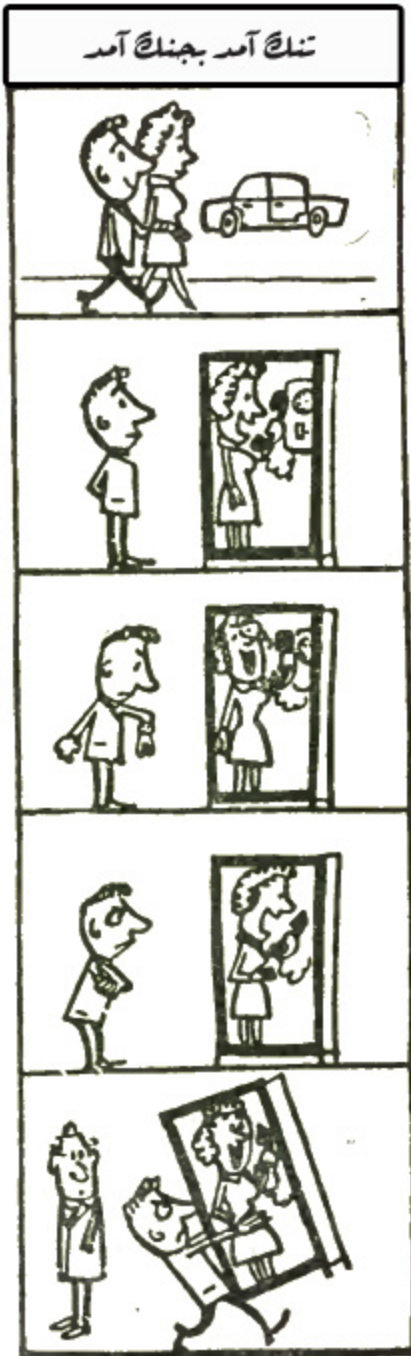
تھے مگر کچھ زندگی نے اور کچھ خوفِ رسوائی نے مہلت ہی نہ دی۔ دراصل میرا ایک شاگرد تھا۔ اس کا نام تو جانے کیا تھا مگر عرفیت بہت نامعقول قسم کی تھی۔ باز پالنے کا شوقین تھا لہٰذا اکثر لوگ اُسے ''بازا بازا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ہم سے عقیدت کی بنیاد پر اُس نے ہمارے تخلص کو اپنے نام کا جزو بنا رکھا تھا اور خود کو میر بازا کہلوایا کرتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس آشفتہ سروں کے زمانے میں کوئی مغنّی مہدی حسن خاں کے نام سے جانے جاتے تھے اور ان کے عقیدت مند بہت سے گویّے خود کو ان کا شاگرد ظاہر کرنے کی شوخی میں اپنے نام کے ساتھ مہدی لگا لیتے ہیں۔ سو مرشدی! وہ شخص بازا بہت نانہجار تھا لیکن میری صحبت میں آ بیٹھتا تھا اور خوشہ چینی کرتا رہتا تھا۔ ایک روز جب ہم قبلہ گاہی کے فرمان کے مطابق عشق اختیار کر کے غزل کہنے میں مگن تھے ؎

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا

ہم عشق کی لہر میں تھے۔ طبعیت بہت موزوں تھی۔ آٹھ اشعار ہو گئے۔ اسی اثنا میں ماموں زاد کا خیال غالب آ گیا اور ایک مصرع مزید ہوا ؎

نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

تو پہلا مصرع اٹک گیا۔ ہم دوسرا مصرع بآوازِ بلند دہرانے لگے تاکہ پہلا مصرع بھی ہو جائے۔ وہ نامعقول بازا اِسی لمحے اپنا تخلص ہماری غزل میں داغنے کا مرتکب ہوا اور بول اٹھا ''حضور میں کچھ عرض کروں؟''

ہم مصرع سازی میں مگن تھے۔ اِسی عالم استغنا میں اسے بولنے کی اجازت دے بیٹھے۔ بازا نے ہمارے مصرع میں اپنے تخلص کے ساتھ مصرع ٹانک دیا ؎

یا داس کی اتنی خوب نہیں میر بازا

ہماری محفل میں موجود سب لوگ اس کے اس مصرع پر پھڑک اٹھے اور بولے کہ آج اِسے آپ کی جوتیوں کا صدقہ مل گیا ہے۔

ہم چیں بہ جبیں ہوئے اور اس اس نامعقول کی اپنے پاپوش سے سرزنش کرتے ہوئے کہا ''اے شعری اوزان سے نابلد انسان! تُو نے اپنا تخلص جوڑنے کی خاطر شعر کو وزن سے خارج کر دیا ہے۔ ہاں اگر یہاں بازا کی بجائے باز آ ہوتا تو وزن میں تھا۔''

اُس نالائق کی جرأت ملاحظہ ہو۔ بولا ''تو حضور ہم نے اتنا عرصہ آپ کے آنسوؤں سے لبریز شعروں کا نمک کھایا ہے۔ اپنے مطلوبہ تصرّف کے ساتھ یہ مصرع آپ رکھ لیجیے۔ قسم لے لیجیے جو زندگی بھر کبھی آپ کو رسوا کروں۔''

ہم متأمل ہوئے تو محفل میں شریک تمام احباب مصر ہو گئے کہ ایسا برجستہ مصرع اور نہیں ہو سکتا۔ سب نے کہا کہ ہم آپ کی پریشانی سمجھتے ہیں۔ ہم سب حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ راز ہمیشہ راز ہی رہے گا تا آنکہ آپ خود اسے افشا کرنے کا مناسب بندوبست فرما دیں۔ تمام لوگوں کے اصرار، مصرع کی چستی اور متبادل کی عدم دستیابی نے ہمیں یہ درخواست قبول کرنے پر رضامند کر لیا۔

سو یہ شعر ہماری زندگی میں اسی طرح پڑھا اور سنا جاتا رہا۔ اب کارکنانِ ''قضائے قدر'' نے ہمیں اس اندیشے میں مبتلا کر دیا ہے کہ مستعار لیے گئے مصرع کے ساتھ دفترِ عمل پیش کیا تو پکڑے جاؤ گے۔ اب آپ سے زیادہ مجھے ایسی امانتوں کا پاسدار کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ملتجی ہوں کہ اُردو ادب کے طالب علموں کے سامنے آئینہ رکھ دیجیے تاکہ وہ اس میں شفاف عکس دیکھ سکیں اور میری عاقبت سنور جائے۔ مجھے مایوس نہ لوٹایئے گا ورنہ میں ضمیر کے بوجھ تلے دب جاؤں گا۔''

میر نے آخری جملہ کہا تو ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ مجھ سے ان کی بیچارگی دیکھی نہ گئی۔ آگے بڑھ کر ان کے بندھے ہوئے ہاتھ تھام لیے اور تسلی دیتے ہوئے کہا ''عزیز من مطمئن رہو۔ ہم اس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔''

میر کی ڈبڈبائی ہوئے آنکھیں اظہارِ تشکر سے چھلک پڑیں۔ بندھی ہوئی ہچکی کے باعث کچھ کہنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ ہم نے سر کو ذرا سی جنبش دیتے ہوئے انہیں سمجھا دیا کہ ان کے جذبات ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ کچھ کہہ بھی نہ سکتے تھے۔ صرف ہماری دست بوسی کی اور ہماری طرف پشت کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

میری پہلی محبت

رازی الغزالی

کیوں! میں ہی کیوں؟ آخر میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے ایسا؟ زندگی میں جس کو ٹوٹ کر چاہا سالا اُسی نے دھوکہ دیا۔ اب تو اعتبار ہی اٹھ گیا ہے زندگی سے۔ ساحل کنارے چائینا کے موبائیل سے تیز آواز میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے گانے چلائے ''لڑکا'' کافی فلمی فلمی محسوس کر رہا تھا۔ پیچھے بینچ پر بیٹھا دوست مفتے کی ''کول ڈرینکیں'' سوت رہا تھا اور ''لڑکا'' اپنے غموں کو ''گولڈ لیف'' کے دھوئیں میں اڑاتے ہوئے اپنی پہلی محبت کی ناکامی کا قصہ سنا رہا تھا۔

''لڑکا'' آج کافی اداس تھا۔ یہ اداسی بے سبب نہ تھی، بلکہ اِس اداسی کی وجہ صبح صبح موصول ہونے والا وہ شادی کارڈ تھا جس میں لڑکے کو اس کی پہلی محبت کی شادی کی دعوت دی گئی تھی۔ کارڈ پر اپنی پہلی محبت کا نام اس کی سرگودھے والی پھوپی کے لڑکے کے ساتھ پڑھ کر ''لڑکے'' کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور دل کی چوبیس کلومیٹر اتھاہ گہرائیوں سے ایک دردناک آہ نکلی۔ کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں لیکن ذلیل زمین پر ہی آ کہ ہوتے ہیں۔ ''لڑکے'' کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اس اچانک ملنے والے صدمۂ بے پناہ کا فوری اثر عشق کے ہاتھوں تباہ شدہ بچے کچھ دماغ پر ہوا اور اس کا ذہن پلک جھپکتے میں ہی ریورس گیئر لگا کہ بیک گراؤنڈ پہ ''وہ پہلی بار جب ہم ملے'' والا گانا چلا کہ زندگی کے سب سے دردناک خوشگوار واقع میں کھو گیا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کالج کا وہ پہلا دن جب کلاس کی آٹھ لڑکیوں میں سے اسے صرف پانچ اچھی لگیں۔ لیکن نیلے پرنٹ والا لیلن کا سوٹ پہنے ''دردانہ'' اُسے پہلی ہی نظر میں بھا گئی۔ ''دردانہ'' کو دیکھتے ہی اس کے دل میں گھنٹی بجنا شروع ہوگئی ٹن ٹن ٹن۔ ''دردانہ'' لیکچر کے دوران لکھتے لکھتے اچانک سر اٹھاتی بال پین سے اپنا سر کھجاتی اور ہلکا سا مسکرا کر واپس لکھنے لگ جاتی۔۔۔ وہ ساری زندگی اِسی شش و پنج میں رہا کہ ایسا وہ اسے انسپائیر کرنے کے لیئے کرتی تھی یا پھر اُسے جوئیں تنگ کرتی تھیں۔ وہ ناک سڑ سڑ کر کہ انگلی سے پونچھنا، وہ چیونگم کھا کہ غبارے پھاڑنا، گویا ''دردانہ'' کی ہر ادا ہی اُس کے دل میں ایک نشتر چبھو جاتی۔ شروع میں تو وہ پینسل اسکیل لینے دینے کے بہانے اس سے بات کرتا رہا لیکن پھر جلد ہی اُن کی دوستی ہوگئی اور یہ دوستی کب پیار میں بدل گئی، معلوم ہی نہ ہوا۔ سال کا وہ آخری دن بھی آن پہنچا یعنی ''فیئر ویل پارٹی'' جس میں سب ہی نے خوب انجوائے کیا اور اُن

دونوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔۔ ''دردانہ'' تو امتحانات میں اچھے نمبروں سے پاس ہوگئی لیکن وہ دس بارہ نمبروں کے فرق سے چار مضامین میں فیل ہوگیا۔ کلاسز کا دوبارہ آغاز ہوا تو وہ اپنی پہلی محبت کو خود سے ایک کلاس دور پا کر کافی ہرٹ ہوا۔ نئے کلاس فیلوز میں لڑکیوں کی تعداد پچھلے سال سے بھی کم یعنی صرف تین تھی اس لیئے ''بے عزت افزائی'' کا بھی کوئی خاص خوف نہ تھا اور ویسے بھی اس کے ہوش وحواس پر تو صرف اس کی پہلی محبت کا خمار چھایا ہوا تھا۔ کلاسیں الگ الگ ہوجانے کی وجہ سے اُن کی ملاقاتیں کم ہی ہوتی تھیں اِس لیئے اب اُنہوں نے قائدِ اعظم کے مزار اور سفاری پارک وغیرہ جانا شروع کردیا تھا اور .اور یوں ایک اور سال بھی نکل گیا۔ اُس سال امتحانات کا نتیجہ آیا تو وہ صرف تین مضامین میں فیل ہوا تھا اور ''دردانہ'' ایک بار پھر اچھے نمبروں سے پاس ہوگئی۔ اس کا دکھ شدید ہوگیا تھا کیوں کہ ''دردانہ'' اب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے رہی تھی اور وہ اُسی کلاس میں تھا۔ اسے کیوں کہ دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے کا سلیقہ آتا تھا اس لیئے وہ یہ زہر کا گھونٹ بھی پی گیا۔ گریجویشن کرنے کے بعد ''دردانہ'' نے پڑھائی چھوڑ دی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ دردانہ کے لیئے رشتہ آیا ہے۔ اُس نے دردانہ سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی رابطہ نہ ہوا۔

''لڑکے'' کا حافظہ واپسی ''نیوٹرل گیئر'' پر آیا اور اس بار بیک گراؤنڈ میں ''دل میرا توڑ دیا اس نے برا کیوں مانوں'' والا گانا چل رہا تھا۔ شادی کا کارڈ دیکھ کر ''لڑکے'' کی پریشانی دوگنی ہوگئی تھی۔ ایک تو پہلے ہی گیارہویں جماعت کے امتحانوں کی ٹینشن اور اب یہ ''پہلی محبت کی شادی'' گویا اب جینے کا مقصد ہی ختم ہوگیا ''لڑکے'' نے دوست کو فون کیا اور اس کے ساتھ ساحل سمندر پر جانے کو کہا۔

اور اب وہی دوست مفتے کی ''کول ڈرنکیں'' سوتتے ہوئے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ ''گولڈ لیف'' کے دھوئیں میں اپنے غم کو اڑاتے ہوئے اُسے اپنی پہلی محبت کی ناکامی کا قصہ سنا رہا تھا۔ اچانک ایک سریلی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اسے نے پلٹ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا ایک دوشیزہ فیشن کے نام پر ویلڈروں والے گلاسیز لگائے کھڑی تھی۔

لڑکا:۔ ''جی فرمائیں۔''

لڑکی:۔ ''کہیں آپ وہ تو نہیں؟''

لڑکا:۔ ''جی میں وہی ہوں لیکن آپ کون؟''

لڑکی:۔ ''ارے میں وہ۔''

لڑکا:۔ ''اوہ تو آپ وہ ہیں۔''

لڑکے کے دل میں ایک بار پھر گھنٹی بجنے لگی ٹن ٹن ٹن۔

لڑکی:۔ ''تو آپ کیا کررہے ہیں آج کل؟''

لڑکا:۔ ''میں کنڈرگارڈن کالج میں۔۔۔۔''

لڑکی:۔ ''اس کی بات کاٹتے ہوئے اچھا تو آپ لیکچرار ہیں کنڈرگارڈن کالج میں!''

لڑکا:۔ ''جی جی!''

لڑکی:۔ ''میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم دوبارہ مل بھی پائیں گے۔''

لڑکا:۔ ''وہ کہتے ہیں نہ اگر کسی کو سچے دل سے چاہو تو ساری کائینات تمھیں اس سے ملانے میں لگ جاتی ہے۔''

لڑکی:۔ ''تم اب تک امی سے ڈرتے ہو؟''

لڑکا:۔ ''جان لٹانے والی نظروں سے چلو نہ جھولوں کی طرف چلتے ہیں۔''

کافی دیر پیار بھری باتیں کرنے کے بعد وہ اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کہ وہاں سے چلا آیا۔ اس اچانک ہونے والی ملاقات سے وہ بہت خوش تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ آخر اسے اس کی پہلی محبت جو مل چکی تھی۔ جی ہاں پہلی محبت اس ملاقات کے بعد اسے احساس ہوا کہ درحقیقت اس کی پہلی محبت گیارہویں جماعت کی کلاس فیلو ''دردانہ'' تھی ہی نہیں۔ بلکہ اس کی پہلی محبت تو ساتویں جماعت کی کلاس فیلو ''انوری'' ہے جس سے کچھ دیر پہلے ہی ملاقات کر کہ وہ گھر پہنچا تھا۔ لڑکے کی خوشی اتنی شدید تھی کہ اب وہ اسے لفظوں میں پرونا چاہتا تھا۔

ششششش ''لڑکا'' پوسٹ لکھ رہا ہے۔۔۔۔

مدثر عباس

کُتّے کہیں کے

یہ کتے میرے ہیں۔ آپ ان کتوں کو پطرس کے کتوں کے ساتھ مکس نہ کیجیے گا کیونکہ میرے کتے زیادہ کتے نہیں ہیں اور یہ وہ کتے ہیں جو گھروں میں باعزت زندگی گزارتے ہیں۔ پطرس کے کتے تو باہر گلی محلوں میں چرسیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں اور رات کو مشاعرہ کرتے ہیں راتوں کو مشاعرہ کرنا یہ بتاتا ہے کہ یقیناً یہ لوگ سوٹا بھی لگاتے ہوں گے ورنہ اتنی اچھی شاعری تو مشکل ہے۔

فارسی میں کتوں کو سگ کہتے ہیں مگر پاکستان میں کچھ بہت زیادہ عقیدت مند لوگ اپنے آپ کو کسی نہ کسی بزرگ شخصیت کا سگ کہتے رہتے ہیں اگرچہ اس شخصیت نے ایسا کوئی تقاضا نہیں کیا ہوتا۔

ہمارے ہاں ماں باپ بچوں کو غصے میں آ کر کتا یا کسی اور جانور کا نام لے دیتے ہیں سب جانوروں کے نام نہیں لکھے جاسکتے ممکن ہے میرا قلم چالیس دن کے لیے ناپاک ہو جائے مگر مجھے سمجھ نہیں آئی کہ کتا تو کافی وفادار جانور ہے اور اس میں کوئی بڑی خرابی بھی نہیں، خرابی تو انسان میں ہے۔ میرے خیال میں بچے کے لیے سب سے بڑی گالی یہی ہے کہ آپ اسے انسان کہہ دیں۔

کہا جاتا ہے کہ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں مگر واللہ میں نے کوئی ایسا کتا نہیں دیکھا جو بھونکا ہو اور کاٹنے کو نہ دوڑا ہو۔ یہ تو انسان کی چالاکی ہے کہ اس کے پلان کو فیل کر دیتا ہے ورنہ وہ تو خلوصِ نیت کے ساتھ آشیرباد دینے آرہا ہوتا ہے۔

اِن کتوں کو گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو اکثر ایسے کتے مالک کی رکھوالی کے لیے رکھے جاتے ہیں مگر ترقی یافتہ ممالک کے کتوں کی خود مالکوں کو رکھوالی کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ کتوں کا بہت خیال کرتے ہیں اور اُن کو ایسی ایسی غذائیں دیتے ہیں جو راقم اور اِس ملک کی بڑی آبادی نے دیکھی بھی نہیں ہیں۔

گھریلو کتے بھی اچھی خاصی غذا کھا کر بھی رات کو جاگتے ہیں۔ اُلو بارڈر پہ فوجی اور کتے ان کے نصیب میں رات کو سونا نہیں لکھا۔

ہم تیسری دنیا کے لوگ مغرب سے بہت پیچھے ہیں اور ہمارے کتے بھی۔ وہاں کتوں کو خصوصی حقوق ملتے ہیں۔ ایک دوست بتا رہے تھے کہ مغرب میں اکثر وہ لوگ کتا نہلاتے ہیں جن کے اپنے دیس کے کتے غربت اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا

جب مغرب میں انسانی حقوق کی باتیں ہوا کرتی تھیں اب وہ لوگ اس سے آگے جانوروں کے حقوق کی بات کر رہے ہیں اور ہمیں انسانی حقوق میں الجھا دیا ہے۔

مغربی کتے اور پاکستانی کتے میں کچھ چیزیں مشترک ہیں مثلا دونوں کی چار چار ٹانگیں ہوتی ہیں دونوں غراتے ہیں دونوں کی شادیاں نہیں ہوسکتیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ہاں کا کتا ڈپریشن کے ماحول کی وجہ سے زیادہ سخت مزاج ہو۔

گھروں میں پالے جانے والے کتے مختلف انواع واقسام کے ہوتے ہیں۔ کچھ کے ہمیں نام آتے ہیں، جن میں پستہ، بوہلی، جرمن شیفرڈ، السشن وغیرہ ہیں۔ اِن کی اور بھی بہت سی اقسام ہیں، جن کا ہمیں علم نہیں شائد اِسی لیے مرحوم پطرس نے ایسے کتوں کا انتخاب کیا جن کو چرسی اور گھر سے عاق کیا ہوا کہا جاسکتا ہے۔

انگریز مردوں کی توجہ عورتوں پر اور انگریز عورتوں کی توجہ کتوں بلیوں پہ ہوتی ہے۔ وہاں کے کتے بھی اس قدر سلجھے ہوئے اور لائق فائق ہوتے ہیں کہ انگریزی بھی سمجھ لیتے ہیں اور مجال ہے جو راستے میں کسی انسان کو تکلیف دیں مگر ہماری بدقسمتی دیکھیں کہ ہمیں کتے بھی ملے تو وہ جن کو گھر سے باہر لے کر جایا جائے تو بدنامی کا باعث بنتے ہیں اور نالائق اتنے کہ انہیں انگریزی کی اے بی سی نہیں آتی۔ لیکن ہمارے کتوں میں اچھی بات ہے کہ انہیں جو دو اس پہ قانع ہو جاتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی کسی اور کوٹ کے لیے نہیں غراتے جبکہ مغربی کتے موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لباس بھی تبدیل کرتے ہیں۔

پاکستان کے کچھ علاقوں میں انسانوں کی پرزور حمایت اور زور پر کتے آپس میں لڑنے پہ مجبور ہوتے ہیں۔ اگرچہ لڑائی میں ایک نے جیتنا ہوتا ہے اور دوسرے نے ہارنا۔۔۔ ایک کتا جیتتا ہے اور ایک ہارتا ہے۔ یہاں کتوں اور انسانوں میں ایک باریک فرق یہ ہے کہ کتے اپنی ہار کو مان کر میدان سے کھسک لیتے ہیں مگر اشرف المخلوقات انسان اپنے کتے کی ہار کو اپنی ہار مانتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کرتا اور جیتنے کے لیے پھر کتے کو تیار کرتا ہے اور کتا مالک کی اطاعت میں تیار بھی ہو جاتا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ کتا سب سے وفادار جانور ہے مگر یہ انسان کو متاثر نہیں کر سکا ہم اس کی وفاداری تب مانتے جب یہ اپنے مالک کو بھی وفادار بنا دیتا۔

آپ گٹر میں کسی تحقیق کے سلسلے میں گئی تھیں یا رہائش کا مسئلہ تھا؟

حافظ مظفر محسن

سیلفی دور کی مونالیزا اور گوالمنڈی کی باقر خانی

ٹیچر: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اکبر بادشاہ اپنے بستر پر آرام فرما رہے تھے۔۔۔

سٹوڈنٹ: ''مس۔۔۔دیکھیں علی مجھے تنگ کر رہا ہے۔پنسل باریک کر کر کے مجھے چبھو رہا ہے۔

ٹیچر: ''علی اب اگر کسی کو تنگ کیا تو کلاس سے باہر نکال دوں گی۔۔۔''ہاں۔۔۔تو بچو میں کہاں تھی۔۔۔؟''

علی: ''مس اکبر بادشاہ کے بستر پر۔۔۔!!!!''

ٹیچر: ''لکھ لعنت اے۔۔۔؟''

اصل میں میں بتانا چاہ رہا تھا کہ آج کل ''بچے کس قدر توجہ'' دیتے ہیں اپنی تعلیم پر اور کس مستعدی سے، توجہ سے کلاس میں بیٹھتے ہیں۔۔۔جب سے ''مار نہیں پیار'' کا اصول اسکولوں میں نافذ ہوا ہے۔اسکولوں میں ''دوڑ اپنی اپنی'' ہے۔۔۔پھر یہ سوشل میڈیا۔صبح فیشن ایجاد ہوتا ہے اور شام تک پرانا بھی ہو جاتا ہے۔پہلے ہوتا تھا IDEAS HAVE LEGS پھر یہ بات پرانی ہو گئی اور کہا جانے لگا کہ IDEAS HAVE WINGS۔

اب بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے۔۔۔سترہ سال کا بچہ معتبر لگتا ہے۔۔۔''قبول صورت'' لڑکیاں میک اپ کے زور پر حسین جمیل لگنے لگی ہیں اور حسن کی یہ فروانی مجھے کسی ''طوفان'' کا پیش خیمہ لگتی ہے۔

انور خاں صاحب ہمارے استاد ہیں۔فیس بک پر کسی خاتون نے اُن کو پسند کر کے بات بڑھانا چاہی تو شام کو ہمیں بلا لیا۔۔۔ چائے وائے پلائی اور طریقے سے مشاورت کرنا چاہی۔ ہم نے ''محترمہ'' کی تصویر دیکھی اور پسند بھی کر لیا (استاد جی کے لیے؟) مگر فرمانے لگے یار عمر کچھ زیادہ ہے (چالیس کی ہوں گی؟ ہم نے اندازہ لگایا) میاں میں اپنی عمر کی

بات کر رہا ہوں۔۔۔لگتا ہے اس وقت تم بھی میری طرح کہیں ''کھوئے'' ہوئے ہو۔۔۔ خاں صاحب نے مجھے جھڑک دیا ''حضور ۶۶ سے تو کم ہیں۔۔۔اب تو BOTOM LINE شادی کی عمر کے لیے ۶۴ سال ہے۔۔۔سمجھ گئے۔۔۔تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اب عمران خان کو FOLLOW کریں گے۔۔۔اس کام میں بھی؟ عورتیں دو شادی والے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں یہاں تو معاملہ تین تک جا پہنچا؟ ویسے خان صاحب یہ ۶۳ سال کی عمر میں ضرورت کیوں پیش آئی آپ تو MOD تھے خاصے، جوانی میں۔آپ کے کلاس فیلوز بتاتے ہیں ،گھر کا ماحول بھی ۲۰۱۶ء جیسا تھا ۱۹۶۴ء میں بھی؟ ۔۔۔ہاں۔۔۔ ہاں یار ہم ''موڈ'' تھے جبھی تو یہ کسک سی رہ گئی ۔۔۔ فیصلہ نہ کر سکے ۔۔۔یا یوں کہہ لو درست فیصلہ نہ کر پائے ،زرینہ کا رشتہ آیا تو امی مجھے بھی ساتھ لے کر لڑکی کے گھر پہنچ گئیں۔زرینہ کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ''ہم پسند کر لیے گئے ہیں؟'' ویسے آنکھیں تھیں بھی بہت حسین ۔۔۔۔اور خود بھی اپنی آنکھوں جیسی تھی ۔۔۔چائے وائے پی۔اپنا گھر سمجھ کر EASY ہو کر بیٹھ گئے اور جب زرینہ نے گفتگو شروع کی تو ہم ''سمٹ'' گئے ۔خود پر سنجیدگی طاری کر لی۔

چلو ماں جی چلتے ہیں۔۔۔میں نے ماما کی انگلی پکڑی اور ہم سلام دعا کیے بغیر ہی وہاں سے رخصت ہوئے۔

''کیا ہوا انو؟'' امی نے محبت سے پوچھا۔

''ماما۔۔۔یہ زرینہ کی آواز کتنی بھدی ہے؟'' جب تک چپ

ہمارے ہاں اکثر یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی کوئی نظم جب بہت زیادہ مقبول ہو جاتی ہے تو خود شاعر کے لیے یہ نظم ایک آسیب کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، جیسے ساحر لدھیانوی کے لیے ''تاج محل'' اور سکندر علی وجد کے لیے ''اجنتا''۔''یہ ہے میرا ہندوستان'' والا گیت بھی زبیر کی ذات سے کچھ اس طرح مربوط و منسلک ہو گیا ہے کہ زبیر کسی مشاعرے میں جائیں، یا کسی نجی محفل میں، لوگ اس گیت کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔آپ حیرت کریں گے کہ میں نے ۱۹۶۲ء میں زبیر کو حیدر آباد کے ایک مشاعرے میں یہ گیت سناتے ہوئے دیکھا تھا اور ابھی کچھ دن پہلے میں نے زبیر کو دہلی کے ایک مشاعرے میں یہی گیت سناتے ہوئے دیکھا ہے۔اس گیت سے خود زبیر کی الجھن کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ایک شام زبیر بہت خوش دکھائی دیے۔خوشی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے ''کئی ہفتوں بعد آج وہ خوشگوار دن آیا ہے، جب کسی کو ہندستان کا خیال نہیں آیا۔''

میں نے پوچھا ''کیا مطلب؟''

بولے ''آج کا دن وہ مبارک دن ہے جب میں نے کسی کو 'یہ ہے میرا ہندوستان' والا گیت نہیں سنایا۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج ہندوستان تمہارا نہیں رہا۔''

بولے ''جی نہیں! آج ہندوستان سچ مچ اپنا لگ رہا ہے۔ٹوٹ کر پیار آ رہا ہے اس پر، بلکہ یوں سمجھو کہ میرے حق میں ہندوستان آج ہی آزاد ہوا ہے کیونکہ آج میں اپنے ہی گیت کی غلامی سے آزاد ہوں۔دیکھو تو آج جمنا ندی کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہے اور ہاں آج موسم کتنا خوشگوار ہو گیا ہے۔چلو آج قاضی سلیم کے ہاں چلتے ہیں۔''

ہم قاضی سلیم کے ہاں پہنچے۔گھنٹی بجائی تو قاضی سلیم کی سات سالہ بیٹی سلمیٰ نے دروازہ کھولا۔اندر سے قاضی سلیم نے بیٹی سے پوچھا ''بیٹی کون آیا ہے؟''

سلمیٰ نے کہا ''مجتبیٰ انکل اور ''یہ ہے میرا ہندوستان'' آئے ہیں۔''

اُس شام قاضی سلیم کے ہاں کچھ اور مہمان بھی بیٹھے تھے۔لہٰذا تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ زبیر پھر جذبۂ حب الوطنی سے سرشار تھے اور ہندوستان پھر اُن کا ہو گیا تھا۔

زبیر رضوی از مجتبیٰ حسین

تھی، کتنی حسین لگتی تھی، جب بولی تو ''مری'' کے کوئے یاد آ گئے۔۔۔جب ہنسی تو یوں لگا جیسے ''شاذ ورٹرک'' سٹارٹ ہوا ہو یا بیس سال پرانی ''سیونٹی''۔۔۔عورت کی آواز تو خوبصورت ہو۔۔۔ بندہ کہے۔۔۔ بیگم چائے لاؤ اور بیگم محبت سے سریلے انداز میں کہے ''آئی جی'' اور یوں محسوس ہو جیسے ہم نے ''دودھ پتی والی چائے پی لی''۔۔۔ اگر بیگم کی آواز ہی ڈرا دینے والی ہو تو ۔۔۔اور اوپر سے وہ بدتمیز بھی نکل آئے تو۔۔۔ پھر۔۔۔؟ ''تربوز'' اور ''بیگم'' کا کھلنے پر ہی پتہ چلتا ہے۔'' ایک دولت مند شخص نے ایک بیش قیمت ہار اپنی سیکرٹری کو پیش کر کے معاوضے میں پارک کی سیر کا طے کیا۔ جب سیکرٹری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ گھوم رہا تھا تو اتفاق سے اُس کی بیوی بھی آ پہنچی اور دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر غصے میں واپس چلی گی۔ گھر پہنچ کر اُس نے مقامی اخبار کے ایڈیٹر کو فون کیا ''کل کے اخبار میں میرے شوہر کی موت کی خبر شائع کر دیں؟'' ایڈیٹر نے اظہارِ غم کرتے ہوئے پوچھا ''اُن کا انتقال کب ہوا؟'' تو بیوی نے غصے سے کہا ''آج شام کو ہوگا۔''

ماما میری بات سمجھ گئیں۔۔۔ دو ماہ کی جدو جہد کے بعد ماما نے میرے لئے ایک ''قبول صورت'' لڑکی کا رشتہ دریافت کر لیا۔ ویسے استاد کمر کمانی کہتا ہے کہ کچھ شیطان لڑکے محبوبہ سے ملنے دیوار پھلانگ کر دوسروں کے گھر پہنچ جاتے ہیں، لوڈ شیڈنگ کے وقت اور اچانک لائٹ سوا دس بجے کی بجائے پونے دس بجے آ جائے اور دونوں ''رنگے ہاتھوں'' پکڑے جائیں تو لڑکی بے چاری کے ساتھ تو جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے، ایسے لڑکے کے لیے گھر والے جلدی میں ''قبول صورت'' لڑکی کا رشتہ تلاش کرتے ہیں اور ''اگلے اتوار'' شادی کر کے فارغ ہوتے ہیں اور ہفت روزہ ''۔۔۔'' کے نئے شادی شدہ جوڑوں والے صفحے پر تصویر بھی چھپوا دیتے ہیں اور شب برات والے دن ''زردے کی پلیٹ'' کے ساتھ ہفت روزہ ''۔۔۔۔'' بھی ساتھ بھیج دیتے ہیں کہ لڑکی کو پتہ چل جائے کہ ''انُو کی ثمینہ قبول صورت'' کے ساتھ شادی ہو چکی ہے۔

لو جناب ماما نے بتایا۔۔۔ میرے لعل لڑکی تو قبول صورت ہے لیکن آواز یوں ہے جیسے مینا کماری فلم ''پاکیزہ'' میں بولتی ہے ......ثمینہ پیرزادہ ۲۷ سال پہلے ''نیلام گھر'' میں اور ماروی میمن چوتھی بار پارٹی بدل کر نئی پارٹی کے پلیٹ فارم سے پریس کانفرنس کر رہی ہو۔

ہم نے ماما کے سامنے ہی کہہ دیا۔۔۔ ''قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔۔۔''

ہماری ہنسی نکل گئی ''سر جی۔۔۔ گویا کہ منزل تو پا لی ناں آپ نے؟''

''آہا۔۔۔!'' استاد جی نے نہایت ٹھنڈی آہ بھری ''ہاں بیٹا ساری زندگی ۔۔۔ہم نے بغیر تصویر کے ٹیلی ویژن دیکھا ۔۔۔بیگم سے گانے بھی سنے۔۔۔ وہ گاتی رہتی ہم اخبار پڑھتے رہتے۔۔۔ مجال ہے جو آنکھ اُٹھا کے دیکھی ہو۔۔۔ ہاں البتہ ہم گھر فون کرتے تو ہیلو کا جواب ''ہیلو'' اتنی مدھر آواز میں آتا کہ ہم خوابوں میں کھو جاتے، جیسے باغوں پارکوں میں کوئل کوک رہی ہو بچوں کو ڈانٹ ڈانٹ کے اب وہ ''سریلی'' آواز بھی ہماری پرانی ہونے والی منگیتر زرینہ جیسی ہو چکی ہے۔

انور خاں صاحب۔۔۔ پرانے دور کے ''موڈ'' تھے۔ ہمیں ''سیلفی دور'' کے ''موڈ'' جوڑوں پر ترس آتا ہے کہ وہ ''ویلنٹائن ڈے'' کی تیاریاں اس زور سے کر رہے ہیں جیسے ''مونا لیزا'' کے لیے ''یوسف ثانی'' گلاب لیے جا رہا ہو حالانکہ بچوں کو ڈانٹ ڈانٹ کے اور شوہر کو جھڑک جھڑک کے سب آوازیں زرینہ جیسی ہو جاتی ہیں لیکن اگر ساٹھ کے بعد انور خاں بھی غور سے شیشہ دیکھے تو اُسے بھی یوں لگتا ہے جیسے ''گوالمنڈی'' کی ''باقر خوانی'' اُس کے منہ کی جگہ شیشے میں دکھائی دے رہی ہو۔

تاریخ کے اوراق سے ایک سچا بیان ''ویلنٹائن ڈے'' منانے والوں کے لیے پیش ہے۔ مغل بادشاہ شاہ جہان نے ''تاج محل'' کی ہر دیوار کو دیکھا۔۔۔ ہر مینار کو دیکھا۔۔۔ ہر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔۔۔ اور بولا ''ماں قسم۔۔۔ بہت خرچہ ہو گیا۔۔۔؟''

اُمید ہے۔۔۔ سمجھ تو گئے ہوں گے۔۔۔؟

حسیب احمد حسیب

مرحوم بیگ صاحب

بیگ صاحب مرحوم سے ہمارا پرانا تعلق تھا بلکہ یوں کہیئے کہ وہ ہمارے گھر کا ایک جزوِلازم تھے۔ ہماری بیگم اگر دنیا میں کسی سے ڈرتی تھیں تو وہ بیگ صاحب ہی تھے بلکہ یوں کہیے کہ جتنا ڈر ہمیں اپنی بیگم کا ہے،اُس سے زیادہ ہماری بیگم بیگ صاحب سے خوف کھاتی تھیں۔

بیگ صاحب بڑی پہنچ والے تھے۔ گھر کا کچن ہو یا واشروم چھت ہو یا چمکتا ہوا فرش لکڑی کی الماری ہو یا شیشے کی میز بیگ صاحب ہر جگہ پہنچ جاتے تھے ایک دن تو مرحوم دادا جان کی شلوار سے برآمد ہوئے۔

ارررے کسی غلط فہمی کا شکار مت ہوں بات ہو رہی ہے مرحوم ''لال'' بیگ صاحب کی، جنھیں عرفِ عام میں ''کاکروچ'' کہا جاتا ہے۔

حضرت کو شہید کرنے کی کئی تدبیریں کی گئیں، طرح طرح کے منجن آزمائے گئے، ہر روز کوئی نئی دوا ڈالی جا رہی ہے،بعض دوائیں تو اتنی زہر آلود تھیں کہ گھر کے باقی لوگ قریب المرگ ہو گئے لیکن مجال ہے جو بیگ صاحب کو کچھ ہوا ہو۔۔۔ اور تو اور بیگم کی جھڑکیوں اور کوسنوں کا بھی موصوف پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

دادا جی نے اپنی لاٹھی کے جوہر دکھانے کی کوشش کی، ہماری پشاوری چپل اسی چکر میں ٹوٹی، بیگم نے جھاڑو آزمائی، ماسی نے گرم گرم پانی پھینک کر قتل کی ناکام کوشش کی لیکن موصوف نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے، گھر کی بلی ہو یا باہر کا چوہا مرحوم کبھی بھی کسی دشمن کو خاطر میں نہ لائے۔

خبروں کے بڑے شوقین تھے۔ اکثر اخبار پر ٹہلتے ہوئے پائے گئے۔ کیا شان بیان کی جائے حضرت کی طویل مونچھوں کی۔۔۔ ابھی بھی سوچ کر بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ موصوف کو گرمی میں ٹھنڈی اور سردی میں گرم غذائیں کافی پسند تھیں۔ سردیوں میں گرمی کا مزہ لینے اکثر چولہے کے نیچے سے نکلتے اور گرمیوں میں کئی مرتبہ فریج میں سے برآمد ہوئے۔

موصوف کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ اکثر اپنی ازلی دشمن بی چھپکلی کی نظروں کے سامنے دندناتے ہوئے گزر جاتے اور چھپکلی کو جرات تک نہ ہوتی ایک بار بی چھپکلی نے کوشش بھی کی تو حضرت نے آڑے آئی۔

ذات دی کوڑھ کلی، تے شہتیر اں نوں جپھے

بے چاری چپکی ہو رہی۔

ایک بار سپارے والے قاری صاحب کی ریش مبارک میں سے نمودار ہوئے۔ اُس کے بعد قاری صاحب بھی ہوشیار ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ بیگ صاحب کی شکل میں کوئی جن ہے جو اُن پر حملہ اور ہوا تھا۔ آس پڑوس کی ضعیف الاعتقاد خواتین تو کئی بار برکت کیلئے دعا کروانے بھی آئیں۔

بیگ صاحب کی پہنچ کتنی دور تک تھی اس بات کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا۔۔۔ ایک بار قادری صاحب کی تقریر کے عین دوران کہیں سے نمودار ہوئے اور پوری تقریر انکے شانے پر بیٹھ کر سنی گو قادری صاحب اسکرین کے پیچھے تھے۔

خان صاحب پر مرحوم فدا تھے۔ اکثر اُن کو ٹی وی پر دیکھ کر جوش میں آ جاتے۔ اس کے اثرات کچھ یوں پڑے کہ گھر میں آنے والے فلمی رسالے اُن کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔

ایک دن وینا جی کے گمشدہ آنچل میں چھید دیکھ کر ہمیں بڑا غصہ آیا، پہلے سوچا یہ بیگم کی کارستانی ہے پھر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا یہ تو موئے لال بیگ کی گھٹیا حرکت ہے۔

موصوف کی وفات کی صحیح وجہ تو معلوم نہ ہوسکی لیکن گمان غالب یہی ہے کہ بسیار خوری کا شکار ہو کر حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

لاش کچن میں رکھے چاکلیٹ کیک سے برآمد ہوئی۔۔۔

گو بیگم کا خیال تھا بیگ صاحب کے جسد خاکی کو کوڑے کے ڈبے کی زینت بنا دیا جائے لیکن ہمارا دل نہ مانا اور جناب کو اُن کی شان کے مطابق فلش میں بہا دیا گیا۔

چلو تو سارے ”زمانے“ کو ساتھ لے کے چلو

گوہر رحمان گہر مردانوی

باادب بے ادب

اُس شخص کی آنکھیں یا تو قدرتی طور پر بھینگی تھیں یا قطار میں کھڑے دھکم پیل اور بینک کے ''حبسِ بے جا'' کی وجہ سے شرق وغرب کی طرف مڑی نظر آ رہی تھیں اور چال بھی کچھ کچھ بھنگیوں جیسی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ نحیف ونزار بدن ابھی دھڑام سے زمین بوس ہونے والا ہے، جس کو ایک نیم شریف زادے نے بازو سے پکڑ رکھا تھا اور اسی دھکم پیل میں مشکل سے راستہ بناتا ہوا اور یہ کہتا ہوا نکل رہا تھا۔۔۔''ہٹو ہٹو بھئی! معرکہ تو سر کر لیا ہے یعنی تنخواہ تو وصول کر لی ہے مگر بزرگوار گرمی سے بے حال ہیں، راستہ دو ورنہ خونِ ناحق ہونے والا ہے۔''

تو یارو! واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہم غریب مسکین ٹھہرے ''تن۔۔۔خواہ'' دار اور ہر کیم کو ہماری عید ہوتی ہے مگر عید بھی محض آدھے دن کی۔۔۔ پھر یہ مصرع دوہراتے پھرتے ہیں کہ ''چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے''۔۔۔ہاہاہا۔۔۔کیونکہ مہینے بھر کی خواری راستے ہی میں اُڑن چھو ہو جاتی ہے اور کریانے والا، دودھ والا، سکول کی فیسیں، ٹرانسپورٹ والا، سبزی والا، گیس والا ہمارے انتظار میں ماہیے گاتے، منتظر رہتے ہیں۔ اس پر جب کسی سے ادھار لیا ہو تو وہ تو ہزار توپوں کی سلامی کے ساتھ رستے میں ہوتا ہے، اور پھر ہم انتیس ۲۹ دن کے لئے جھینگر بن جاتے ہیں۔ سیٹیاں تو بجاتے ہیں مگر کھوکھلے سینے سے آواز ہی نہیں نکلتی، اس لیے کوئی فریاد کیا سنے۔

ارے ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یکم کو علی الصبح سکول سے پیشگی چھٹی کر کے نیشنل بینک کی راہ لی تا کہ پہلے پہنچ کر گیٹ پر قبضہ کیا جائے مگر ہائے ری قسمت، مجھ سے کچھ زیادہ ہی مستعد قبضہ گروپ شائد فجر پڑھ کر ہی وہاں براجمان نظر آئے جبکہ بینک نے ٹھیک نو بجے کھلنا تھا۔ ہم بھی تقریباً سوا سات بجے پہنچے اور لگ بھگ تیس بھوکوں کے پیچھے قطار میں اٹینشن ہو گئے۔ جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا، پنگانِ زر جمع ہوتے گئے مگر بجائے قطار کے، بینک کا دروازہ بھر گیا، اس پر مستزاد یہ کہ پچھواڑے سے پینشنز وصول کرنے والے بابوں کو بھی اسی گیٹ کی طرف ہانک دیا گیا تو رش اور بڑھ گیا۔ خصوصاً گیٹ کے قریب تو میلۂ مویشیاں لگ گیا اور جیسے ہی گیٹ کی باچھیں کھل گئیں، سارے ادب نواز بے ادبی کا ایسا مظاہرہ کرنے لگے کہ

سوریا سے ایک شاعر صلاح الاسیر تشریف لائے۔ قتیل شفائی صاحب نے جو اُن دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری تھے' اُن کا استقبال کرتے ہوئے کہا ''پہلی دفعہ میں نے دیکھا ہے کہ اسیر بے زنجیر بھی ہوتے ہیں۔''
اِس پر اسیر نے برجستہ جواب دیا ''میں نے بھی پہلا قتیل دیکھا ہے جو قتل ہونے کے بعد بھی زندہ ہے۔''

الامان والاحفیظ۔ اُس وقت وہاں قطار میں یا تو ہماری آئندہ نسل کو شعور و ادب سے آراستہ کرنے والے اساتذہ کھڑے ہوئے تھے یا پھر دیگر محکموں کے پڑھے لکھے ملازمین۔ پولیس اور بینک عملہ بہتیرے رش کم کرنے اور قطار کو سلیقے سے اندر آنے کو کہہ رہے تھے مگر اِس قیامت صغریٰ میں بھلا کون کسی کی بات سنتا ہے اور ہم جو بہتوں سے پہلے آئے تھے، کھینچا تانی میں پس کر رہ گئے اور رفتہ رفتہ سب سے پیچھے دھکیل دیے گئے۔ بھلا کیم شحیم پہلوان نما اور پھولے ہوئے پیٹوں کا مقابلہ ہم لاغر کہاں کر سکتے تھے، اِس لیے آرام سے ایک طرف بیٹھ کر رش کم ہونے اور نفسا نفسی کا تماشہ دیکھنے لگے۔ سوچنے لگے کہ یا وحشت! با ادبوں کا جب یہ حال ہے تو پاکستانی بے ادبوں نے دہشت گرد بننا ہی بننا ہے۔

رش ختم ہوا تو بینک میں داخل ہوئے مگر وائے افسوس رش اور بجلی کی عدم موجودگی نے بینک کی فضا کو کچھ ایسا بنا دیا تھا گویا ہم بینک نہیں بلکہ کسی اصطبل میں داخل ہو گئے ہوں۔ طرفہ یہ کہ اب ایک اور قطار میں کھڑا ہونا تھا جو اونٹ کے آنتڑیوں کی طرح لمبی تھی۔ ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق جب کھیسے میں ایک کپ چائے پینے کے بھی پیسے نہ ہوں تو انتظار اور وہ بھی قومی بینک کی تعفن زدہ برانچ میں، جہاں کے ملازمین کا نشہ آسمان سے باتیں کرتا ہو اور ایک معمولی کلرک بھی سیدھے منہ بات کرنے کا روادار نہ ہو، اس پر بجلی کی عدم موجودگی، واللہ سیدھی سجاؤ عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور روزِ حشر میں گناہگاروں کے لئے جس سزا کی وعید ہے اُس کے مظاہرے کی ایک فوٹوسٹیٹ ہے۔

سب پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی جب بجلی باجی آدھمکی مگر اب ایک اور اعلان بینک کے چرچراتے سپیکر سے ہو رہا تھا۔ ہمارے کان پھر ہوا ہو گئے، مبادا یہ نہ کہا جا رہا ہو کہ سب نکل جاؤ تنخواہ کل ملے گی مگر سپیکر کی گھٹی گھٹی آواز جیسے کسی نے بولنے والے کا گلہ دبا رکھا ہو، یہ فرمانے کی کوشش کر رہی تھی کہ آن لائن رابطہ ابھی تک نہ ہو سکا، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ رابطہ جلد از جلد رابطہ بحال ہو۔ سب سُن رہے تھے مگر سب کو معلوم تھا کہ رابطہ بارہ بجے کے بعد ہی ہونا ہے کیونکہ اگر اس باب میں جلد بازی کی جائے تو کروڑوں پر نفع کون اور کس طرح کمائے، اس لیے بینک کے اندر موجود قطار میں چہ میگویوں کی بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ کوئی کہتا تھا کہ روڈ بلاک کرتے ہیں، کوئی مینجر کے پاس جانے کی بات کر رہا تھا مگر مجال ہے کہ کوئی اپنی جگہ سے ہٹ کر دیا ہو، اِس امید پر کہ کیا خبر ابھی کے ابھی رابطے کا کوئی معجزہ ہو جائے ہو اور ہمارا کام چکتا ہو جائے۔ گھڑی نے بھی جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ ہم لوگوں کے صبر و تحمل کا بھرپور امتحان لے گی ۔۔۔اب ہم سب لوگ تھے اور انتظار انتظار انتظار۔۔۔ بیکار مباش کچھ کیا کر، دامن ہی پھاڑ کر سیا کر، بعضوں نے سیٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ جن کے ذمہ سکولوں میں بچوں کو عقل و تہذیب سکھانے کا کام لگایا گیا تھا، یہ ان کی اپنی تہذیب کا انداز تھا۔ کچھ لوگ مایوس ہو کر چلے بھی گئے تھے مگر جس طرح پاکستان کا سیاسی نظام ٹھیک ہو کر بھی ٹھیک نہیں ہو رہا ہے، اسی طرح اس کے بینک کا نظام بھی خدا خدا کر کے بارہ بجے تک خوار ہونے کے بعد بحال ہوا۔ ایک بار پھر اُسی تہذیب کا مظاہرہ ہونے لگا جو باہر ہو چکا تھا اور اُوپر کا قضیہ اسی کا شاخسانہ تھا۔

اب اپنی خواری کی اور کیا رام کہانی بیان کروں، تقریباً ایک بجے تنخواہ وصولنے کے بعد جب میں بینک سے باہر نکل رہا تھا تو سر میں شدید درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں لیکن اس کے باوجود میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارا بنے گا کیا؟ جب پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے کا یہ حال ہے تو نیم خواندہ بلکہ اَن پڑھوں کا تو خدا ہی حافظ ہے، یعنی باادب جب بے ادبی پر اتر آتے ہیں تو کس قانون کا احترام کریں اور جو اس سے سرے سے باخبر ہی نہ ہوں، اُن میں سلیقہ شعاری کہاں سے آئے؟

م۔ ص۔ ایمن

ھمزلف

معاشرے میں لڑکی جہیز کے انتظام اور لڑکا بالغ ہونے کے بعد، اپنے پیروں پر کھڑا ہونے تک ''تنہا'' کہلاتے ہیں، اس تنہائی کو دور کرنے کے چکر میں وہ شادی سے دوچار ہوتے ہیں اور یوں ان کے ساتھ ایک اور ''تن'' کا اضافہ ہوجاتا ہے اس طرح وہ سچ مچ ''تن ہا'' ہوجاتے ہیں۔

جہاں تک ''شادی سے دوچار ہونے کا'' تعلق ہے، یہ لایعنی نہیں ہے۔ مشاہیر کا قول ہے کہ ''بہترین دوست کی پہچان یہ ہے کہ 'وہ مصیبت کے وقت' آپ کے ساتھ کھڑا ہو'' آپ کیسے پہچانیں گے کہ آپ کا بہترین دوست کون ہے؟ اپنی شادی کی مووی یا البم میں دیکھ کر باآسانی پہچان سکتے ہیں

ایک (خود ساختہ) مفکر کا قول ہے (اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ یہ مفکر اس وقت آپ کے سامنے کھڑا ہے) کہ بالغانہ رشتوں میں اضافہ ہونے یا اضافہ کرنے کی عمر محدود ہوتی ہے یعنی اس حرکت یا عمل کی حد مقرر ہوتی ہے جب عمر کی وہ حد گزر جائے تو مرد (یا عورت) باقی ماندہ زندگی تنہا ہی گزار دیتے ہیں اور ''تن ہا'' ہونے سے باز رہتے ہیں۔

دُوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اور ''عقل داڑھ'' کی پیدائش کے بعد عقل میں اضافہ ہوجاتا ہے اور ''شدہ'' افراد کی حالت زار دیکھتے ہوئے تنہا شخص ''تن ہا'' ہونے سے تائب ہوجاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ دیگر واقف کاروں کو بھی شادی نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تنہائی دور کرنے کی اس حرکت کے ساتھ ہی بے شمار رشتوں میں تبدیلی یا اضافہ ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر قبل ''باجی' کہلانے والی لڑکی اچانک ہی 'بھابی'' بن جاتی ہے۔ جو چند لمحے پہلے بہن کہلاتی تھی، وہ نند، دیورانی یا جیٹھانی بن جاتی ہے۔ حسب مراتب کسی کی پھوپی کسی کی خالہ، کسی کی ممانی اور کسی کی چچی یا تائی کہلانے لگتی ہے۔ بیٹی کہلانے والی لڑکی بہو کہلاتی ہے۔

اگر اس گھرانے سے لڑکی کا پہلے سے کوئی رشتہ نہ ہوا تو وہ شوہر کے ماں باپ کو ہی امی ابا کہنا شروع کر دیتی ہے اسی طرح دیگر تمام رشتہ دار بھی وہی کہلاتے ہیں جو شوہر کے ہوتے ہیں۔ لڑکا بھی ان رشتوں میں اضافے کے سبب بھائی سے ''دولہا بھائی' اور نندوئی بن جاتا ہے کسی کا دیور اور کسی کا جیٹھ اور بھتیجے بھانجے کے ساتھ ساتھ ''داماد'' بھی کہلاتا ہے بالمقابل رشتوں میں بیوی کے بہن

بھائی اس کے سالا اور سالی کہلاتے ہیں۔
معاشرے میں ایسے رشتے بھی موجود ہوتے ہیں جن کی شناخت کے لیے ''منہ سے بولنے کی'' ضرورت ہوتی ہے ایسے رشتے عموماً ''منہ بولے'' رشتے کہلاتے ہیں۔ اِن منہ بولے رشتوں کی ملاوٹ صرف اور صرف حقیقی رشتوں میں ہی ہوتی ہے مثلاً منہ بولا بھائی منہ بولا بیٹا منہ بولی بہن منہ بولی بیٹی، منہ بولی ماں جبکہ وصلی یعنی بالغانہ رشتوں میں ان کی ملاوٹ کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آئی۔ مثلاً آپ نے کبھی ''منہ بولا سسر، منہ بولا سالا وغیرہ جیسے رشتے نہیں سنے ہوں گے، ہاں البتہ توفیق کے بقول فلموں میں منہ بولی بیوی اور منہ بولا شوہر جیسے رشتے مل جاتے ہیں۔
انگریز اس سارے جھنجٹ سے آزاد ہے۔ وہ ان تمام رشتوں کو ''اِن لاز'' کہہ دیتا ہے مثلاً ''بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ'' ''غلطی سے'' رشتہ اِزدواج سے منسلک ہو جائیں تو ان کے رشتہ داروں کا آپس میں ''ان لاء زرشتہ'' قائم ہو جاتا ہے۔ سسٹر ان لا، برادر اِن لا وغیرہ وغیرہ۔
شوہر کا اپنی بیوی کے باپ، یعنی اپنے سسرے' پہلے سے کوئی رشتہ موجود نہیں تھا تو وہ اپنی بیوی کے باپ کو''فادر ان لاء'' کہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''قانونی باپ'' یعنی لائسنس ہولڈر (قانونی کاغذ، نکاح نامہ رکھنے کے سبب) والد بزرگ۔ ساس کو''مدر ان لاء'' کہے گا۔ یعنی''قانونی ماں'' اِسی طرح سالیاں ''سسٹر ان لاءز'' سالے''برادران لاءز'' کہلاتے ہیں لیکن اس بارے میں ساری انگریزی خاموش ہے کہ''غیر قانونی'' رشتہ دار کون سے ہوتے ہیں؟
ہمارے ہاں سالی یا سالیاں بھی شادی شدہ ہوں تو ان کے شوہروں کا آپس میں ایک عجیب بلکہ عجیب ترین رشتہ قائم ہو جاتا ہے جسے اُردوئے عام میں ''ہم زلف'' کہا جاتا ہے۔ اس رشتے کی اصطلاح پر غور کرتے جائیں آپ کو یہ کہیں سے بھی مناسب نظر نہیں آئے گا۔
آیئے اس لفظ، اس رشتے ''ہم زلف'' کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔
ایک ہی کلاس میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے والے تمام طالب علم آپس میں ایک دوسرے کے''ہم جماعت'' کہلاتے ہیں۔
ایک ہی منزل کی جانب سفر کرنے والے''ہم سفر'' کہلاتے ہیں
ایک ہی سال یا ایک ہی مہینے میں تولد ہونے والے افراد آپس میں''ہم عمر'' کہلاتے ہیں
ایک ہی محلے میں جڑے ہوئے گھروں میں رہنے والے، کہ ایک کے گھر کا سایہ دوسرے کے گھر کے صحن میں پڑتا ہو، آپس میں ''ہم سایہ'' کہلاتے ہیں (اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے کہ گھر شہر میں ہوں اور صبح یا شام کے وقت ایک دوسرے کے سائے میں بھی آتے ہوں، بصورت دیگر وہ ''ہم سایہ'' کہلانے کے حق دار نہیں ہوتے اگر چہ لوگ کہہ دیتے ہیں)
گاؤں دیہات میں رہائشی مکانات چونکہ ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتے ہیں اس لیے وہاں ''ہم سایہ'' کہنے کی بجائے سب ہی آپس میں ایک دوسرے کے ''گرائیں'' کہلاتے ہیں اور''ہمسایہ'' نہ ہونے کا بدلہ وہ یوں لیتے ہیں کہ ہر اس خاتون کو، جسے وہ بہن کہتے ہیں اسے''ہمشیرہ'' کہتے اور لکھواتے' ہیں۔
ایسے ہی ایک صاحب نے مجھ سے خط لکھوایا اور مکتوب الیھا کو ''ہمشیرہ'' لکھنے پر اصرار کیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس کی پڑوسن ہے، میں نے کہا وہ آپ کی ہمشیرہ نہیں ہے، اسے صرف بہن لکھوائیں کیونکہ ''ہمشیر'' یا ''ہم شیرہ'' اِسی صورت میں ہو سکتے ہیں جب انہوں نے اور آپ نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہو لیکن وہ مصر رہے کہ ہم ہمیشہ سے ہی انہیں اپنی ہمشیرہ کہتے اور پکارتے رہے ہیں، بے شک اس نے ہماری ماں کا دودھ نہیں پیا لیکن وہ ہماری ہمشیرہ ہے پھر انہوں نے تاویل دی کہ گاؤں میں جس گائے کا دودھ وہ استعمال کرتی ہیں، اُسی گائے کا دودھ ہم بھی استعمال کرتے ہیں پھر تو وہ بلکہ تمام گرائیں ہمارے ہمشیر ہوتے ہیں اس طرح تو میری بیوی بھی۔۔۔''
''اوہ! نہیں چچا! ایسے ہوتا تو شہروں میں بھی سارے دوست

دشمن دودھ کی ایک ہی دکان سے دودھ خریدتے ہیں ۔ پھر تو سارے ہی ہمشیر ہوئے اپنے دودھ شریک رشتہ داروں کا حلقہ محدود رکھیں ورنہ بہت مشکل ہوجائے گی'' میں نے دانستہ ڈبے کا دودھ استعمال کرنے والوں کا ذکر گول کردیا ورنہ ''ہمشیروں'' کی تعداد، لاتعداد ہو کر بین الاقوامی ہوسکتی تھی۔

وہ صاحب جن کا میں خط لکھ رہا تھا میری بات سے قطعی متفق نہ ہوئے اور اس پڑوسن کو ہمشیرہ لکھوا کر ہی رہے اگر میں اپنے موقف پر ڈٹا رہتا تو بہت ممکن تھا کہ شہر میں دودھ کی ایک ہی دکان سے یا ایک ہی گوالے سے دودھ خرید کر استعمال کرنے والے تمام شہری ''ہمشیر'' کہلاتے اور یقیناً یہ بات شہریوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے گو کہ شہری بے حد فراخ دل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر ہول آتا ہے کہ ''یہ سب اپنا اپنا حصہ نہ مانگ لیں۔''

ان صاحب نے جو خط لکھوایا تھا وہ بھی ناقابل فراموش ہے، اکثر یاد آجاتا ہے۔

پشاور میں مقیم ان کی 'ہمشیرہ' کے گھر چوری ہوئی تھی اور اسے وہ افسوس کا خط لکھوا رہے تھے۔ نفس مضمون کچھ یوں تھا کہ ''پیاری ہمشیرہ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے گھر چوری ہوئی ہے تمہارا بہت نقصان ہوا ہے، سن کر ہمیں بے حد افسوس ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے ۔۔۔۔۔''

میں نے ان کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا ''چچا! مجھے لکھنے تو دیں۔ یہ لکھ لوں تو آگے بتائیں۔''

''اچھا اچھا! لکھو لکھو!'' وہ بولے اور بڑبڑائے ''دل سے ہم بہت خوش ہیں، ہماری تو دعا ہے تمہارے گھر روز چوری ہو۔۔۔''

میں نے ان کا پہلا جملہ مکمل ہوتے ہی ان کے ''دل کی بات'' بڑبڑاہٹ بھی لکھ دی اور پوچھا ''ہاں چچا! آگے بتائیں!''

''ہاں بچو کیا لکھا ہے؟ ''

''ہم بہت خوش ہیں! ہماری تو دعا ہے تمہارے گھر روز چوری ہو۔۔۔''

''اوہو یہ کیوں لکھ دیا؟ یہ تو میں نے ویسے ہی کہا تھا۔''

''آپ نے کہا تو میں نے لکھ دیا!''

ایک آنکھ

مولانا عبدالمجید سالک ہشاش وبشاش رہنے کے عادی تھے اور جب تک دفتر میں رہتے ،دفتر قہقہہ زار رہتا۔ ان کی تحریروں میں بھی ان کی طبیعت کی طرح شگفتگی ہوتی تھی۔ جب لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے تو سالک نے انوکھے ڈھنگ سے بتایا کہ وہ ایک آنکھ سے محروم ہیں۔ چنانچہ مولانا سالک نے انقلاب کے مزاحیہ کالم ''افکار و حوادث'' میں لکھا ''لارڈ ویول کے وائسرائے مقرر ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھیں گے۔''

''یار یہ بات لکھنے کی نہیں تھی، ٹھیک ہے اس نے ہمارا بہت دل دُکھایا ہے ۔اندر سے تو ہم بہت خوش ہیں لیکن'' پراوَلی'' (برادری) کا تقاضا ہے کہ ہم افسوس کا اظہار کریں ورنہ وہ کمینی سمجھے گی اس کے گھر چوری بھی ہم نے کروائی ہے۔'' وہ بولے ''مٹاؤ اس کو مٹاؤ!''

میں نے کہا ''مٹ نہیں سکتا دوبارہ لکھنا پڑے گا!'' اور صفحہ بدل کر دوبارہ سے پیاری ہمشیرہ لکھنا شروع کردیا۔ جہاں تک حکم ہوا تھا وہاں تک ''نقل'' کی پھر ان سے آگے بتانے کا کہا۔

وہ بولے ''کل ہی تیرا بیٹا کمال ہمارے گھر آیا تھا اس نے بتایا کہ سب لوگ شادی میں گئے ہوئے تھے اور چور ایک کمرے کا تالا توڑ کر سارا سامان لے گئے ہیں۔ بڑا نقصان ہوا ہے۔۔۔ ہم نے سنا تو ہمیں بہت دکھ ہوا ہے۔۔۔'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں نے بایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے انہیں کچھ دیر خاموش رہ کر لکھنے کی مہلت طلب کی۔

وہ چپ تو ہوگئے لیکن ان کی بڑبڑاہٹ ، جاری رہی ،ان کا ''دل بولتا رہا۔''

''پتا نہیں کیسے ڈرپوک چور تھے خالی گھر میں سے بھی ایک ہی کمرے کا سامان لے گئے ہیں۔۔۔ بیوقوف کے بچے۔۔۔ ٹرک لاتے سارا سامان لے جاتے۔۔۔!'' اُنہوں نے جیب سے نسوار کی پڑیا نکالی اور جبڑے میں نسوار بھری میں نے اس موقع سے بھر

پورفائدہ اٹھایا۔

''ہاں چچا! آگے بتائیں۔۔۔''

''کیا لکھا ہے؟'' انہوں نے پوچھا

''بیوقوف کے بچے۔۔۔! ٹرک لاتے، سارا سامان لے جاتے۔۔!'' میں نے ان کی زبان سے نکلا آخری جملہ کہہ سنایا۔

''اوہو! یہ کیوں لکھ دیا؟۔۔۔''

''چچا جو کچھ آپ بولیں گے وہ لکھتا جاؤں گا۔''

''نہیں نہیں۔۔۔اس کو مٹاؤ۔۔۔ یہ نہیں لکھنا تھا۔''

چچا کی نظر بھی کچھ کمزور تھی، موٹے شیشوں سے وہی کچھ دیکھ سکتے تھے جوان کے عین سامنے ہو، ان کے گھر والے ان کی بیٹیاں اس معرکے سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ میں نے کاپی کا تیسرا صفحہ پھاڑا اور کہا'' چاچا مجھے صرف وہ بات بتائیں جو آپ لکھوانا چاہتے ہیں۔''

''کیا بتاؤں! ہماری اس کمینی بہن کے گھر چوری ہوئی ہے، دل میں ہم بہت خوش ہیں لیکن کیا کریں افسوس تو کرنا پڑتا ہے تم خود ہی لکھ دو، میرے تو دل کی باتیں زبان سے نکل رہی ہیں۔''

تیسری بار میں نے خط مکمل کر کے انہیں سنایا۔ اُنہوں نے وہیں پر بس کردی اور بولے'' بس اتنا ہی کافی ہے'' لفافے میں ڈال کر پتا لکھ دو۔''

چار دن بعد ملے تو بولے ''خط دوبارہ لکھنا پڑے گا، جو بات لکھوانا تھی وہ تو رہ ہی گئی۔''

ایک ماں کا دودھ پینے والے اگر رضاعی بہن بھائی کہلاتے ہیں تو ایک ہی گائے ایک ہی بھینس یا ایک ہی بکری کا دودھ پینے والے، دودھ کی ایک ہی دکان سے دودھ خرید کر استعمال کرنے والے ایک ہی کمپنی کا'' ڈبہ پیک'' دودھ استعمال کرنے والے آپس میں ''ہمشیر'' کہلا سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ فیصلہ تو آپ بہتر کر سکتے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ شادی کے بعد معرض وجود میں آنے والے گنجلک رشتے ''ہم زلف'' کو کس خانے میں فٹ کیا جائے؟

ایک مطلب تو اس رشتے کا یہ ہو سکتا ہے کہ دو مرد کسی ایک ہی زلف کے اسیر ہوں تو انہیں ''ہم زلف'' کہتے ہوں گے؟۔۔ جیسا کہ میؔر نے کہا تھا ۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میؔر ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یعنی ہم، تم، امیر، غریب سب ''ہم زلف'' ہیں۔ لیکن نہیں۔۔ انہیں تو ایک دوسرے کا رقیب کہتے ہیں۔ دراصل ہمارے معاشرے میں ایک ایسا شخص! جس کی ساس اور سسر وہی ہیں جو کسی دوسرے (مرد) کے بھی ساس سسر ہیں، تو وہ دونوں مرد آپس میں ایک دوسرے کے ''ہم زلف'' کہلاتے ہیں۔۔۔ یہ کہ! یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مشترکہ ساس کی زلف ہے جسے معیار بنا کر دونوں کو ایک ہی زلف۔۔۔ معاف کیجیے گا ایک ہی رشتے سے باندھ دیا گیا ہے۔

جن (برگر) گھرانوں میں زلفوں کا'' رواج'' نہیں ہے کیا یہ محاورہ ان پر بھی فٹ آتا ہے یا نہیں؟ فرصت ملنے پر اس پر بھی سوچیں گے فی الوقت اِس پر سوچ لیں کہ'' سالی کا شوہر'' تو ''ہم زلف'' کہلاتا ہی ہے پھر سالے کی بیوی کو بھی'' ہم زلف'' کیوں نہیں کہہ سکتے؟ کیونکہ اس کی ساس اور سسر بھی مشترکہ، یعنی وہی ہیں جو دو سالیوں کے ماں اور باپ ہیں۔ اگر نہیں تو پھر ''ہم زلف'' کی اصطلاح تبدیل کرنے پر غور کیا جانا چاہیے، مستقبل میں کسی بچے نے یہ سوال کر لیا تو بہت مشکل پیش آئے گی کیونکہ بہت سے بچے یہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں کہ شاید ہمارے بڑے ہر سوال کا جواب دے دیں گے۔

ایک دادا اپنے پڑپوتے کو ڈانٹتے ہوئے کہہ رہے تھے'' کتے کی دُم سو سال تک بھی نلکی میں رکھی جائے تب بھی سیدھی نہیں ہوتی!'' تو پڑپوتے نے پوچھ لیا'' دادا ابو! اگر کتے کی دم سیدھی ہو بھی جائے تو آپ اس کا کیا کریں گے اور یہ کہ اسے سیدھا کرنے کے لیے سو سال کا انتظار بھی کرنے کی کیا ضرورت ہے اور یہ کہ کیا کتے کی عمر سو سال ہوتی بھی ہے؟''

پڑدادا نے چیں بہ جبیں ہو کر اپنے پوتے سے کہا ''سمجھاؤ اِسے۔۔۔ بہت بولنے لگا ہے!''

شوہر/بیویاں بدلنا

خادم حسین مجاہد

اِس عالم رنگ و بو میں جس کو بھی دیکھا بیوی سے تنگ دیکھا بظاہر کتنے ہی خوش و خرم جوڑے کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی کہ میاں بیوی واقعی ایک دوسے سے خوش ہیں لیکن ذرا قریب ہو کے حقیقت حال دریافت کی تو خوش وخرم شوہر نے بھی یہی خلاصہ بیان کیا کہ اگر دنیا میں مصیبت کی کوئی مجسم شکل ہے تو وہ بیوی ہے اس کے ساتھ ہی یہ طرفہ تماشہ دیکھا کہ ہر کوئی اپنی بیوی کو تو مصیبت اور دوسروں کی بیویوں کو نعمت سمجھتے ہوئے حسد میں بھی مبتلا اور تمنائی ہیں کہ کاش میں اپنی بیوی کو کسی اور سے بدل سکتا۔ یورپ میں اس سوچ کے تحت ایسے کلب بھی قائم ہیں جہاں آپ اپنی بیوی سمیت شریک ہو کر اسے ڈانس ہال میں چھوڑ سکتے ہیں اور کسی بھی دوسرے کی بیوی کے ساتھ جو آپ کو اچھی لگی ہو ڈانس کر سکتے ہیں وہیں ہوٹل کے کمرے میں اس کے ساتھ وقت بھی گزار سکتے ہیں اور یہ بات اسے پسند آ جائے تو اسے اپنے ساتھ بھی لے جا سکتے ہیں آپکی بیوی بھی جس کے ساتھ چاہے جائے جا سکتی ہے ،دوسروں کو بھی آزادی ہے کہ وہ بھی بدل کر جس کی بیوی چاہے لے جا سکتے ہیں، چونکہ انسان فطرتاً تغیر پسند ہے اس کا کاروباری فائدہ کلب والے اٹھاتے ہیں اور اس حد تک سہولت دیتے ہیں کہ آپ کو نئی بیوی پسند نہ ہو تو آپ جتنی مرتبہ چاہیں بیوی بدل سکتے ہیں کوئی قانونی کارروائی نہیں بس آپ کو کلب کی فیس ادا کر کے ممبر شپ لینی ہوگی پھر نہ طلاق کی ضرورت نہ نئے معاہدۂ طلاق کی ضرورت نہ نئے معاہدۂ نکاح کی بس دونوں طرف رضامندی ہونی چاہیئے۔

شاید انہیں اثرات کے تحت یا تغیر پسندی کے جذبات میں حکومت مسالکستان کے پارلیمنٹ کے بعض ممبران نے بل پیش کیا کہ ہر مرد کو زندگی میں کم از کم ایک بار اپنی بیوی کسی بھی دوسرے کی بیوی کے ساتھ باہمی رضامندی کے ساتھ بدلنے کا حق ہونا چاہیئے بعض بزرگ اور کنوارے ممبران نے اس بل کی مخالفت کی لیکن اسمبلی میں شادی شدہ اکثریت میں تھے، اُن سب نے پر زور حمایت کی حتیٰ کہ خواتین ارکان ممبران نے بھی مردوں کا ساتھ دیا۔ شاید وہ بھی اپنے مردوں سے اِتنا ہی تنگ تھیں، چونکہ جمہوریت میں دو گدھوں کی رائے ایک انسان سے بہتر ہوتی ہے اِس لئے اکثریت کی بنیاد پر یہ بل پاس ہی نہیں، لاگو بھی کیا گیا۔ ملاؤں نے بڑا ہنگامہ کیا کہ جب طلاق اور عقد ثانی کا آسان راستہ شرع میں موجود ہے تو اس مغربی بے غیرتی کی کیا ضرورت ہے لیکن چونکہ وہ

اقلیت میں تھے، اکثریت نے انہیں ڈنڈوں سے چپ کرا دیا۔
ہر شہر میں بڑے بڑے پنڈال اور میدان اس مقصد کے لئے آباد ہو گئے جہاں لوگ اپنی ناپسندیدہ بیوی کو چھوڑ کر کسی کی بھی اور کیسی ہی بیوی بدل کر لے جاسکتے تھے کسی نے اپنی بدزبان بیوی کو چھوڑا تو کسی نے لگائی بجھائی کی ماہر بیوی کو۔ کسی نے فیشن پرست بیوی چھوڑی تو کسی نے غیبت کی ماہر کو، کسی نے بدصورت بیوی چھوڑی تو کسی نے کالے رنگ والی کو۔ کسی نے لڑاکا بیوی چھوڑی تو کسی نے حاکمانہ مزاج والی۔ کسی نے پھوہڑ بیوی کو چھوڑا تو کسی نے بدکردار، کسی نے سازشی بیوی کو چھوڑا تو کسی نے جاہل کو، کسی نے ان پڑھ بیوی کو چھوڑا تو کسی نے چیخم دھاڑ کرنے والی۔ کسی نے تعلیم یافتہ بیوی بحثوں سے تنگ آ کے اسے چھوڑا تو کسی نے ملازمت پیشہ بیوی کو اس کی جابرانہ و حاکمانہ طبیعت کے باعث۔ غرض ہر ایک شخص نے اپنی بیوی کو کسی نا کسی ناپسندیدہ خصلت یا خامی کے باعث وہاں چھوڑا اور نہایت خوشی اور آزادی محسوس کی حتیٰ کہ وہ خالی ہاتھ واپس جانے لگے تو حاکم کے کارندوں نے روک لیا کہ بدلے میں کوئی نہ کوئی بیوی ضرور لینی پڑے گی، قانون کا تقاضہ یہی ہے۔ مردوں کی اکثریت آزادی کے بعد دوبارہ غلامی نہ چاہتی تھی مگر ناچار حاکم کے فیصلے سے مجبور ہو گئے اور اور تبادلے کے لئے نئی بیوی کا انتخاب کرنے لگے۔ اب ہوا یوں کہ جس نے کالی بیوی چھوڑی تھی اس نے گوری چٹی بیوی کا انتخاب کیا مگر۔۔۔اس کو گورا رکھنے کے لئے اتنی کریمیں، لوشن اور میک اپ درکار رہا جس نے اس کی آدھی آمدنی کو ٹھکانے لگا دیا۔ جس نے بدصورت بیوی کو چھوڑا اس نے تاک کے نہایت خوبصورت بیوی کا انتخاب کیا لیکن وہ بدکردار نکلی، جس نے ان پڑھ بیوی چھوڑ کر پڑھی لکھی بیوی لی، اُس نے بحث و تکرار سے چند دن میں ہی اس کا ناطقہ بند کر دیا۔ جس نے بدزبان بیوی کو چھوڑا تھا، اُس نے خوش اخلاق عورت کا انتخاب کیا مگر وہ لگائی بجھائی کی ماہر نکلی، جس نے زبان دراز بیوی کو چھوڑ کر کم گو عورت کا انتخاب کیا وہ نہایت سازشی نکلی جس نے سادہ طریقے سے رہنے والی بیوی کو چھوڑ کر فیشنی بیوی کا انتخاب کیا اس کی ساری آمدن اس کے نت نئے فیشنوں کی نذر ہو گئی، جس نے جاہل بیوی چھوڑ کر سکالر ٹائپ بیوی کا انتخاب کیا، اُسے اندرون و بیرون ملک دوروں اور لیکچروں سے ہی فرصت نہ تھی۔ جس نے گھریلو بیوی چھوڑ کر ملازمت پیشہ بیوی کا انتخاب کیا اس نے اس کی گھر اور اس کے گھر والوں کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اُلٹا اُسے اُس کی خدمت کرنا پڑتی، ناشتہ بنا کے دینا پڑتا تا کہ وہ بروقت کام پر جاسکے اور آمدنی کا سلسلہ بند ہی نہ ہو جائے۔۔۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی اسے تو اس کا سر اور ٹانگیں بھی دبانا پڑتیں، جس نے بے اولاد بیوی کو چھوڑا تھا اس نے نو بچوں کی ماں کا انتخاب کیا مگر اُن بچوں نے اسی کا ناک میں دم کر دیا۔ جس نے کثیر العیال بیوی کو چھوڑ کے بانجھ بیوی کا انتخاب کیا، وہ اولاد کی خوشی کو ترسنے لگا اور اسے کثیر العیال بیوی کے بچے یاد آنے لگے۔ جس نے قلم کتاب کی دشمن بیوی کو چھوڑا تھا، اس نے ادب سے دلچسپی رکھنے والی بیوی کا انتخاب کیا مگر وہ ہر وقت کتابوں اور رسالوں میں گھسی رہتی حتیٰ کہ دودھ چولہے پر ابل جاتا، ہانڈی جل جاتی اور چیزیں خراب ہو جاتیں۔

غرض جس نے بھی جس خامی یا خرابی کی وجہ سے پرانی بیوی کو چھوڑا تھا، نئی بیوی میں اس کے بجائے کوئی اور خامی یا خرابی سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات تھی اس لئے مردوں کی اکثریت نئی بیوی سے بیزار ہو کر پرانی بیویوں کو یاد کرنے لگی دوسری طرف بیویاں بھی جو پرانے شوہروں سے تنگ تھیں اور نئے شوہروں کے ساتھ خوشی خوشی آ گئی تھیں، اُنہیں بھی خامیوں کے باوجود نئے شوہروں سے پرانے شوہر بہتر لگنے لگے کیونکہ انہیں جو پرانے شوہروں کی خامیوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھیں، اب اُنہیں احساس ہوا کہ اُنہوں نے خواہ مخواہ ناشکری کر کے پرانے شوہروں کو اس قدر بیزار کر دیا تھا کہ وہ بیویاں بدلنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ کسی عورت کا پرانا مرد اگر کنجوس تھا تو نیا مرد فضول خرچ اور حد سے زیادہ فیاض نکلا جو اپنا پیسہ ادھر ادھر لٹا دیتا تھا۔ اگر کوئی پرانے مرد کی بدصورتی سے تنگ تھی تو نئے مرد کی خوبصورتی سے تنگ آ گئی کہ دوسری عورتیں ہی اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھیں۔ اگر کسی عورت کا شوہر شکی مزاج تھا تو نیا مرد لاپرواہی نکلا۔ اگر پرانا مرد ظالم تھا تو نیا بزدل نکلا۔ اگر پرانا مرد

۱۹۸۴ء میں یوسف بخاری کا نیا مجموعۂ کلام ''دامنِ یوسف'' شائع ہوا تو انہوں نے دیباچہ میں انکشاف کیا کہ جب وہ دہلی میں تھے' وہ ارشاد احمد ارشاد نامی شاعر سے غزلیں لکھوا کر مشاعروں میں نہایت ترنم سے سنایا کرتے تھے۔ بخاری صاحب نے یہ فرمودہ ارشاد غزلوں کے کچھ شعر بھی درج کیے تھے، جو یقیناً بہت اچھے تھے۔ بخاری صاحب نے دیوان مشفق خواجہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اُنہوں نے دیباچہ پڑھا، کلام پر ایک نظر ڈالی اور بولے ''اگر زیرِ نظر مجموعہ میں شامل غزلیں بھی ارشاد احمد ارشاد صاحب سے لکھوائی ہوتیں تو یہ مجموعہ سالِ رواں کا بہترین شعری مجموعہ قرار پاتا۔''

اَن پڑھ ہونے کے باعث بیوی کی بات نہ سمجھ پاتا تو نیا مرد اتنا پڑھا لکھا ملا کہ اسے اس کی باتوں کی سمجھ نہ آتی تھی۔ اگر پرانا مرد نکھٹو ہونے کے باعث ہر وقت گھر میں پڑا رہتا تھا اور وبالِ جان تھا تو نیا مرد اِتنا مصروف ملا کہ اس کے پاس بیوی بچوں کے لئے وقت ہی نہ تھا۔ اگر پرانا مرد غریب ہونے کے باعث اپنی بیوی کی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ تھا تو نیا مرد اتنا امیر تھا کہ وہ بیوی کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اگر کسی عورت کا پرانا مرد زن مرید ہونے کے باعث خفت کا باعث تھا تو نیا مرد عورت ذات کے ہی خلاف تھا اور ہر وقت بیوی میں کیڑے نکالتا رہتا تھا۔ اگر کسی کا پرانا مرد نشئی تھا تو نیا جواری نکلا اور اگر کسی کا پرانا مرد بے روزگار تھا تو نیا مرد سسرال کے مال پر نظر رکھتا تھا اور خود کام کو گناہ سمجھتا تھا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نئے جوڑوں کے مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی شکل سے بھی بیزار ہوگئے اور اُنہیں ایک دوسرے کے ساتھ ایک پل گزارنا بھی دوبھر ہوگیا۔ دراصل پرانے مرد اور عورتیں جیسے بھی تھے ایک دوسرے کے عادی ہو چکے تھے۔ دوسرے اللہ جو جوڑے بناتا ہے اکثر ان کو ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا ظرف بھی دے دیتا ہے۔ بہر حال ایک دن یہ لاوا پھوٹ پڑا اور مختلف شہروں میں جگہ جگہ ہنگامے اور احتجاجی جلوس شروع ہوگئے۔ سبھی کا مطالبہ تھا کہ اس بیہودہ بل کو ختم کیا جائے اور سابقہ شوہروں کو سابقہ بیویاں دی جائیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان مظاہروں کی قیادت وہی ارکان پارلیمنٹ کر رہے تھے جنہوں نے یہ بل پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا۔ پولیس اِن مظاہروں کو کنٹرول نہ کر سکی اور فوج کو بلانا پڑا۔ حتیٰ کہ مظاہرین سے مذاکرات کے بعد اس بل کی واپسی اور تمام رشتوں کو پرانے حالات کے مطابق بحال کرنے کا حکم دے دیا گیا پھر کہیں جا کے حالات نارمل ہوئے۔

پرانے رشتے بحال ہونے پر شوہروں اور بیویوں نے کلمہ شکر ادا کیا اور خوشی خوشی ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھر کو روانہ ہوئے اور ہنسی خوشی رہنے لگے اور ایک دوسرے کی خامیاں جو اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی تھیں، اب اُنہیں نعمت محسوس ہونے لگیں۔ ایک ریسرچ کے مطابق بیویاں بدلنے والے پورے کلبوں کے ممبران کی اکثریت دس دس بار بیویاں اور شوہر بدلنے کے باوجود بالآخر اپنی ہی بیوی اور اپنے ہی شوہر کے ساتھ جانا پسند کرتے ہیں۔ اِسی لئے حکیم سقراط نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دی جائیں تو پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اس وقت خود کو بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔ ایک اور حکیم نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ ''اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو بالآخر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو غنیمت سمجھتا۔ محمد حسین آزاد نے ان حکیموں کے اقوال پر ایک تمثیل (تصوراتی کہانی) بھی لکھی ہے جس میں لوگ اپنی مصیبتیں خوشی خوشی سے ایک دوسرے سے بدلتے ہیں اور بالآخر تنگ آ کر اپنی پرانی مصیبتوں کو واپس لے کر ہی خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ نئی مصیبتوں کے عادی نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں ان کو سہنے کی طاقت ہوتی ہے، کیونکہ اللہ جو مصیبت دیتا ہے وہ انسان کی طاقت کے مطابق ہی دیتا ہے یا اس کے مطابق طاقت دے دیتا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر اِن بڑے لوگوں کے اقوال میں مصیبت کی جگہ ''بیوی'' کر لیا جائے تو ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ذوالقرنین سرور

قصہ ہائے لیپ ٹاپس

حالات کی ضرورت اور کمپنی کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ راوی کو ایک عدد لیپ ٹاپ سے نواز دینا چاہیے۔ یہ لیپ ٹاپ لے کر بھاگے گا نہیں۔ پورے گاؤں میں اعلان کروا دیا کہ کمپنی نے ہم پر اعتماد کی انتہا کر دی ہے۔ اب مجھے باقاعدہ ایک لیپ ٹاپ میسر ہوگا۔ ایک دو احباب نے حیرت سے پوچھا کہ تمہارے پاس تو ذاتی بھی ہے۔ میں نے تفاخر سے کہا، ''اب دفتری بھی ہوگا۔'' چند ایک نے مایوس کرنے یا نیچا دکھانے کی غرض سے کہا کہ ان کے پاس تو پتا نہیں کتنے سالوں سے دفتری لیپ ٹاپ ہے۔ لیکن میں ایسی بے دست و پا کو کب خاطر میں لانے والا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ دن آیا۔ مجھے لیپ ٹاپ دے دیا گیا۔ ایک بدہیت سا بیگ میری میز تک لایا گیا۔ ایسا ایک بیگ ہمارے گھر میں بھی تھا۔ امی اس میں گھر بھر کے جوتے رکھا کرتی تھیں کہ مٹی سے بچے رہیں گے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے استفسار کیا۔

''لیپ ٹاپ ہے۔ اس کی بیٹری بہت اچھی ہے۔'' لانے والے نے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

لیپ ٹاپ دیکھا۔ یہ والا ماڈل میں نے زندگی میں پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ کتنا پرانا ہے۔ میں نے دوبارہ سوال کیا۔ ''زیادہ سے زیادہ سات سال۔'' جواب ملا۔

''ہم۔۔۔۔ سات سو بھی ہوتے تو ہم نے کیا کر لینا تھا۔'' میں نے ایک گہرا سانس لیا۔

چلایا۔ تو واقعی چلتا تھا۔ کچھ دن استعمال کرنے پر پتا چلا کہ واقعی صرف بیٹری بہتر ہے۔ کبھی سکرین چلتے چلتے بند ہو جاتی تو کبھی لیپ ٹاپ خود بخود ری سٹارٹ ہو جاتا۔ کی بورڈ کے ایک دو بٹن چھوڑ کر باقی سارے کام کرتے تھے۔ کچھ زور سے چلتے اور کچھ نرمی کی زبان سمجھتے تھے۔ مجموعی طور پر ایک بہترین چیز تھی۔ میں اس کو آن کر کے سامنے تو رکھ لیتا۔ لیکن کام اپنے دوسرے ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر پر ہی کیا کرتا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ عجیب و غریب آوازیں بھی نکالا کرتا تھا۔ اٹھانے پر برا مناتا اور کھڑ کھڑ کر کے اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتا۔ سو جاتا تو خراٹے لیتا۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ہر بار سونے کے بعد وہ اٹھ بھی جائے یعنی گہری نیند لینے کا عادی تھا۔ اکثر سکرین تاریک ہی رہتی تھی۔ ایسی صورتوں میں پاور کا بٹن دبا کر ایک ری سٹارٹ دینا پڑتا۔ رفتہ رفتہ میرا ہاتھ سیدھا ہو گیا۔ اب میں تاریک سکرین پر ہی ری سٹارٹ کی کمانڈ دے دیا کرتا تھا۔

ایک دن اس کے اندر سے کچھ عجیب وغریب آوازیں سنائی دیں۔ ایسی آوازیں لڑائی جھگڑے والے گھروں سے عموماً آیا کرتی ہیں۔ لیکن کسی کمپیوٹر سے ایسی آوازیں سننے کا میرا پہلا ہی تجربہ تھا۔ اس کے بعد سب کچھ خاموش ہوگیا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ آوازیں دیں۔ لیکن لگتا تھا اس نے اس فانی دنیا سے فنا کا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ متعلقہ شعبے تک لے گیا۔ بہت دیر تک آئی سی یو میں رہا۔ پھر ایک نے آپریشن تھیٹر سے باہر آکر افسردہ سی نظر مجھ پر ڈالی۔ میں نے اس کے چہرے پر لکھی مایوسی پڑھ لی تھی۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے تمام سوالوں کا جواب اس کے چہرے پر تحریر تھا۔ دل بجھ گیا۔ اس لیپ ٹاپ سے مجھے انسیت سی ہو چلی تھی۔

''اس میں موجود ڈیٹا کا کیا ہوگا؟'' میں نے سوچوں کا رخ بدلنے کو بجھے دل سے سوال کیا۔

''وہ آپ کو نئے والے میں منتقل کر دیا جائے گا۔'' ایک سرد جواب ملا۔

یہی ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا اصول ہے۔ پرانی چیزیں پھینک دی جاتی ہیں۔ اور ان کی جگہ نئی لے لیتی ہیں۔ میں دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے لگا۔ قبل اس کے میں فلسفی ہوجاتا۔ اور قنوطیت کی ساری حدیں پھلانگ جاتا۔

متعلقہ شعبے کے فرد نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ ''یہی چاہتے تھے ناتم! ایک نیا لیپ ٹاپ مل جائے۔ اس سے جان چھوٹ جائے۔ سمجھو جان چھوٹ گئی۔ اب جاؤ اور نئے کے لئے درخواست دے دو۔''

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس شعبے سے نکل آیا۔ بوجھل دل سے یہ خبر اپنے افسران کو سنائی۔ اور دل کو تسلیاں دیتا ہوا واپس چلا آیا۔

ذرائع سے معلوم ہوا کہ نیا لیپ ٹاپ چند دن میں دے دیا جائے گا۔ دو دن بعد ہارڈ ویئر کے شعبے سے ایک لڑکا سیاہ رنگ کا شاپر سا اٹھائے ہمارے میز تک آ پہنچا۔ قریب آنے پر پتا چلا کہ یہ بیگ نما کوئی چیز ہے۔ غور کرنے پر غلط فہمی دور ہوگئی۔ یہ ایک بیگ ہی تھا۔ ہم نے ایک نظر بیگ پر ڈالی۔ ایک دریدہ دہن بیگ۔ جس کی ایک سائیڈ لقوہ زدہ لگ رہی تھی۔ لانے والا کانوں سے پکڑ کر اس کا منہ سیدھا اور بند کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قبل اس کے بیگ کی دریدہ دہنی دیکھ کر ہم منہ پھٹ اور گستاخ ہونے کا الزام لگاتے، ٹوٹی زپ دیکھ کر اس کی معذوری سمجھ میں آ گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' ہم نے کھلے دہن سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''لیپ ٹاپ۔'' مختصر جواب ملا۔

''کس کا ہے؟'' ہم نے دوبارہ سوال کیا۔

''اب تمہارا ہے۔'' دوبارہ وہی جواب ملا۔

''پہلے کس کے پاس تھا؟'' ہم نے پھر پوچھا۔

''اس بات کو چھوڑو۔ بہت سے لوگوں کے پاس رہا ہے۔'' اُسی روکھے انداز میں دوبارہ جواب دیا گیا۔

ہم خاموش ہوگئے۔ خود کو احساس ہوچلا تھا کہ ہمارے سوالات بکرا خریدنے والے کے سوالات جیسے ہوگئے ہیں۔

ہم نے لیپ ٹاپ کو دیکھے بغیر کہا ''اس کو اٹھائیں گے کیسے۔ دہن بندی کا کچھ سبب ہوسکتا ہے؟''

''فی الوقت یہی بیگ ہے۔ گزارہ کرو۔'' ٹکا سا جواب ملا۔

''سوئی دھاگہ مل جائے گا؟'' ہم شاید ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھے۔

اب آنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی ''یہ آئی ٹی فرم ہے۔ درزی کی دکان نہیں۔''

ہم نے ہنکارہ بھرا۔ اور لیپ ٹاپ کو باہر نکال لیا۔

کئی ایک جگہ زخموں کے گھاؤ تھے۔ کچھ پرانے مالکین کے دیے تحفے بھی تھے جو اس نے اپنے ماتھے پر تمغوں کی صورت سجا رکھے تھے۔ پاور کا بٹن دبانے پر پہلی بار ہی سکرین روشن ہوگئی۔ دل خوشی سے بھر گیا۔ ہم نے کی بورڈ کی ساری اکائیاں دبا دبا کر دیکھیں۔ سب ہی چلتی تھیں۔ ہم نے اس کے بنائے جانے کی تفصیلات دیکھیں تو اس کو اپنے پرانے والے سے ایک سال کم عمر پایا۔ ابھی جانچ پڑتال میں مصروف تھے کہ اس کا سی ڈی روم خود ہی

باہر آ گیا۔ ہم نے سی ڈی روم بند کرنے کی بجائے اس لڑکے کو دیکھا جو ابھی تک ہمارے پاس کھڑا تھا۔

''یہ نئی سہولت ہے۔ سی ڈی روم کھولنا نہیں پڑے گا۔'' اس نے ہماری نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں سی ڈی روم استعمال نہیں کرتا۔'' ہم نے اپنے آپ کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس کو بند کر دو۔'' اس نے بیاعتنائی سے جواب دیا۔

گھر جا کر چلایا تو نہ چلا۔ بہت کوشش کی۔ لیکن کوئی بات نہ بنی۔ ایسے ہی بیٹری باہر نکالی تو دیکھا کہ اندر ایک پٹی سے ابھری ہے۔ اس کو دبایا تو وہ کھٹک کی آواز کے ساتھ ہی نیچے ہو گئی۔ اب بیٹری لگا کر چلایا تو چل پڑا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اتنا گرم ہو گیا کہ سکرین پر درجہ حرارت کا اطلاع نامہ کھل گیا۔ اور ساتھ ہی خود بخود بند بھی ہو گیا۔ یہ سہولت مجھے پسند آئی کہ گرم ہو جائے تو خود بخود بند ہو جائے۔ ابھی اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھنے جا رہا تھا کہ کوئی وزنی چیز پاؤں پر گرنے سے چیخ اٹھا۔ بیٹری زمین پر پڑی منہ چڑا رہی تھی۔ اس کا لاک خراب تھا۔ اٹھا کر چلو تو نیچے گر جاتی تھی۔ اب روز کا تماشا ہو گیا۔ بیٹری نکالو۔ پٹی دباؤ۔ پھر چلاؤ۔ سکرین کی ہر زاویے پر ریزولیشن (Resolution) مختلف تھی۔ کچھ جگہ بالکل سفید ہو جاتی تھی۔ اور کچھ جگہ پر کچھ رنگ کم اور کچھ زیادہ ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس پر بھی ہاتھ سیدھا ہو گیا۔ اب سکرین کھولتے ہی خوب بخود اس زاویے پر ہاتھ رک جاتے تھے۔ جس پر بہترین نظر آتا تھا۔ گرمی کا حل ایک عدد پنکھا لگا کر دور کر لیا گیا۔ سی ڈی روم والا معاملہ میرے لئے کھیل سا بن گیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ اوسطاً میں ہر بیس سیکنڈ بعد خود ہی سی ڈی روم پر ہاتھ مار دیا کرتا تھا۔ چاہے کھلا ہو یا نہ۔ پہلے میں صرف اس کا فین پیڈ چھوڑ کر جانے لگا۔ پھر چارجر اور ماؤس بھی دفتر پڑا رہنے لگا۔ بیگ تو پہلے دن سے ہی میں ذاتی استعمال کر رہا تھا۔ دفتری بیگ وہی پڑا تھا۔ اور آخر آخر یہ صورتحال ہو گئی کہ لیپ ٹاپ بھی وہیں پڑا رہنے لگا۔ میں البتہ گھر آ جایا کرتا تھا۔ ایک دن ایک عمر اور عہدے میں بڑے ساتھی نے روک لیا ''یہ اثاری تمہاری ہے؟''

''اثاری؟'' ہم نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں یہ!'' اس نے میرے شاندار لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے گستاخ جملوں سے اس بیجان چیز کو جو ٹھیس پہنچائی تھی مجھے سر تا پا سلگا گئی تھی۔ درجۂ حرارت بلند ہونے پر ایک لمحہ مجھے خود پر بھی لیپ ٹاپ ہونے کا گمان گزرا۔

''یہ ایک لیپ ٹاپ ہے، اثاری نہیں۔'' ہم نے غصے سے کہا۔

''اوہ اچھا! معذرت۔ میں سمجھا لیپ ٹاپ ایسے ہوتے ہیں۔'' اُس نے اپنے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نیا نو دن۔ پرانا سو دن۔'' ہم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''دن اور سال کا فرق سمجھتے ہو؟'' اُس نے بھی زہریلی مسکراہٹ سے وار کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ بالکل اُس امیدوار کی طرح جس کو اپنی ہار کا یقین ہو جائے تو جیتنے والے کے حق میں نتائج سے پہلے ہی بیٹھ جاتا ہے۔

''خیر آپ کو کیا مسئلہ ہے اس سے؟'' ہم نے اس کے سوال کی وجہ جاننے کی کوشش کرنے کی کوشش کی۔

''یہ یہاں کیوں چھوڑ جاتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''مرضی ہماری!!'' ہم نے ابرو اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''تم اس کو یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ یہ کمپنی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس کو تمہیں ساتھ گھر لے جانا ہوگا اور اگلے دن لانا بھی ہوگا کہ یہی اصول برائے شودران ہے۔'' اس نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس کی اس بات سے بے اختیار ہمیں آغا گل کے افسانے کی ایک سطر یاد آ گئی۔ ''شاب جی! آپ بھی شودر ہیں کیا مسلمانوں کے؟'' اور ایک مسکراہٹ ہمارے چہرے پر پھیل گئی۔

''مسکرا کیوں رہے ہو۔'' اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

ہم ہنس دیے ہم چپ رہے، اب ہم اس کو کیا بتاتے، ہمارے دل پر کیا بیت گئی ہے۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گو حسنِ دلفریب و دل آراء غضب کا تھا
تھپڑ پڑا تو وہ بھی کرارا غضب کا تھا

تھی سر کی چوٹ زیادہ ہی کچھ دل کی چوٹ سے
دونوں طرف سے عشق نے مارا غضب کا تھا

انجام کو نہ پہنچیں تھیں پچیس منگنیاں
وہ جو کبیر سِن تھا کنوارہ غضب کا تھا

جمہوریت کا کیا کرے کوئی جہاں عوام
دیتے ہوں اس پہ ووٹ کہ نعرہ غضب کا تھا

چڑیاں یہ سوچتی تھیں کہ انڈے یہیں پہ دیں
جُوڑا جو اس نے سر پہ سنوارا غضب کا تھا

رکنا پڑا ہر ایک کو الفت کے چوک میں
چشمِ فسوں کا اُس کی اشارہ غضب کا تھا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

لبھاتا ہے جو مجھے گدگدا کے دل میرا
وہی رُلاتا بھی ہے آزما کے دل میرا
جو کام کرتے تھے عاشق کیا وہ سرجن نے
کہ وقتِ نزع وہ بھاگا چرا کے دل میرا
تمام خواہشیں میری انڈیل لیں دل میں
لیا رقیب نے بدلا لگا کے دل میرا
کہا یہ مرغے نے تو بانگ دے گا ککڑوں کوں
ڈکار مار رہا ہے جو کھا کے دل میرا
کرے گا تو جو ''پلوشن'' تو خیر تیری نہیں
دھواں چھپائے گا کیسے جلا کے دل میرا
یہ دل لگی مجھے اچھی نہیں لگی کہ انہیں
لگایا دل سے تو بھاگے لگا کے دل میرا
یہ میل اچھا نہیں رند اور زاھد کا
''ٹرانسپلانٹ'' نہ کر پارسا کے دل میرا
جو دل دھڑکتا ہے تو یاد اس کی آتی ہے
کہاں پہ بھاگ گیا وہ پھنسا کے دل میرا
ادا پسند مجھے آئی رہزنِ جاں کی
کہ اس نے لوٹ لیا مسکرا کے دل میرا
میں اپنا قلب و جگر ڈھونڈتا ہوں اب مظہر
کہاں گیا ہے یہ سرجن اڑا کے دل میرا

ڈاکٹر عزیز فیصل

رات گئے کی کال بھولی نہیں فی الحال
کوچے میں ''پش اپس'' اپنا آپ سنبھال
جان جگر کی نذر اے ٹی ایم کا مال
راہ رقیب پہ چند تو کنٹینر ڈال
اربوں کے مقروض خود کو کہیں خوش حال
حال کے گردے فیل ''جانِ استقبال''
جگری پکے یار میں اور میری دال
مصرع خون آ لود شعر کا بوتھا لال
ماتحتوں میں پھوٹ باس کی سانس بحال
عین اپاہج لوگ کھیلتے ہیں فٹ بال
مرلے بھر کی سانس قبر ہے چار کنال
جیسے زنانہ روپ مردوں کی اَشکال
لیکچر کے دوران مس کو کریں ''مس کال''
لیلیٰ لکڑ چور دشت میں قیس کی ٹال
کامل ''سیدھا'' پیر الٹی مرید کی چال
پاپ ''سماع'' کے فین شہر کے سب قوال
یہ ہے ضروری کام اس کو کل پہ ٹال

فیصل شیور چھوڑ!
دیسی مرغی پال

ڈاکٹر عزیز فیصل

کیا کہا؟؟ کیا کہا؟؟ کیا کہا؟؟
پھر وہ ابا بنا؟؟ کیا کہا؟؟

قیمتاً دے رہا ہے وکیل؟
مفت کا مشورہ، کیا کہا؟

آستیں میں ترے چھپ گیا
اک عدد اژدہا؟ کیا کہا؟

پاس رکھتا ہے فوٹو سدا
مولوی ہیر کا؟؟؟ کیا کہا؟؟؟

مل بھی سکتی ہے مسکین کو
ٹارزن اہلیہ ؟ کیا کہا؟؟؟

نام دے آئی پولیس کو
کیوں، بشیراں، مرا؟ کیا کہا؟؟

عرفانؔ قادر

کس قدر مظلوم ہر شامت کا مارا اونٹ ہے
جو اس آفت سے بچا ہے، وہ کنوارا اونٹ ہے

گائے کہلاتا ہے ہر اک سیدھا سادا آدمی
جو ذرا قد میں بڑا ہے وہ بیچارا اونٹ ہے

اُڑ رہے ہیں شہر کے باسی جہازوں میں مگر
ریگزاروں کے مکینوں کا سہارا اونٹ ہے

بھائیوں میں جب ہوا جھگڑا تو ہر شے بٹ گئی
یہ ہمارا اونٹ ہے اور وہ تمھارا اونٹ ہے

خوبصورت یوں تو کھوتے کا بھی بچّہ ہے مگر
اونٹ کا بچّہ بہت ہی پیارا پیارا اونٹ ہے

جھانکتا ہے کون سا بے شرم اُس دیوار سے؟
مُسکرا کر خود ڈھٹائی سے پکارا، "اونٹ ہے"

جب گئی میکے تو کافی بوجھ ہلکا ہو گیا
اس طرح لگنے لگا، سر سے اُتارا اونٹ ہے

اونٹنی جیسی کسی "ڈی پی" پہ ہے وہ مر مٹا
فیس بک پر دل کو اپنے، آج ہارا اونٹ ہے

شیخ جی کی بیویاں ہیں چار، شرعاً ٹھیک ہی
ہاں مگر اُس شیخ کی آنکھوں کا تارا اونٹ ہے

آپ کو سُننی پڑی جو بے دلی سے یہ غزل
اس کا ذمّہ دار بھی سارے کا سارا اونٹ ہے

عرفانؔ قادر

تختے بھی، تختیاں بھی، ہیں بنتے اِنہیں سے تخت
اشعار میں بھی "پیڑ"، "شجر" ہیں، یہی درخت

کرتوت جیسے تیرے جوانی میں تھے میاں
ویسے ہے آج کر رہا تیرے جگر کا لخت

ایسا بھی عقدِ ثانی میں ہوتا ہے بالعموم
اطفال سات آٹھ ہے لاتی وہ نیک بخت

اُن کو پتا نہیں تھا کہ پی آئی اے ہے یہ
احباب باندھ لائے ہیں یونہی سفر کا رخت

ان باکس میں ہے نار نے بھیجا مجھے پیام
"کینڈی کرش" کی گیم ہے فٹ بال سے بھی سخت

میٹھی ہے بانسری کی لے، رانجھے میاں مگر
بھینسوں کے ساتھ رہ کے ہے لہجہ ترا کرخت

مس کال کا جواب دیا کر ضرور ہی
ہم کیا کریں، اگر ترے ابا ہیں سخت شخت

عرفاؔن! تو نے ویسے غزل عام سی کہی
دنیائے شاعری میں مگر پے گیا ہے وخت

ہاشم علی خان ہمدمؔ

نگر نگر کے پرندوں کا آشیانہ ہے
یہ فیس بک کا زمانہ عجب زمانہ ہے

دبی دبی ہے یہاں پر میاں کی آزادی
یہ ازدواجی تعلق بھی آمرانہ ہے

دیا ہے شیخ نے سکہ یہ کہہ کے بچے کو
یہ تیری اشک فشانی کا آبیانہ ہے

گلی میں شیر ہے گھر میں غریب شوہر ہے
وہ جس کا بیوی کے ہاتھوں میں آب و دانہ ہے

جنونیوں کے مریدو ! ہمارے ساتھ چلو
سنا ہے دشت میں مجنوں کا آستانہ ہے

تمام ریٹ ترے ہیں وطن کے پٹواری
ترے ہی ہاتھ میں منڈی کا باردانہ ہے

کہاں سے آئی ہے دولت میاں بتاؤ تو
یہ مال و زر ہے کہاں کا جو غائبانہ ہے

بتا رہا ہے زمانے کو راز محنت کا
تمام زر تری محنت کا شاخسانہ ہے

اسے خریدتے دیکھا ہے دودھ کا ڈبہ
ضرور یہ کسی چوتھی کا شاخسانہ ہے

اٹھائے پھرتے ہیں گردن میں آدمی سریہ
تمام شہر ہی لوہے کا کارخانہ ہے

میں نازنینوں کے دھرنے سے ہو کے آیا ہوں
سو آج میری طبیعت بھی وحشیانہ ہے

تمام شہر کے چوزوں کا باپ ہے لیکن
ہمارے مرغے کا انداز عاجزانہ ہے

ہمارے بیچ محبت ہے نارمل ہمدمؔ
ہمارے بیچ ذرا عشق درمیانہ ہے

ہاشم علی خان ہمدمؔ

سیلفیاں کھینچ کے یوں سب کو دکھانا تیرا
مار ڈالے نہ تجھے شوق یگانہ تیرا

تو نے لوٹی ہوئی دولت کو چھپا رکھا ہے
ہے کوئی ڈھونڈ کے لائے جو خزانہ تیرا

میں نے پھر ووٹ گنوانے کی سزا پائی ہے
بھول سکتا ہے کہاں مجھ کو زمانہ تیرا

تیرا یہ مال زمانے سے کہاں چھپتا ہے
میڈیا سب کو دکھاتا ہے فسانہ تیرا

پاک دھرتی ! ترے نوٹوں پہ مری جاتی ہے
قوم گاتی ہے مگر پھر بھی ترانہ تیرا

تجھ کو تحفے میں جو دیتا ہے کروڑوں ڈالر
پسر اصغر ہے میاں کتنا سیانا تیرا

رانگ نمبر تھا یا مس کال کسی نے دی ہے
کتنا اچھا ہے مری جان بہانہ تیرا

میرے ممنون تجھے کیسے ہنسائے کوئی
باچھیں کھلتی ہیں نہ کھلتا ہے دہانہ تیرا

مجھ کو برگر نہ سموسے کی طلب ہے لیکن
آج کھانا ہے ترے ساتھ یہ کھانا تیرا

میں تو جلسے میں یہی سننے چلا آتا ہوں
تیری تقریر سے اچھا ہے یہ گانا تیرا

ڈھونڈ لیتا ہوں ترے خاص کمنٹ سے تجھ کو
ہر حسینہ کا سٹیٹس ہے ٹھکانہ تیرا

کون کہتا ہے سیاست میں تو مرجائے گا
دیکھ مدت سے یہاں زندہ ہے نانا تیرا

تو نے رستے میں ہی دھرنے کو سبو تاژ کیا
”ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا“

خوش مزاجی کا زمانہ نہیں بدلا ہمدمؔ
ہر زمانے کو میسر ہے زمانہ تیرا

نوید صدیقی

پانامہ کا جال بچھایا جا سکتا ہے
پی ایم کو یوں گھر بھجوایا جاسکتا ہے
کاروبار میں چل سکتا ہے سب کالا دھن
ملک سے باہر بھی سرمایا جا سکتا ہے
گرلز کے کالج میں عاشق کا داخلہ مشکل
داڑھی مونچھ کا کر کے صفایا ، جا سکتا ہے
ایک ہی بیوی سے بھی ہوسکتا ہے گزارا
مجبوری کو دھکا "لایا" جا سکتا ہے
رشوت خور کو "باعزت ریٹائر" کر کے
اس کا رتبہ اور بڑھایا جا سکتا ہے
شادی ہال میں اپنوں سے پردہ ہے لیکن
مووی میکر ہو کے پرایا جاسکتا ہے
ایک بڑے ہوٹل کے شیف سے ہم نے پوچھا
آلو کو آلو میں پکایا جا سکتا ہے؟
بھیڑ میں یہ موقع مت ہاتھ سے جانے دینا
گنجے سر پر ہاتھ جمایا جا سکتا ہے
پاکستان کا جو حاکم ہے اسے خبر ہے
کیسے کتنا مال بنایا جا سکتا ہے
ٹی وی اینکر کو معلوم ہے اس کا طریقہ
پیالی میں طوفان اٹھایا جا سکتا ہے
خود پر گزری تو یہ بات کھلی ہے ہم پر
چھوڑ کے مشکل میں ماں جایا ، جا سکتا ہے
کبھی کبھی لفڑا کر کے اپنی بیگم سے
بن پیسے کے سر منڈھوایا جا سکتا ہے
ساٹھ پہ ہی موقوف نہیں کچھ کارِ حماقت
عمر کوئی بھی ہو،سٹھیایا جا سکتا ہے
بھینسوں نے بتلایا دیواروں سے رگڑ کر
اپنی پشت کو یوں کھجلایا جا سکتا ہے

نوید صدیقی

ایف بی پہ اس کی پکس کو چسپاں کیے ہوئے
''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے''

وہ کھل کھلا کے کرتے ہیں بے وزن شاعری
اہلِ سخن میں خود کو سخن داں کیے ہوئے

چینل ہی دیکھتے ہیں نہ پڑھتے ہیں کوئی نیوز
جیتے ہیں لوگ زیست کو آساں کیے ہوئے

رشوت کے ساتھ ساتھ وہ کھاتے ہیں سود بھی
سنت کو اپنے چہرے کا عنواں کیے ہوئے

کھبے پہ کنڈا ڈال کے صارف ہے مطمئن
دن کو بھی ہے گلی میں چراغاں کیے ہوئے

عابد محمود عابدؔ

ہر زباں پر ہے نام سیلفی کا
نوجواں ہے غلام سیلفی کا

خوب صورت بگاڑ دیتی ہے
دیکھیے انتقام سیلفی کا

آپ کے ساتھ بنوالوں لیکن
آپ لیتے ہیں دام سیلفی کا

بیٹھ کر میرے ساتھ اے جاناں!
پیجیے ایک جام سیلفی کا

پورا منہ کھول کر بناؤ تم
چرچا ہوگا مدام سیلفی کا

آپ کے فیل ہونے کے پیچھے
ہاتھ ہوگا تمام سیلفی کا

چاند چہروں کے ساتھ باغوں میں
کیجیے انتظام سیلفی کا

آپ لاکھوں بناتے رہتے ہیں
وقت سارا حرام سیلفی کا

ہر نکمّے کو آتا ہے عابدؔ!
بس یہی ایک کام سیلفی کا

عابد محمود عابدؔ

بصیرت میں حماقت کی شراکت ہو ہی جاتی ہے
جوانی میں میاں دل کی تجارت ہو ہی جاتی ہے

کسی کمرہ جماعت میں کسی شادی کی دعوت میں
چہل قدمی کی عادت میں محبت ہو ہی جاتی ہے

جسے ماں بھی دُلاری ہو، جسے بیوی بھی پیاری ہو
سیاسندان ہے اُس سے سیاست ہو ہی جاتی ہے

قیادت میں اگر بے پیندے کے لوٹے نہ ہوں پیارے
تو پورے پانچ سالوں تک حکومت ہو ہی جاتی ہے

کنوارے بھائیوں میں بعد از شادی مہینوں میں
یہی دیکھا سُنا ہم نے، عداوت ہو ہی جاتی ہے

جو سرکاری ملازم بن گئے آہستہ آہستہ
اُنہیں پھر کام چوری کی بھی عادت ہو ہی جاتی ہے

سپیکر بند ہوں، نعرے نہ ہوں، مووی نہ ہو یارو!
کہاں ایسے میں مُلّا سے خطابت ہو ہی جاتی ہے

وکالت سے، عدالت سے، کچہری کی ذلالت سے
جو ابا جان چاہیں تو ضمانت ہو ہی جاتی ہے

ضروری ہے گلابوں کا کوئی گلدستہ ہاتھوں میں
گلِ گوبھی سے بھی عابدؔ عیادت ہو ہی جاتی ہے

تنویر پھولؔ

ہنستے رہنا اپنی عادت ہو گئی
غم کی دیوی جل کے غارت ہوگئی

بے تحاشا چپس ہم کھانے لگے
اِس لئے آلو کی قلّت ہو گئی

اُس کا ابا نائی تھا اے دوستو!
مفت میں اپنی حجامت ہو گئی

یار اپنے ہیں سدا تتلا رہے
ہنس پڑے، کہنے لگے "حت" ہوگئی

کانا پھوسی کی رقیبوں نے تو پھر
ہم نے دیکھا، رائی پربت ہوگئی

سج گیا اب ہے وڈیرے کا حرم
اِس میں داخل "بی سیاست" ہو گئی

فیل ہوتا ہے ریاضی میں ریاض
کہتا ہے، کافی ریاضت ہو گئی

دیکھ لیلیٰ! تو ہے محمل میں مگر
کیا میاں مجنوں کی حالت ہوگئی!

پھولؔ جی! کانٹوں سے مت گھبرایئے
دیکھئے اِن سے حفاظت ہو گئی

تنویر پھولؔ

فوراً کراچی چھوڑ کے سکھر چلا گیا
آیا تھا یار ملنے، وہ لڑ کر چلا گیا

گزری ہے ساری رات کھجاتے بدن ہمیں
ہم کو چبھو کے سوئی وہ مچھر چلا گیا

کہتا ہے تانگے والا، یہ سردی کی رات ہے
ملتی نہیں سواری ہے "سب گھر چلا گیا"

بھاگا تھا چڑیا گھر سے، بڑے کرب میں وہ تھا
آیا مداری پاس تو بندر چلا گیا

پیٹو کا پیٹ بھر نہ سکا شادی ہال میں
کھانا ہُوا جب اُس کا واں دوبھر، چلا گیا

بیٹھے تھے انتظار میں، تعویز ہم کو دے
لیکن وہ پیر دل پہ ہی خنجر چلا گیا

عاشق کو دن میں آئے نظر تارے بے شمار
جوتے لگا کے سر پہ وہ دلبر چلا گیا

ڈرپوک تھا بہت وہ، اُسے چھیڑتے تھے سب
بیوی ملی چڑیل تو ہر ڈر چلا گیا

دیکھی جھلک تھی پھولؔ نے اُس روسیاہ کی
بھونرا اُڑا جو باغ سے، فرفر چلا گیا

گوہر رحمان گہرؔ مردانوی

بس تگ و دو میں یونہی عمر کٹا لی اف اف
کچھ بنایا بھی نہیں جیب بھی خالی اف اف

جبکہ انجام کا سوچا نہیں اب بھگتوں گا
زندگی بن گئی بسکہ مری گالی اف اف

پہلے شوہر بنا پھر باپ ہوا اب نانا
ریش میں آئی سفیدی ہے وبالی اف اف

بن گیا بیل جو کولہوں کا بتا کس کے لیے
بوجھ بر زندگی کھب خوب نکالی اف اف

ساٹھ سالہ پہ سبکدوش ہوا تو قلاش
آس تدریس کی پینشن سے لگالی اف اف

اِتنا معلوم نہیں اب ہوں کسی کھاتے میں
یہ تو معلوم ہو بینگن ہوں کہ تھالی اف اف

در بدر ٹھوکریں کھائی تھیں بہ خاطر اولاد
اُن کا کھاتا ہوں تو اب جیسے سوالی اف اف

اب تلک کوئی بھی خوش ہو نہ سکا ہے گوہرؔ
بیٹا بیٹی ہو کہ بیوی ہے کہ (سالی) اف اف

نورؔ جمشید پوری

رہ رہ کے یوں چلاؤ نہ نظروں کے تیر کو
دل ہو چکا ہے زخمی کرو نہ شریر کو

کرنی تھی کامیاب جو ریلی وزیر کی
چمچوں نے لو جٹا لیا جم غفیر کو

دیتے نہیں جو روٹی کا ٹکڑا غریب کو
لے کر وہ قرض دیتے ہیں دعوت امیر کو

چڑھتا ہے جب کسی پہ نشہ اقتدار کا
ہنس کر وہ بیچ دیتا ہے اپنے ضمیر کو

اسمارٹ، سوٹ بوٹ میں ملٹی پلکس میں
حیرت زدہ تھی دیکھ کے کل کے فقیر کو

افسردہ دل یہ نورؔ کا ہوتا ہے، جب کبھی
ہنستا ہے کوئی دیکھ سخن کے اسیر کو

شاہین فصیح ربانی

سگریٹ کی ہو رہی تھی بڑی زور کی طلب
ٹوٹا زمین پر سے اٹھانا پڑا ہمیں

کچھ دُور ایک پھول نے جلوہ نمائی کی
پتھر کو راستے سے ہٹانا پڑا ہمیں

وہ چھت پہ تھی، ہوائیں بھی کچھ سازگار تھیں
شوخی میں پھر پتنگ اُڑانا پڑا ہمیں

دیتے ہیں وہ جواب ہزاروں گنا بڑا
مارا تھا ہم نے بیر، دوھانہ پڑا ہمیں

اشعار کی ہمارے بہت مانگ بڑھ گئی
کچھ اس لیے بھی دام بڑھانا پڑا ہمیں

پلّے پڑی نہ ایک ذرا بات جب فصیح
بے اختیار سر کو کھجانا پڑا ہمیں

عتیق الرحمٰن صفی

کسی شخص پر میں نثار تھا مگر اب نہیں
مجھے عاشقی کا بخار تھا مگر اب نہیں

وہ جو بھوت بن کے چمٹ گیا مری ذات کو
مرے ذہن پر بھی سوار تھا مگر اب نہیں

وہ جو روز کہتا تھا لے چلو مجھے ڈیٹ پر
مری جیب پر بھی وہ بار تھا مگر اب نہیں

وہ کلین شیو پہ تھا فدا مری مونچھ تھی
بڑے مسئلوں کا شکار تھا مگر اب نہیں

مری تیزیوں پہ نثار تھیں کئی نازنیں
مرا راکٹوں میں شمار تھا مگر اب نہیں

کسی یاد نے مجھے بیڑیوں پہ لگا دیا
کبھی انگلیوں میں سگار تھا مگر اب نہیں

کئی بیگموں کی تھی آرزو کسی دور میں
کسی مولوی سا خُمار تھا مگر اب نہیں

وہ جو رات دن مرے پیچھے پیچھے تھا بھاگتا
مرا اور اُس کا اُدھار تھا مگر اب نہیں

مجھے دیکھ کر ہے چھپا لیا تُو نے دفعتاً
ترے ہاتھ میں تو اَچار تھا مگر اب نہیں

وہ جو بن سنور کے گزر گیا مرے پاس سے
مری ایک آنکھ کی مار تھا مگر اب نہیں

اسانغنی مشتاق رفیقی

کون کہتا ہے کہ شیطان سے ڈر لگتا ہے
مجھ کو واعظ ترے ہذیان سے ڈر لگتا ہے

تری باتوں سے میں مرعوب نہیں ہوسکتا
ہاں ترے منہ میں چھپے پان سے ڈر لگتا ہے

کیا پتہ چائے میں کیا گھول کے تو رکھ دے گا
چائے والے ترے احسان سے ڈر لگتا ہے

وہ بھی کیا دن تھے ترے ہونٹ کنول لگتے تھے
اب تو جاناں تری مسکان سے ڈر لگتا ہے

ووٹ کی شکل میں اک دن اسے تو مانگے گا
حاکمِ شہر تری دان سے ڈر لگتا ہے

کسی گونگے سے کوئی خوف نہیں ہے لیکن
جاگتے بولتے انسان سے ڈر لگتا ہے

کیا پتہ کب مجھے وہ پھاڑ کے کھا جائے گا
بھیس بدلے ہوئے انسان سے ڈر لگتا ہے

پوجا کرتے ہوئے دیکھا ہے کنول کو جب سے
مجھ کو کافور سے لوبان سے ڈر لگتا ہے

طنز گوئی میں رفیقی تری ہے بات ہی اور
ہر کسی کو ترے دیوان سے ڈر لگتا ہے

شوکت جمالؔ

دردِ دل، دردِ جگر کا ماجرا اُس نے سنا اور ہنس دیا
داستانِ غم کو میری جان کر اک چٹکلا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

اختلافِ رائے بیٹے کو سیاست میں نہ ہو کیوں باپ سے
عرض بیٹے نے کیا جو مدّعا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

پوچھ بیٹھا ہیر کے گھر کا پتہ رانجھا کسی رہگیر سے
ڈھونڈتا تھا وہ بھی کوچہ ہیر کا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

دیکھ لینا تیرا چھوٹا بھائی ہی لٹیا ڈُبو دے گا تری
یہ بڑے بھائی سے لوگوں نے کہا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

ہے محلّے میں ترے گانے سے نالاں ہر کوئی چھوٹا بڑا
مطّلع جب پاپ سنگر کو کیا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

تھوکنے اور چاٹ لینے کی سیاست میں ہے یہ کیسی رَوِش
جب کسی لیڈر سے یہ پوچھا گیا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

نقد اور زیور جو تھا سب لوٹ کر بیدرد جب جانے لگا
میں نے ڈاکو سے کہا ''حافظ خدا''، اُس نے سنا اور ہنس دیا

فلسفی سے گفتگو میں، میں نے پوچھا ایک چھوٹا سا سوال
پہلے مرغی آئی یا انڈا، بتا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

منہ پھلائے یار بیٹھا تھا مرا، شعر و سخن کی بزم میں
جیسے ہی شوکتؔ نے اِک مطلع پڑھا، اُس نے سنا اور ہنس دیا

احمد علوی

ملک میں ہو معتبر وہ اِتنی مکاری کے بعد
اور ہم معتوب ٹھہرے نازبرداری کے بعد

دونوں کاندھوں کے فرشتوں نے ہمیں احمق لکھا
آپ دہشت گرد ہیں حق کی طرفداری کے بعد

رہبران ملک کے دامن پہ اک دھبہ نہیں
ہے یقیناً معجزہ اتنی سیاہ کاری کے بعد

کچھ نئی غزلیں سناؤں گا ترنم سے تمہیں
جشن صحت بھی ہوا کرتا ہے بیماری کے بعد

چائے پر آجایئے ہم نے پڑوسن سے کہا
اپنے گھر بیگم گئی ہیں کتنی دشواری کے بعد

قتل پر خاموش ہے میرے قبیلہ جان لے
آئے گی باری تمہاری بھی مری باری کے بعد

رات اور دن کی ریاضت منہ کنویں میں ڈال کر
ہٹ کراتے ہیں غزل کو کیسی تیاری کے بعد

گر گئی ہے مارکٹ سلمان شاہ رخ خان کی
لیڈروں کی ملک میں عمدہ اداکاری کے بعد

اس قدر آلودگی تھی رکھ لئے منہ پر رومال
محفلوں میں آپ کی بے وقت بمباری کے بعد

اقبال شانہ

اِس زندگی کی مار نے بوڑھا بنا دیا
غم ہائے روزگار نے بوڑھا بنا دیا

ہر آدمی کو عہدِ جوانی میں دوستو
دنیا کے کاروبار نے بوڑھا بنا دیا

برباد ہو گئی ہے جوانی بھی شیخ کی
حوروں کے انتظار نے بوڑھا بنا دیا

برسوں سے یونہی لوگ کھڑے ہیں قطار میں
راشن کے انتظار نے بوڑھا بنا دیا

تم ہو گئے ہو اور جواں عشق میں مگر
ہم کو تمھارے پیار نے بوڑھا بنا دیا

مجنوں ضعیف ہو گیا عہدِ شباب میں
لیلیٰ کے انتظار نے بوڑھا بنا دیا

ہم کو تو ایک ہی نے کہیں کا نہیں رکھا
اور شیخ جی کو چار نے بوڑھا بنا دیا

شانہ دبکیلتے ہی رہے عمر بھر اُسے
ہم کو پرانی کار نے بوڑھا بنا دیا

نشتر امروہوی

دیکھ کر بیوی کو یہ کہنے لگیں نانی مری
تو بہت پچھتائے گا تو نے نہیں مانی مری

ہوتے ہی شادی بڑھی اتنی پریشانی مری
"زندگی ہے شبنم و گل کی طرح فانی مری"

لے کے رشوت جب پولس والوں نے کل چھوڑا مجھے
میرے گھر والوں نے بھی صورت نہ پہچانی مری

جب سے ہمسائی بنی ہے اک حسینہ خوبرو
میری بیگم کر رہی ہیں روز نگرانی مری

آج وہ بھی بن گئی ہے اک منسٹر کی بہو
کل تلک جس کو سبھی کہتے تھے دیوانی مری

مجھ کو جلدی سے بھگا دیتے ہیں گھر سے سیٹھ جی
ڈانٹنے لگتی ہے جب بھی ان کو سیٹھانی مری

جوتے اور چپل سے پٹ کر یوں لگا نشتر مجھے
آج مہنگی پڑ گئی ہے مجھ کو شیطانی مری

نشتر امروہوی

ڈرتے ہیں یوں تو آج بھی چھپّن چھری سے ہم
ہاں تاڑتے ہیں اُن کو فقط دور ہی سے ہم

نیکر پھٹا، قمیض پھٹی، سر بھی پھٹ گیا
نکلے ہیں ایسی شان سے اُن کی گلی سے ہم

شادی کا طوق پہنا تھا ایامِ جنوری
ڈرتے ہیں اِس لئے بھی میاں جنوری سے ہم

ہے چار شادیوں کی اجازت مگر جناب
دل جانتا ہے جیسے ہیں خوش ایک ہی سے ہم

اب ہیں مشاعروں میں گویّے ہی کامیاب
یہ فن بھی سیکھ لیں کسی استاد جی سے ہم

تھانے میں جس نے خوب مرمّت کرائی تھی
کرتے ہیں اب بھی عشق اُسی چھوکری سے ہم

تھپّڑ کا لات گھونسوں کا ہم پر اثر نہیں
تھانے میں پٹ چکے ہیں بہت مخبری سے ہم

نشتر نہ کر سکے کبھی سودا ضمیر کا
لڑتے رہے ہیں یوں تو بہت بھکمری سے ہم

امجد علی راجا

”دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی“
اِک غزل میں نے بھی کہی ہے ابھی

چھوڑ دوں میں ابھی وزارت کیوں
اِک تجوری فقط بھری ہے ابھی

کیسے محفل میں حسن کو دیکھوں
سر پہ بیگم کھڑی ہوئی ہے ابھی

چور ڈاکو پہنچ گئے پہلے
جبکہ بستی نہیں بسی ہے ابھی

شادیاں چار ہو گئیں لیکن
جانِ من آپ کی کمی ہے ابھی

چھوڑ دے ڈانگ ہاتھ سے بیگم
دیکھ! پسلی مری جڑی ہے ابھی

بینک سے لی تھی لیز پر گاڑی
بیچ کر قسط اک بھری ہے ابھی

بعد شادی کے آگ اگلے گی
وہ حسینہ جو پھلجھڑی ہے ابھی

مجھ کو طعنہ نہ دے بڑھاپے کا
تاڑ میں میری اک پری ہے ابھی

چھوڑ سکتی نہیں ابھی وہ مجھے
ایک کوٹھی مری بچی ہے ابھی

جاگ جائے گی قوم بھی اک دن
”غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی“

محمد خلیل الرحمٰن

سارا جہان تاش کے پتوں میں ہار کے
”وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے“

ویراں ہے میکدہ تو جواری اُداس ہیں
”تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے“

اِک ہاتھ ہی تو جیت سکے ساری رات ہم
”دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردِگار کے“

”شیطان کی کتاب“ تجھے چھوڑتے ہیں ہم
”تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے“

اِک جیت کی امید میں کھیلے چلے گئے
”مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے“

شہاب ظفر

کام کسی کا ہوتا ہے
نام کسی کا ہوتا ہے
Boss کو سمجھو نہ آساں
رام کسی کا ہوتا ہے
Uncle سب کے ہیں لیکن
سام کسی کا ہوتا ہے
آتا ہے رس جس میں نظر
آم کسی کا ہوتا ہے
درد کسی کے سر میں ہے
Balm کسی کا ہوتا ہے
ہاتھ لگا بس اپنے ''گل''
''فام'' کسی کا ہوتا ہے
میخانے سب جاتے ہیں
جام کسی کا ہوتا ہے
بک جاتے ہیں ہم ارزاں
دام کسی کا ہوتا ہے
صبح میرا لگتا ہے
شام کسی کا ہوتا ہے
Mary میری بن بیٹھی
ٹام کسی کا ہوتا ہے
ہکلہ پوچھے کا۔۔کا۔۔۔کا
لام کسی کا ہوتا ہے
عشق کسی کا سچا ہے
خام کسی کا ہوتا ہے

شہاب ظفر

دِلشاد ہوں ایسا کہ میں ناشاد نہیں ہوں
ابّا کا تمھارے کوئی داماد نہیں ہوں

پینا ہے تمھیں دودھ تو ملک پیک ہے موجود
عاشق ہوں تمھارا کوئی فرھاد نہیں ہوں

دل پہ نہ گراؤ یوں تغافل کے میزائل
میں شہرِ محبت تو ہوں بغداد نہیں ہوں

افسر نہیں گردانتا کچھ بھی تو کسی کو
چلائے یہ اسٹاف کہ میں گاڈ نہیں ہوں

شاعر ہوں مجھے کیسے نہیں لوگ سُنیں گے
حکام کے آگے کوئی فریاد نہیں ہوں

اِس ملکِ خداداد کا شہری تو ہوں لیکن
میں شوہرِ محصور ہوں آزاد نہیں ہوں

لُوٹو نہ مجھے مالِ غنیمت کی طرح سے
باہر سے میں آئی ہوئی امداد نہیں ہوں

ضیاءاللہ محسنؔ

رفتہ رفتہ، دھیرے دھیرے ٹُم ھوئے پھر ہم ہوئے
دیکھ لو، سب غم کے مارے کس قدر بے غم ہوئے

وہ تغیر کے تو قائل ھیں، مگر کچھ اس طرح
پہلے جو صاحب تھے اب وہ صاحبِ بیگم ہوئے

جب سے شادی گھاٹ اُترے، کیا سے کیا وہ ہوگئے
مثلِ گرگٹ بن گئے، برسات کا موسم ہوئے

ایک جانب ماں کی ممتا، اک طرف زوجہ کا پیار
پس گئے چکی میں صاحب، دانۂ گندم ہوئے

جتنے بھی ارمان تھے اب سارے ٹھنڈے پڑ گئے
جب سے اِک ہمدم ملا، وہ دم بدم بے دم ہوئے

یُوں جو آوارہ پھرا کرتے تھے راتوں کو ضیاءؔ
اب تو سیدھے تیر کی مانند وہ پیہم ہوئے

ضیاءاللہ محسنؔ

محسوس نہ کر، احساس نہ کر
اس دُنیا پہ ، وشواس نہ کر

تُو اپنے من میں ڈوبا جا
یوں سوچ کو محو یاس نہ کر

قدموں میں منزل آئے گی
بس ختم تُو اس کی پیاس نہ کر

یہ دنیا رنگ برنگی ہے
ارمان نہ رکھ ،کوئی آس نہ کر

اس پیار کے چکر میں پیارے
یوں عقل سپردِ گھاس نہ کر

من مانگے عشق کی پُڑیا جو
پھر بول اسے، بکواس نہ کر

سیّد فہیم الدین

حسینِ شہر ہے ساری سیاست پاس رکھتا ہے
وہ اپنا روپ میک اپ کی بدولت پاس رکھتا ہے

نجانے کس جگہ پر کام آ جائے ہنر مندی
جہاں جاتا ہے سامانِ حجامت پاس رکھتا ہے

وہ دولت کے عوض ہر چیز دے دیتا ہے لوگوں کو
مگر ہر حال میں اپنی خباثت پاس رکھتا ہے

دبائیں کس کی دولت ہم بھلا کس یار کو لوٹیں
گرانی ہو تو ہر کوئی ضرورت پاس رکھتا ہے

شرافت بھائی کے اطوار کچھ اچھے بھی ہیں لیکن
وہ شر تقسیم کرتا ہے تو آفت پاس رکھتا ہے

سیّد فہیم الدین

رشوتیں لینے میں یہ انداز طوفانی نہ کر
نیب کے ہتھے چڑھے گا، دیکھ! نادانی نہ کر

جاہلوں کے درمیاں تقریر طولانی نہ کر
بعد میں انڈے پڑیں گے دیکھ من مانی نہ کر

کام عملے سے کرا، دفتر میں سو یا گھر میں آ
ماتحت کے واسطے مشکل کو آسانی نہ کر

گو خدا رکھے ترا سالا فقط کانا سہی
قرض لے کر پھیر مت آنکھیں، یہ دو کانی نہ کر

چائے کا اِک کپ بلا، پہلائے جا، ٹرخائے جا
کاٹ کر جیبیں تو اپنی خاص مہمانی نہ کر

روبینہ شاہین بیناؔ

وہ لیڈر کی اداکاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
وہی وعدوں کی ترکاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

سبھی بہروپ بھرتے ہیں مرے گھر میں سیاست کا
مرے بچوں کی فنکاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

خدا نے آج تک حالت نہیں بدلی غلاموں کی
وہی بیگم کی سرداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

جسے دیکھو وہ مجنوں کا مریدِ خاص لگتا ہے
محبت کی یہ بیماری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

سبھی موبائل پیکج کرائے بیٹھے ہیں عاشق
سو راتوں کی وہ بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

چلے آتے ہیں کچھ رنڈوے امیدِ عقدِ ثانی میں
کسی بیوہ کی غمخواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ابھی تک حکم چلتا ہے وہاں سسرال کا بیناؔ
وہی سالی کی گھرداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

روبینہ شاہین بیناؔ

کسی طرح کی شناسائی سے نہیں ملتے
مرے مزاج بھی ہمسائی سے نہیں ملتے

بتا دیے ہیں جو خالہ نسیم نے سب کو
وہ سیکرٹ تو کسی نائی سے نہیں ملتے

خدا ہی جانتا ہے کون لے گئی پڑھنے
رسالے اب کسی ہمسائی سے نہیں ملتے

بنالئے ہیں ندیدوں نے جو کرپشن سے
یہ رنگ ڈھنگ کبھی پائی سے نہیں ملتے

یہ سب کمال ہے تبت کریم کا جانو!
سفید لوگ برونائی سے نہیں ملتے

یہ اور ہی کسی اماں کے لاڈلے ہوں گے
یہ چار بال کسی بھائی سے نہیں ملتے

جو کھو کے رہ گئے سسرال میں کہاں ہوں گے
کسی کھنڈر سے، کسی کھائی سے نہیں ملتے

مجھے زمانہ شناسی نہ آ سکی بیناؔ
مرے truth مری lie سے نہیں ملتے

نویدظفرکیانی

شکر ہے اسکینڈلوں کے درمیاں ہے زندگی
خادمانِ قوم کے شایانِ شاں ہے ہے زندگی

چن چڑھایا ہی نہیں میری جوانی نے ابھی
تیر ہے لیکن ابھی تک بے کماں ہے زندگی

بیویوں کو دیکھئے تو تیز رو اور بے سٹاپ
شوہروں کو دیکھئے تو بے زباں ہے زندگی

اوّلیں فکرِ پلاٹ اور پھر غمِ تعمیر ہے
ہم غریبوں کے لئے خوابِ مکاں ہے زندگی

سندھ کا جیسے گورنر ہے میں ہوں ویسا ہی فٹ
میری قسمت میں مگرویسی کہاں ہے زندگی

اب سمجھدانی مری امریکنوں سی ہو گئی
میں کبوتر جانتا تھا اور ''کاں'' ہے زندگی

ہائے یہ سوزِ محبت اُف یہ دھندے دہر کے
میں ہوں پنڈی میں اگرچہ لودھراں ہے زندگی

عقد میں متھے لگا بیٹھے ہیں بی بی بیگماں
اور اب لگتا ہے کہ''مس کہکشاں'' ہے زندگی

ہم بھی گزرے ہیں وہاں سے ایک دن چھٹی کے وقت
گرلز کالج جایئے تو بیکراں ہے زندگی

خیر ہے جو حُسن والے لفٹ دیتے ہی نہیں
''برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی''

نقل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا ظفر
ممتحن سر پر کھڑا ہے، امتحاں ہے زندگی

نویدظفرکیانی

عقد کا وقوعہ تھا ایک خواب کی طرح
زندگی میں ڈال دی اضطراب کی طرح

آگے سے گزر سکیں کیا چرا کے ہم نظر
وہ نظر ہے شعبۂ احتساب کی طرح

جانتا ہے وہ ہمیں اک بٹیر دوستو
جس کا بھائی جان ہے اک عقاب کی طرح

اپنی سیٹ پر کھڑا کر دیا ہے پوت کو
اور سمجھتا ہے اِسے انقلاب کی طرح

ایسے ڈیم فول پر چپ کا ڈیم کیوں نہیں
وہ جو بہتا جا رہا ہے چناب کی طرح

میرے پہلو میں تجھے دیکھتے ہی جل گیا
دل کسی کا ہو گیا پھر کباب کی طرح

عشق خبط بھر گیا، عقد کونڈا کر گیا
اِک سوال کی طرح ، اک جواب کی طرح

بدنصیبی سے مری، وہ بلیک بیلٹ تھی
جو نزاکتوں میں تھی کچھ گلاب کی طرح

میتھ کی کتاب ہے ازدواجی زندگی
عشق تو ہے سرسری، انتساب کی طرح

ووٹروں میں لیڈروں میں ہے فرق تو یہی
یہ ہیں گائے کی طرح وہ قصاب کی طرح

مفتیوں سے پوچھئے حد لگے گی یا نہیں
پی رہے ہیں چائے بھی ہم شراب کی طرح

وہ جو گھر جوائی کے عہدے پر ازل سے ہے
اُس کی فرصتیں بھی ہیں میری جاب کی طرح

احمد علوی

مسٹر غالب

پہلا منظر

ایک جدید فلیٹ کا اندرونی حصہ۔ڈھولک رام ڈرائنگ روم میں بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں قلم ان کے ہاتھ میں ہے، اور کاغذ قالین پر رکھا ہے۔لائیٹ آن ہوتی ہے، ڈھولک رام ترنم میں مصرعہ گنگنا رہا ہے۔

ڈھولک رام اگر جاں مرّبہ بنتی تو یہ دل اچار ہوتا

(دو تین بار دہراتا ہے)

کملا (ڈھولک رام کی اہلیہ) میں نے آپ سے صبح ہی کہہ دیا تھا اچار بالکل ختم ہو گیا ہے، اور مربہ تھوڑا سا بچا ہے جو میں آپ کو نہیں دے سکتی اسے میں مالتی کو بھیجوں گی۔

ڈھولک رام اوں۔۔۔ہوں جب گرہ لگنے لگتی ہے، یہ اپنی ٹانگ پھنسا دیتی ہے، یہ بیویاں نجانے انسان کے کون سے ناکردہ گناہوں کی سزا ہوتی ہیں۔۔۔ارے بھئی میں اچار مربہ نہیں مانگ رہا بلکہ مصرعہ مانگ رہا ہوں مصرعہ!

کملا مسری تو ہوا کرتی ہے لیکن یہ مسرا کیا بلا ہے، کہیں یہ مسری کا بڑا بھائی مسرا تو نہیں جسے انگریزی میں ایلڈر بردر کہتے ہیں۔

ڈھولک رام جہالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، آپ ذرا کچن شریف سے یہاں تشریف لائیں، ہم بتاتے ہیں کہ مصرعہ کیا ہوتا ہے۔

کملا (کملا ونگ میں داخل ہوتی ہے) اب آپ مجھے اتنی بھی بدھومت سمجھئے۔۔۔ میں سمجھ گئی آپ آر پی مسرا کی بات کر رہے ہیں نا۔۔۔

ڈھولک رام وہ میں جانتا ہوں آپ کتنی عقل مند ہیں۔

کملا یہ جو مسرا کی بیوی ہے نا بڑی نک چڑھی ہے۔ کسی سے بات ہی نہیں کرتی، ہمیشہ منھ پھلائے رہتی ہے۔محلّے میں چرچا ہے کہ مسرا جی خوب دَب کے رشوت لیتے ہیں۔کلو دھوبی بتا رہا تھا کہ ان کا کوئی دو نمبر کا بزنس بھی ہے تب ہی اتنے ٹھاٹ سے رہتی ہے۔

ڈھولک رام کون کتنے ٹھاٹھ سے رہتا ہے ہمیں اس سے کیا۔ہمیں دوسروں کی کھڑکیوں میں نہیں جھانکنا چاہیے۔کون دو نمبر کا کام کرتا ہے کون تین نمبر کا ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔

کملا کل کو پکڑے گئے تو پولس تو پڑوسیوں کو ہی

پکڑے گی ۔تم نے بھی رشوت کے پیسے کی پڑوسی کے ناتے چائے یا کافی پی ہوگی ۔یا پھر سنیما بھی دیکھنے گئے ہونگے۔آپ کو کیا پتہ پولس کیسے ٹیڑھے میڑھے سوال پوچھتی ہے۔ہمیں ابھی سے تیاری رکھنی چاہیئے ۔۔۔۔ہاں۔۔۔

ڈھولک رام اگر تم نے آگے ایک بھی لفظ بولا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔تم جس مسرا کی بات کر رہی ہو یہ وہ مسرا نہیں ہیں۔

کملا اچھا تو یوں کہونا۔۔۔آپ کے دفتر میں کوئی مسرا جی ہیں، آپ ان کی بات کر رہے تھے۔

ڈھولک رام میں شعر کے مصرعے کی بات کر رہا ہوں ۔تم ایک ادیب اور شاعر کی بیوی ہو دس سال میں تمھیں دفتر کے مسرا اور شعر کے مصرعے کا فرق نہیں معلوم ہو سکا۔

کملا میں سمجھی نہیں!

ڈھولک رام غزل کا جو شعر ہوتا ہے وہ دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

کملا آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ دو مسرا جی سے ایک شعر بنتا ہے۔

ڈھولک رام جاہل عورت پوری بات تو سن لے۔

کملا پہلے یہ بتاؤ، اُردو میں جاہل کسے کہتے ہیں۔

ڈھولک رام شاعر کی بیوی کو۔

کملا تو یوں کہو ۔۔۔کہ آپ مجھے کہہ رہے ہو۔

ڈھولک رام جی بالکل صحیح سمجھیں آپ اگر آپ تھوڑا اپنی زبان شریف کو قابو میں رکھیں تو میں آپ کو مصرعے کی ڈیفی نیشن سمجھاؤں!!

کملا جی سمجھائیں !!

ڈھولک رام غزل کے ایک شعر میں دو لائینیں ہوتی ہیں،ان دو لائینوں کو دو مصرعے کہا جاتا ہے۔دو مصرعوں کو ملا کر ایک شعر بنتا ہے۔

کملا اچھا تو یہ آپ کے شاعری وائری والے مسرا جی ہے،نکھٹو مفت کی چائے پینے والے۔

ڈھولک رام دیکھو کملا ایسا ہے جشن غالب کے سلسلے میں ایک بہت بڑا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے ۔ اس مشاعرے میں شرکت کرنے خود مرزا غالب ملک عدم سے تشریف لا رہے ہیں۔میں غالب کی زمین میں غزل کہہ رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔تمھیں نہیں معلوم پرانی غزل میں نئی غزل کہنا کتنا مشکل ہے۔(اور مصرعہ گنگنانے لگتا ہے)

اگر جاں مربہ بنتی تو یہ دل اچار ہوتا

کملا بھگوان جانے یہ کیا اچار مربہ کرتے رہتے ہیں۔۔۔میں تو تنگ آگئی ہوں اِن موئے شاعروں سے۔

ڈھولک رام یہ تمہاری غلطی نہیں ہے کملا یہ المیہ تو ہر دور کے غالب کے ساتھ رہا ہے۔مرزا غالب کی بیوی بھی بالکل تمہاری طرح تھی،وہ تمہاری ہی طرح غالب کی شاعری سے تنگ تھی۔

کملا آخر اس موئی شاعری سے آپ کو ملتا کیا ہے۔

ڈھولک رام شاعری سے ملتی ہے واہ واہ داد عزت ،شہرت، غالب کو دیکھ لو آج ڈیڑھ سو برس بعد وہ آج بھی زندہ ہے۔اپنے کلام میں اپنے خطوط میں اپنے لطیفوں میں۔

کملا آپ کی یہ اول جلول باتیں میری سمجھ سے تو باہر ہیں۔

ڈھولک رام یہ بہت علمی،ادبی،اور تحقیقی باتیں ہیں تمہارے جیسی سیدھی سادھی گھریلو عورت کی سمجھ میں کہاں آسکتی ہیں۔

کملا اچھا ہے یہ باتیں سمجھ نہیں آتیں ورنہ میں بھی آپ ہی جیسی ہو جاؤں گی۔

ڈھولک رام تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم تمہارے شوہر کا ادب میں کیا مقام ہے ۔تمہیں کیا معلوم اس دور کا سب سے بڑا غالبیہ تمہارا یہ ناچیز شوہر ہی ہے ۔اس برس کا غالب ایوارڈ تمہارے شوہر کو ملنے والا ہے۔

کملا کیا ہوتا ہے اِن ایوارڈوں سے ان کو کباڑے میں بیچ کر دو وقت کی روٹی نہیں بن سکتی ۔اگر میرے میکے سے ہر مہینے معقول رقم نہ آئے تو فاقوں کی نوبت آجائے ۔تمہارے ان چائے خور دوستوں کو اس گھر میں پانی بھی نہ ملے۔

ڈھولک رام تمہیں معلوم ہے مرزا غالب بھی سسرال میں ہی رہا کرتے تھے ۔ان کا تمام خرچ ان کے سسرالیے ہی برداشت کرتے تھے ۔بہادر شاہ ظفر سے جو ان کو پینشن ملا کرتی تھی اوہ اتنی قلیل تھی کہ اس سے ان کا شراب کا خرچ ہی پورا نہیں ہوتا تھا ۔ ۔۔۔۔۔تمہیں اب کون سمجھائے کہ ہر دور کا غالب سسرال کے زیرِ سایا ہی تناور درخت بنتا ہے۔

کملا خوددار لوگ سسرال والوں کے ٹکڑوں پر نہیں پلا کرتے۔

ڈھولک رام مگر خوددار شاعر سسرال کے ٹکڑوں پر ہی پلا کرتے ہیں ۔سسرال کے ٹکڑوں میں نجانے کیا جراثیم ہوتے کہ جنہیں کھاتے ہی، عظیم شاعری جنم لینے لگتی ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

قہریار کا داخلہ

قہریار (باہر سے آواز آتی ہے) ارے بھئی ڈھولک رام جی، گھر میں تشریف رکھتے ہیں ۔(اندر آجاتے ہیں)

ڈھولک رام کون! قہریار بھائی آجاؤ۔۔۔آجاؤ اندر تشریف لے آؤ۔

قہریار آداب بھابھی جان۔

کملا (تنک کر) ہوں۔۔۔(اور اندر چلی جاتی ہے)

ڈھولک رام ارے بھئی کملا ذرا گرم گرم دو کپ چائے بنا دینا۔ قہریار بھائی آئے ہیں۔

کملا (اندر سے ہی آواز آتی ہے) گیس ختم ہوگئی ہے چائے نہیں بن سکتی۔

ڈھولک رام ارے بھئی ہیٹر پر بنا دو ۔(سرگوشی میں) ان عورتوں کو تو کام نہ کرنے کے بہانے چاہئیں۔

قہریار چائے کو رہنے بھی دو اب اور سناؤ کیا چل رہا ہے؟

ڈھولک رام کل کے مشاعرے کے لئے ،مصرعہ لیکر بیٹھا تھا۔مرزا کی زمین میں ایک مصرعہ تو ہوگیا مگر ابھی تک مصرعہ نہیں لگ سکا۔

قہریار کیا مصرعہ ہوا؟

ڈھولک رام مصرعہ عرض ہے۔

''اگر جاں مربہ بنتی تو یہ دل اچار ہوتا''

قہریار واہ واہ سبحان اللہ کیا مصرعہ کہہ دیا کیا جدت ہے اس مصرعے میں ۔مگر ایک کمی ہے اس مصرعے میں اگر گراں نہ گذرے تو بیان کروں۔

ڈھولک رام وہ کیا؟

قہریار اس مصرعے میں جو اچار اور مربّے کا ذکر ہوا ہے ۔اس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اچار آم کا ہے یا لیموں کا نہ مربّے کا ہی خلاصہ ہوتا ہے کہ مربّہ

آملے کا ہے یا سیب کا، قاری مصرعے کو پڑھ کر کنفیوز ہو جائے گا۔

ڈھولک رام جس کو آپ کمی کہہ رہے ہیں یہی اس مصرعے کی خوبی ہے۔ اس مصرعے میں لفظ مربّہ رکھا گیا ہے اب جس کو جس مربّے سے شغف ہے وہ اسی مربّے کا خیال کر کے مصرعہ پڑھے گا تو اسی مربّے کا ذائقہ اس مصرعے میں آئے گا۔ اسی کو معنی آفرینی کہتے ہیں۔

قہریار (مرعوب ہوتے ہوئے) واقعی ڈھولک رام جی آپ کے تخیّل کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

ڈھولک رام یہ سب غالب کے مطالع کا اثر ہے۔ میں غالب کو اردو کا سب سے بڑا شاعر یونہی نہیں کہتا۔ غالب کے دیوان میں ایسے ایسے لال و جواہر چھپے ہوئے جنہیں ایک ماہر غوطہ خور ہی تہہ میں جا کر نکال سکتا ہے۔

قہریار ہاں یہ تو ہے غالب کو سمجھنا عام قاری کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے ماہر غوطہ خور ہونا ضروری ہے۔

ڈھولک رام لیکن آج کے قاری کا المیہ یہ کہ اس میں حرام خور تو مل جاتے ہیں غوطہ خور نہیں ملتے۔ اس لئے مرزا کے بہت سے شعر سر پر سے ہوائی جہاز کی طرح گذر جاتے ہیں۔

قہریار سنا ہے مرزا جشنِ غالب میں شریک ہونے آسمان سے زمین پر تشریف لا رہے ہیں۔ کیا اس خبر میں کچھ سچائی ہے۔

ڈھولک رام یہ خبر بالکل سچ ہے۔ ہماری حکومت نے مرزا غالب کو تین مہینے کا ویزا دیا ہے۔ مرزا غالب کا شاندار استقبال ہوگا۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد ہوگا جس میں ساری دنیا سے شعراء کو دعوتِ سخن دی جائے گی۔

قہریار لیکن یہ کیسے ممکن ہے صدیوں سے ملکِ عدم کے لئے ون وے سسٹم عمل میں آرہا ہے۔ ادھر کا آدمی اُدھر جا سکتا تھا مگر اُدھر کا اِدھر نہیں آسکتا تھا۔

ڈھولک رام معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ اس بار کے انتخاب میں مولانا حالی آسمانی پارلیمینٹ کے ایم پی چنے گئے ہیں۔ اور انہیں کیبنیٹ میں وزیر خارجہ کی وزارت سے نوازہ گیا ہے۔ وہ اس ون وے سسٹم کے سخت مخالف ہیں۔

قہریار بڑی دلچسپ معلومات ہے۔ واقعی اگر اس فرسودہ سسٹم میں تبدیلی آئی تو ہم اپنے تمام بزرگوں کے دیدار کر سکیں گے۔

ڈھولک رام غالب صاحب کو ابھی تجربے کے طور پر آسمان سے زمین پر بھیجا جا رہا ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہوتا ہے تو میر ذوق داغ دہلوی وغیرہ کو بھی آسمان سے زمین پر مدعو کیا جائے گا۔

قہریار لیکن ڈھولک رام جی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تجربے کے طور پر غالب کو ہی زمین پر بھیجنے کا کیوں فیصلہ ہوا۔ جب کہ مرزا غالب سے بھی زیادہ برگزیدہ ہستیاں ملکِ عدم میں موجود ہیں۔

ڈھولک رام مولانا حالی ٹھہرے غالب کے چہیتے شاگرد وہ اپنے استاد کو موقع نہیں دیتے اور کسے دیتے۔

قہریار واقعی مولانا نے حقِ شاگردی ادا کر دیا۔ وزیر خارجہ بن کر بھی استاد کو نہیں بھولے۔ یہاں تو میرا ایک شاگرد اردو اکادمی کا چیئرمین بنا تو میں نے اس سے کہا کہ بہادر شاہ ایوارڈ مجھے دلوا دے تو بولا کہ ایوارڈ کی آدھی رقم اہلیہ کے پاس جمع کرا دیجئے ایوارڈ آپ کو دلوا دونگا آدھی رقم بھی اس لئے کہ آپ میرے استاد ہیں ورنہ

پوری رقم دینے والی پارٹیاں بھی موجود ہیں۔

ڈھولک رام تو پھر آپ کو یہ ایوارڈ کیسے ملا؟

قہریار شاگرد کا حکم مان کر اور کیسے۔ ان کی اہلیہ کو ایوارڈ کی آدھی رقم پہنچادی اور اکادمی نے میرے بینک اکاؤنٹ میں پوری رقم ٹرانسفر کردی۔

ڈھولک رام نجانے ہمارے ملک سے یہ رشوت خوری اور کنبہ پروری کی لعنت کب ختم ہوگی۔

قہریار اماں جب یہ لعنت آسمان پر بھی موجود ہے تو یہاں یہ کیسے ختم ہوسکتی ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیں حالی وزیر خارجہ بنے تو غالب کو ویزا ملا، کیا میر کو ویزا نہیں ملنا چاہیے تھا کیا سرسید کا اس وقت آنا ضروری نہیں تھا۔ جب کہ تعلیمی طور پر مسلمان دوسری قوموں سے پچھڑ رہے ہیں۔

ڈھولک رام یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ مرزا غالب کو اس لئے ویزا دیا گیا ہے کیونکہ یہاں ان کا دو سو سالہ جشن منانے کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ آپ جشنِ میر منائیں یا جشنِ سرسید منائیں تو اسی بنیاد پر انہیں بھی آسمان سے زمین پر آنے کی اجازت ملے گی۔

قہریار میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بھلا مرزا غالب کے جشن پر اتنا روپیہ بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں کتنے غالب ہیں جن کی زندگی موت سے بدتر ہے۔ ہم ان کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے۔

ڈھولک رام اماں سب کہنے کی باتیں ہیں مرزا غالب کے مزاج اور معیار کا ایک شعر کیا کوئی مصرعہ نہیں کہہ سکتا۔ مرزا کی زمینوں میں ہزاروں شاعروں نے لاکھوں غزلیں کہی ہیں کیا شعر کوئی کہہ پایا ان کے جیسا؟

قہریار ویسے ڈھولک رام جی آپ کا یہ مصرعہ تو مرزا کی تمام شاعری پر بھاری ہے۔

ڈھولک رام یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ بندہ کس قابل ہے۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ یہ میری غزل مرزا کی غزل پر بھی بھاری ہو۔ آپ مطلع دیکھیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
شبِ وعدہ آ بھی جاتے تو ہمیں بخار ہوتا

قہریار واللہ۔۔۔ کیا مطلع کہا ہے آپ نے مرزا کو تو سن کر ہی غش آجائے گا۔

ڈھولک رام مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قہریار نہیں جناب، یقین جانئے کہ ابھی تو صرف ایک مطلع ہوا ہے، اگر پوری غزل اس معیار کی ہوگئی تو مرزا خود آپ کو جانشینِ غالب بنا جائیں گے۔

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

مرزا غالبؔ کا داخلہ

مرزا غالبؔ کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟

ڈھولک رام آپ اور کتنا اندر آنا چاہتے ہیں، آپ سارے کے سارے تو اندر آچکے ہیں۔

مرزا غالب ہم آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ڈھولک رام ڈھولک کا دولت خانہ کہاں ہے؟

قہریار (حیرت سے) دولت خانہ؟؟

مرزا غالب جی ہاں دولت خانہ!

قہریار (ڈھولک رام سے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی

کرتا ہے) یہ شخص دولت خانے کا پتہ پوچھ رہا ہے کہیں یہ انکم ٹیکس کا کوئی افسر تو نہیں۔

ڈھولک رام مجھے تو یہ کسی ڈرامہ کمپنی کا جوکر لگ رہا ہے، ذرا وضع قطع تو ملاحظہ فرمائیں اس کی۔ ایک دم مرزا غالبؔ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی نظر آ رہا ہے۔

قہریار یہ انکم ٹیکس والے اسی طرح کے عجیب عجیب بھیس بدل کر آتے ہیں اور پورے گھر میں جھاڑو پھیر جاتے ہیں۔

(کملا آتی ہے)

کملا میں ابھی خبر لیتی ہوں اس کی (مرزا غالب کے پاس جا کر) اے مسٹر! یہ ہمارا گھر ہے کوئی انکوائیری دفتر نہیں ہے اور کہیں دماغ ماریئے۔

مرزا غالب محترمہ ہم ڈھولک رام ڈھولک کے دولت خانے کا پتہ معلوم کرنا چاہ رہے ہیں، ویسے ہم رہنے والے تو یہیں کے ہیں مگر ایک مدّت کے بعد واپسی ہوئی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں یہاں تو سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔

کملا دیکھیے شریمان جی آپ کو ہمارے بارے میں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ اِس گھر میں دولت وولت کچھ نہیں ہے۔ یہ فریج جو آپ دیکھ رہے ہیں، قسطوں میں خریدا گیا ہے۔ ٹی وی کی بھی ابھی دس قسطیں باقی ہیں۔ یہ قالین لال قلعے کے کباڑی بازار سے میں خود خرید کر لائی تھی اور یہ صوفہ ہماری شادی کے موقع پر میری دیدی نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔

ڈھولک رام کملا، اسے یہ بھی بتا دو کہ بینک میں جن دھن یوجنا کے تحت زیرو بیلینس کا کھاتا ہے، جس میں مودی جی پندرہ لاکھ روپے ڈالیں گے تو پندرہ لاکھ آئیں گے، پاس بک دکھا دو اسے۔

قہریار ان حالات میں آپ خود سوچ سکتے ہیں دولت کہاں جمع ہو سکتی ہے۔ شاعروں کے پاس۔۔۔

ڈھولک رام اماں اگر دولت تلاش کرنی ہے تو لیڈروں کے گھر جا کر چھاپے مارو، افسروں کی تجوریاں کھنگالو، سپر اسٹاروں کے بنگلوں پر جاؤ، صنعت کاروں کی تجوریوں کے تالے کھولو، وہاں ملے گی تم کو دولت یہ تو ایک اردو کے ادیب کا گھر ہے یہاں کیا ملے گا۔۔۔ چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط۔

قہریار اور یہ سب چیزیں بھی غالب کے زمانے میں ملا کرتی تھیں، آج سے دو سو برس پہلے۔۔۔ اب تو شاعروں کے گھر ملتے ہیں چند کباڑی بازار کی مرے ہوئے انگریزوں کی شرٹیں، پھٹی ہوئی جینسیں، قسطوں کے ٹی وی، جہیز کے صوفے، اُدھار کی بیویاں۔

مرزا غالب چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا
اماں یہ تو میری غزل کا شعر ہے۔ یعنی آپ مرزا غالب کو جانتے ہیں۔

کملا کون غالب؟

مرزا غالب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ، المتخلص غالبؔ، استادِ شہنشاہ ہندوستان بہادر شاہ ظفر اور کون!

کملا اِتنے لمبے نام کا آدمی گلی قاسم جان میں کوئی نہیں رہتا۔

قہریار اماں آج کل دہلی میں چار بائی چار فٹ کے کمرے میں چار چار فیملی زندگی گذار رہی ہیں، اگر اِتنے لمبے لمبے ناموں کے آدمی بلّی ماران میں رہنے آ گئے تو پوری گلی قاسم جان میں چار آدمی دکھائی دیں گے۔

مرزا غالب مقام حیرت ہے، کہ آپ لوگ مرزا اسد اللہ خاں

غالب کو نہیں جانتے۔ ہم نے تو سنا تھا کہ ہماری شہرت سارے جہان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے نام پر انسٹی ٹیوٹ چل رہے ہیں، ہمارے اوپر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

ڈھولک رام اجی انکم ٹیکس والوں کو کون نہیں جانتا، وہ غالب کا بھیس بدل کر آئیں یا اقبال کا، سودا کے میک اپ میں آئیں یا میر تقی میر کے، بہر حال وہ پہچان لئے جاتے ہیں۔

مرزا غالب لیکن ہم نے تو آج تک کوئی بھیس نہیں بدلا۔ ایک بار بندر کا تماشہ دیکھنے کے لئے فقیر کا بھیس بدلا تھا کیونکہ ہمارے پاس تماشہ دیکھنے کی رقم نہیں تھی۔ ہم نے یہ واقعہ بھی نہیں چھپایا، اپنے دیوان میں یہ شعر لکھ کر افشا کر دیا۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

کملا اچھا، تو غالبؔ کے شعر بھی یاد کر کے آئے ہیں جناب، اجی سنتے ہو مجھے تو یہ چھٹا ہوا غنڈہ لگتا ہے۔

قہریار پھر تو بھابھی آپ ہی اس سے نپٹ سکتی ہو، بچارے ڈھولک رام کو جی اس لفڑے میں نہ ہی پھنساؤ۔

کملا یا پھر یہ کوئی بہروپیا ہے۔ اس کی داڑھی مونچھیں لباس سب نقلی ہے مجھے لگتا ہے یہ کسی ڈرامہ کمپنی سے بھاگ کر آیا ہے۔

ڈھولک رام مجھے یہ بہروپیا نہیں لگتا۔ اِس کی داڑھی بھی اصلی ہے اور مونچھیں بھی اصلی ہیں اور یہ شخص غنڈہ بھی نہیں ہے۔

قہریار یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم اس کی یہ غالب کٹ داڑھی ایک ہلکی سی جنبش سے آپ کے دستِ مبارک میں ہوگی۔

کملا آپ کسی کی بات کہاں مانتے ہیں اور پھر بعد میں پچھتاتے ہیں۔

مرزا غالب اب پچھتائے کا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

کملا دیکھئے آپ پچھلے دس برس سے میرے شوہر ہیں مگر ان دس برسوں میں میری ایک بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن یہ صاحب آتے ہی میری بات سمجھ گئے۔

ڈھولک رام شادی سے پہلے تو میں تمہاری ساری باتیں سمجھ لیا کرتا تھا۔ تم کہتی تھیں سوا گیارہ بجے ڈیلائیٹ پر ملنا ہے میں ٹھیک سوا گیارہ بجے ڈیلائیٹ پہنچ جاتا تھا۔ مگر شادی کے دس سال بعد تم مجھے گولچہ پر بلاتی ہو، میں اوڈین پہنچ جاتا ہوں۔

قہریار بھابھی جی، اگر بھائی صاحب کی بات کا یقین نہ ہو تو اِن صاحب سے شادی کر کے تجربہ کر لو۔ بھائی صاحب کی سمجھداری میں تو دس سال میں یہ فرق آیا ہے، اِنہیں تو دس منٹ میں آگرہ کے پاگل خانے میں شفٹ کرنا ہوگا۔

ڈھولک رام تیری جی۔ کے بہت ویک ہے یار وہ پاگل خانہ اب بریلی شفٹ ہو گیا ہے۔

قہریار تو کوئی بات نہیں بریلی بھیج دیں گے، آپ بتائیں آپ کو اس شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟

ڈھولک رام قطعاً نہیں میں ابھی نو آبجیکشن دے سکتا ہوں۔

کملا تو تم دونوں مجھے اس گھر سے نکالنا چاہتے ہو تا کہ اس پر کٹی شاعرہ کو اس گھر میں لے آؤ، جس کے اوپر یہ موئی شاعری کرتے ہو۔ رات رات بھر آہیں بھرتے ہو۔ لیکن تم بھی کان کھول کر سن لو میں کہیں نہیں جانے والی میں یہیں رہوں گی اسی طرح تمہاری چھاتی پہ مونگ

ڈالوں گی۔

مرزا غالب محترمہ میں آپ کے گھر میں خانہ جنگی کرانے نہیں آیا تھا۔ میں تو اپنے ایک مداح ڈھولک رام ڈھولک کے دولت خانے کا پتہ معلوم کرنے آیا تھا۔ خیر چھوڑیئے میں کسی اور سے پتہ معلوم کرلوں گا ڈھولک رام کے دولت خانے کا۔

(چلا جاتا ہے)

ڈھولک رام یار آپ نے اس شخص کو بالکل ٹھیک پہچانا داد دینی پڑے گی تمہاری نظر کی۔ یہ سو فی صدی انکم ٹیکس ڈپارٹمینٹ کا ہی آدمی تھا۔ اسے دولت خانے کے سوا کوئی لفظ یاد ہی نہیں تھا۔

قہریار یہ اب آپ کا پیچھا نہیں چھوڑنے والا۔ اگر یہ اب چلا گیا اور اِسے پتہ چلا کہ یہی ڈھولک رام کا دولت خانہ ہے تو اور زیادہ ناراض ہوکر واپس آئے گا۔ شاید اس بار پولس کو ساتھ لے کر آئے۔

کملا پھر کیا کریں؟

ڈھولک رام میرے خیال میں اسے بلا لیا جائے اور کچھ لے دے کر معاملے کو یہیں ختم کر لیا جائے۔ اگر پولس تک بات پہنچی تو بدنامی بھی ہوگی اور پیسے بھی زیادہ خرچ ہوں گے۔

قہریار میں اس بات سے متفق ہوں۔

ڈھولک رام میں ابھی بلا کر لاتا ہوں، کملا تم ذرا چائے ناشتے کا انتظام کرو۔

(ڈھولک رام ونگ سے باہر جاکر مرزا غالبؔ کو بلاکر لاتا ہے)

قہریار (غالب کو دیکھ کر کھڑا ہوتا ہے) آپ تو ناراض ہوکر چلے گئے، نہ چائے نہ پانی آپ جن کو تلاش کر رہے تھے وہ ڈھولک رام جی یہی تو ہیں اور یہی ان کا غریب خانہ ہے۔

مرزا غالب آپ نے پہلے کیوں نا بتایا!

کملا (کملا چائے کی ٹرے لے کر آتی ہے) آپ دولت خانے کا پتہ معلوم کر رہے تھے نا! جب ہمارے پاس دولت ہے ہی نہیں تو دولت خانہ کہاں ہوگا۔

مرزا غالب آپ لوگوں نے شاید ہمیں پہچانا نہیں۔

ڈھولک رام پہچان تو ہم آپ کو پہلی نظر میں ہی گئے تھے۔۔۔ مگر۔۔۔

مرزا غالب مگر؟ مگر کیا؟؟

قہریار اگر مگر کیا صاحب۔۔۔ بس آپ کے سامنے زبان لڑکھڑا گئی۔ دراصل انکم ٹیکس والوں کا نام ہی برا ہے، یہ جس سے ایک بار چپک گئے، تا قیامت پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ڈھولک رام آپ کے محکمے سے ہم کیا بڑے بڑے صنعت کار، سرمائے دار، ایکٹر لیڈر افسر خوف کھاتے ہیں۔

مرزا غالب ہماری کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیسی گفتگو کر رہے ہیں۔

ڈھولک رام
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مرزا غالب یہ۔۔ یہ شعر، آپ کو معلوم ہے یہ شعر کس کا ہے۔

قہریار جی۔۔ جی ہاں یہ شعر مرزا غالب کا ہے اور کس کا ہوتا۔ آپ نے نہیں سنا یہ شعر کبھی؟ یہ تو ان کا بہت مشہور شعر ہے۔

مرزا غالب ہم نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ نے ہمیں پہچانا نہیں۔ ہم ہی مرزا اسداللہ خان غالبؔ ہیں جو جشنِ غالب میں شرکت کے واسطے جنت الفردوس سے دنیا میں آئے ہیں اور یہ کہ جو شعر آپ نے ابھی پڑھا ہے، اِس کا خالق بھی یہی خاکسار ہے۔

قہریار یعنی آپ واقعی ملکِ عدم سے تشریف لانے والے عظیم شاعر مرزا غالب ہیں۔

ڈھولک رام آپ ہی دبیر الملک مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب ہیں۔۔۔میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔۔ یقین نہیں آتا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

قہریار آپ کو گھر تلاش کرنے میں کوئی دِقت تو نہیں ہوئی، سفر آرام سے گذرا؟

ڈھولک رام آپ بائی ٹرین آئے ہیں یا بائی پلین؟

مرزا غالب آسمان پر آمد و رفت کے ذرائع زمین جیسے نہیں ہیں وہاں تو فرشتوں کو حکم ہوتا ہے۔فلاں شخص کو فلاں مقام پر پہنچادو اور فرشتے کرکٹ کی گیند کی طرح اس شخص کو اچھال دیتے ہیں اور وہ شخص اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

قہریار بہت عمدہ طریقہ ہے۔نہ ریزرویشن کا چکر نہ ایکسیڈینٹ کا خطرہ، نہ ویزا نہ امیگریشن۔

ڈھولک رام لیکن اس طریقے سے تو ہر مسافر کی منزل ہسپتال ہی ہوتی ہوگی۔

مرزا غالب ملکِ عدم میں نہ ہسپتال ہوتے ہیں نہ مریض وہاں تو زمین کی طرح انسان میں وزن بھی نہیں ہوتا۔روئی کے گالوں کی طرح ہر شخص ہوا میں تیرتا رہتا ہے۔

قہریار پھر تو وہاں ڈاکٹر حکیم بھوکوں مرتے ہوں گے!

مرزا غالب وہاں کسی کو کچھ کام نہیں کرنا پڑتا۔سب کو کھانا اللہ میاں کے لنگر سے ملتا ہے۔ہم جس کھانے کا حکم دیتے ہیں، فرشتے پلک جھپکتے ہی حاضر کر دیتے ہیں۔

ڈھولک رام گلی قاسم جان کو تلاش کرنے میں کوئی دقت تو نہیں آئی؟

مرزا غالب دو سو برس میں یوں تو کافی کچھ تبدیل ہو گیا ہے مگر یہ گلیاں کٹرہ نیل بلّی ماران چاندنی چوک آج بھی ویسا ہی ہے، جیسا کل تھا۔جہاں آج اسٹیشن ہے، وہاں پہلے کچھ نہیں تھا، ادھر سب ویرانہ تھا۔ایک بھی پکّی سڑک نہیں تھی۔کوچہ رحمان ویسا ہی ہے۔کاروبار بدل گئے ہیں پر عمارتیں وہی ہیں۔

ڈھولک رام آپ کو اس لباس میں دیکھ کر لوگ آپ کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوں گے۔

مرزا غالب ہم نے کبھی دنیا کی پروا کی ہے جو اب کریں گے۔اِن راستوں کو، اِن گلیوں کو آنکھوں سے زیادہ یہ قدم پہچانتے ہیں۔آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں قدم نہیں۔

قہریار آپ نے درست فرمایا۔

مرزا غالب آپ بھی اپنا تفصیلی تعارف کرادیں۔

ڈھولک رام آپ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، جدید غزل کے مشہور شاعر ہیں۔قہریار ان کا تخلّص ہے۔اور مجھے تو آپ جانتے ہی ہیں۔یہ میری اہلیہ ہے کملا ترپاٹھی دس سال سے میرے گلے پڑی ہے، نہ پھانسی ہی لگتی ہے نا پھندہ ہی ٹوٹتا ہے۔

مرزا غالب ذرا ٹھہریے محترم! یہ جملہ تو آپ ہمارا ہی ہم پر فٹ کر رہے ہیں۔ہم نے کسی خط میں اپنی پیاری بیگم کے لئے مذاق میں لکھا تھا۔آپ کی اہلیہ تو بڑی با سلیقہ مند اور پڑھی لکھی خاتون نظر آتی ہیں۔

ڈھولک رام ہر خاتون پہلی بار دیکھنے پر باسلیقہ معصوم، باحیا ہی نظر آتی ہے۔دس سال بعد وہ پھانسی کا پھندہ ہی بن جاتی ہے۔

کملا غالب صاحب آپ کو پتہ نہیں اس پھانسی کے

پھندے کے لئے یہ خود گئے تھے میرے گھر والوں کے پاس کہ بھگوان کے لئے اِسے میرے گلے میں ڈال دو۔سو سو بار ناک رگڑی تھی تب میرے پتا جی نے ہاں بولی تھی۔ مجھے تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ شاعر ہیں اگر پھیروں پر بھی پتہ چل جاتا تو آدھے پھیروں پر سے اٹھ جاتی۔

قہر یار اِن کی نوک جھونک تو چلتی رہے گی، اب آگے کا پروگرام طے کیا جائے۔

ڈھولک رام میں نے بے پر فضول کو فون کر دیا ہے۔وہ ڈی ڈی اردو اور ای ٹی وی اردو کی ٹیم کو لے کر یہاں پہنچنے ہی والے ہیں ۔اُردو ہندی اخبارات کے نمائندوں کو بھی یہیں بلالیا ہے۔مرزا غالب کے ملکِ عدم سے تشریف لانے کی کوئی معمولی خبر ہے، پوری دنیا میں ہنگامہ ہو جائے گا۔

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

تمام لوگ چائے پی رہے ہیں

قہر یار میری ایک ناقص رائے ہے، اگر گراں بارِ طبیعت نہ ہو تو عرض کروں۔

مرزا غالب بلا تکلف ارشاد فرمائیں۔

قہر یار آپ جدید غزل کے امام ہیں آپ کی رائے میں وزن ہونا چاہے، سو دو سو گرام ہی ہو۔

مرزا غالب شاہی امام، مسجد کے امام، افتخار امام جو بمبئی سے ''شاعر'' نکالتے ہیں، ان کا نام تو سنا تھا، یہ غزل کے امام کہاں سے آگئے۔

قہر یار میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مرزا صاحب کا یہ لباس وہی دو سو برس پرانہ ہے، آج ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں آج سب کچھ بدل چکا ہے۔ٹی وی پر اس لباس میں مرزا ایک دم جوکر معلوم ہوں گے۔یہ انگرکھا، ترکی ٹوپی چوڑی دار پائجامہ گذرے زمانے کی باتیں ہوگئیں۔

کملا آج کل تو جینس ٹراوزر اور ٹی شرٹ کا زمانہ ہے۔

ڈھولک رام میں نے تو اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔

قہر یار یہ پرسنیلیٹی ڈیولپمینٹ کا زمانہ ہے۔ترکی ٹوپی کی جگہ پر ہیٹ ہونا چاہئیے۔

ڈھولک رام مرزا غالب کو ہم گلوبل ورلڈ میں مسٹر غالب کے نام سے انٹر ڈیوز کراتے ہیں۔ہندی والے تو مرزا غالب کو مرجا گالب کر دیں گے۔

کملا انسان وہی ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ خود کو تبدیل کر لے۔

قہر یار مرزا جی آپ بڑی خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہے ہیں۔کیا آپ ہمارے مطمحِ نظر سے متفق ہیں؟

مرزا غالب میاں صاحبزادے آپ میں اور ہم میں دو سو برس کا جنریشن گیپ ہے۔اس گیپ کو کسی طرح نہیں پاٹا جا سکتا۔آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں، نئی دنیا کے تقاضوں سے ہم تو بے بہرہ ہیں۔

قہر یار میں حقیر غدر سے کہتا ہوں کہ وہ کناٹ پلیس سے ایک امپورٹڈ جینس اور ایک شاندار ٹی شرٹ مسٹر غالب کے لئے، لیتے آئیں۔

ڈھولک رام مسٹر غالب کے لئے ایک جوڑی اسپورٹس شو بھی لیتے آئیں۔

مرزا غالب لگتا ہے آپ میری پوری کایا پلٹ کر دیں گے۔

قہریار: بے پر فضول کلاس سے سیدھے یہیں تشریف لا رہے ہیں ۔آج کل اُن کی ذمے داریاں کچھ بڑھ گئی ہیں۔

مرزاغالب: یہ فضول شخص کون ہے ۔ ہمارے زمانے میں تو اس طرح کے تخلص نہیں رکھے جاتے تھے۔ مومن، داغ، ذوق، کیا خوبصورت تخلص ہوتے تھے۔یہ فضول تخلص رکھنے کی کیا تک ہے۔

ڈھولک رام: آپ کے زمانے میں شاعر حقیقت پسند نہیں ہوا کرتے تھے۔زیادہ تر شاعر خیالی اڑان اڑا کرتے تھے۔جو نہیں ہے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔مگر آج ایسا نہیں ہے۔آج شاعروں میں بھی حقیقت پسندی آئی ہے۔اتنا ضرور ہے کہ نامعقول شاعر بھی اب معقول دکھائی دیں اس لئے فضول سے تخلص رکھنے لگے ہیں۔

(حقیر عذر کا داخلہ، وہ نیلی جینس اور سرخ رنگ کی ٹی شرٹ لے کر آتے ہیں)۔

ڈھولک رام: (لباس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں) واہ واہ حقیر صاحب آپ کی خوش لباسی کی داد دینی پڑے گی کیا کمال کا لباس آپ نے غالب صاحب کے لئے پسند کیا ہے۔غالب کی شخصیت میں چار کیا پانچ چھ چاند لگ جائیں گے۔

کملا: وہ جو آپ کا شعر ہے نا ۔

وہ زعفرانی پل اوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

فیشن ڈیزائننگ پر اس سے عمدہ شعر اردو میں دوسرا نہیں ہے۔

حقیر عذر: جی ذرہ نوازی ہے آپ کی۔

مرزاغالب: صاحبزادے کی تعریف۔

ڈھولک رام: اِن کی شہرت آپ تک نہیں پہنچی ابھی تک حیرت ہے۔یہی تو ہیں جدید اردو غزل کی آبرو جن کے اشعار کو ہر بے پڑھا جاہل سیاستداں غلط تلفظ سے پڑھ کر اپنی سیاست چمکاتا ہے،ان کا ایک شعر تو میاں نواز شریف وزیر اعظم پاکستان کو بھی یاد ہے۔

مرزاغالب: ایسا کون سا شعر کہہ دیا۔۔ہم بھی تو سنیں۔

جی عرض کرتا ہوں ۔

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نجانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

مرزاغالب: میاں صاحبزادے شعر تو واقعی سر دھننے لائق ہے۔مبارک باشد

قہریار: غیض احمد غیض، احمد ناراض، نوش ملیح آبادی، قاہر لدھیانوی، وکیل بدایونی جیسے شعراء نے بھی ہمارے بعد کافی دھوم مچائی ہے۔

حقیر عذر: لیکن مرزا جی غزل میں جو نام اس حقیر فقیر با تقصیر نے پیدا کیا وہ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ مجھے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کا مقبول ترین شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔میرے ہزاروں شعر فضاؤں میں ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔کئی شعر تو میں نے معاف کرنا آپ سے بھی بہتر کہے ہیں۔ابھی جب آپ میرے شعر سنیں گے تو آپ بھی اس کا اعتراف کریں گے۔

مرزاغالب: میاں صاحبزادے آپ تو بہت غلط فہمی کا شکار ہیں۔

حقیر عذر: ابھی آپ نے مجھے سنا کہاں ہے ۔آپ بھی میرے مداح ہو جائیں گے۔

(اسی دوران دروازے پر گھنٹی بجتی ہے، سب کا دھیان اُس طرف ہو جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر
لالہ مسدّی لال کا داخلہ

ڈھولک رام (دروازے کی طرف جاتا ہے) کون صاحب؟

مسدّی لال (باہر سے ہی) ارے ڈھولک رام جی، میں ہوں لالہ مسدّی لال!

ڈھولک رام ارے لالا جی آپ اس وقت دکان چھوڑ کر میرے غریب خانے پر یہ وقت تو آپ کا ویاپار کا ہے۔

مسدّی لال ڈھولک رام جی، یہاں بھی تو ویاپار کے سلسلے میں ہی آیا ہوں۔

ڈھولک رام میں سمجھا نہیں! میرے غریب خانے سے آپ کے ویاپار کا کیا تعلق۔۔۔

مسدّی لال ابھی سمجھاتا ہوں۔ابھی ٹی وی پر خبر سنی کہ اپنے گلی قاسم جان کے مرزا غالب پرلوک سے آپ کے گھر پدھارے ہیں۔

ڈھولک رام جی خبر تو سچی ہے لیکن اس خبر سے آپ کے ویاپار کا کیا تعلق؟

مسدّی لال سن اٹھارہ سو چھپّن کے اس رجسٹر میں مرزا غالب کے نام ایک سو چھتر روپے لکھے ہوئے ہیں۔جو انہوں نے ابھی تک ادا نہیں کیے۔اس زمانے کے ایک سو چھتر آج تو کروڑوں روپے بن جائیں گے۔میں نے سوچا اب آہی گئے ہیں تو کیوں نہ تقاضہ کرلیا جائے، کچھ نہ کچھ تو ملے گا ہی۔

ڈھولک رام بات تو آپ کی صحیح ہے مگر کیا ایک مہمان سے یہ تقاضہ ان کی بے عزتی نہیں ہوگا۔

مسدّی لال اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے۔اگر ہم پولس کو ساتھ لیکر آئیں گے تو کیا تب آپ کے مہمان کی عزت ہوگی۔یہ کوئی عزت کی بات کہ آپ بنا قرض چکائے پرلوک سدھار جائیں۔

قہریار بھئی کیا معاملہ ہے۔

ڈھولک رام یہ لالہ مسدّی لال ہیں یہ مرزا سے اپنا قرض وصول کرنے آئے ہیں۔یہ اٹھارہ سو چھپّن کا رجسٹر لےکر آئے ہیں جس میں مرزا غالب کے نام ایک سو چھتر روپے لکھے ہوئے ہیں۔

قہریار تو اس میں قباحت کیا ہے۔ایک دن بعد غالب صاحب دوبارہ پرلوک واپس جائیں گے۔آپ ان کے ساتھ چلے جانا اور اپنا قرض وصول کرلینا۔مسدّی لال اگر آپ کو راستے کے لئے کمبل شمبل کی ضرورت ہو تو گھر سے لیتے آیئے۔

مسدّی لال جب غالب صاحب یہاں موجود ہیں تو ہم ان سے اپنا قرض یہیں وصول کریں گے! (مرزا غالب کی طرف جاتا ہے۔) آپ ہی مرزا غالب ہیں؟

مرزا غالب جی فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔

مسدّی لال میں گھمنڈی لال کا پرپرپرپرپرپوتا مسدّی لال ہوں۔ہمارے پرپرپرپرپرپرپرپرپردادا یا لکڑ دادا کی دکان کھاری باؤلی میں ہوا کرتی تھی۔وہ دکان آج بھی ہے جس سے آپ کے گھر کرانے کا سامان جایا کرتا تھا۔آپ ہمیشہ وقت پر ادھار چکتا کرتے تھے مگر یہ آخری انٹری چکتا کرنے سے پہلے ہی آپ پرلوک سدھار گئے۔

مرزا غالب صاحبزادے آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔گلی قاسم جان میں مرزا نوشہ کی سسرال تھی۔ہم یہاں

کے دولہا میاں تھے۔ آپ کا جو بھی قرض ہوگا وہ ہمارے سسر صاحب کے اوپر ہوگا۔

مسدّس لال نہیں ہماری پوتھی بتاتی ہے کہ قرض آپ کے نام پر ہے۔ ایک سیر دھنیہ، ایک پاؤ لال مرچ، آدھا سیر بادام لکھے ہوئے ہیں۔ ٹوٹل ایک سو پچھتر روپے کا حساب ہے۔

ڈھولک رام (پرس سے روپے نکالتا ہے۔) یہ لے ایک سو پچھتر روپے۔

مسدّس لال آپ کیسی بات کرتے ہو دو سو سال میں ایک سو پچھتر ایک سو پچھتر ہی رہیں گے۔ اگر ایک ٹکے کا بھی سود لگاؤ تو کتنا بنے گا۔ اور پھر مہنگائی کا ریشو یہ تو کروڑ سے بھی کچھ زیادہ ہی بن رہے ہیں۔

مرزا غالب لالا جی آپ اپنا اکاؤنٹ نمبر آئی ایف سی نمبر لکھا دو، میں پرلوک سے آپ کا آر ٹی جی ایس کرادوں گا۔

مسدّس لال نا جی، ہمیں آپ کا بھروسہ نہیں ہے۔ دو سو برس میں تو اب پکڑ میں آئے ہیں آپ اب تو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ پیسہ وصول کر کے ہی جائیں گے۔

قہریار لالا جی ابھی غالب صاحب تین دن کہیں جانے والے نہیں ہیں۔ ابھی ان کا مشاعرے کا پیمینٹ ہونا ہے۔ ان پر سیمینار ہے۔ فلم والوں سے بھی مرزا جی نے پیمینٹ لینی ہے۔ آپ چنتا نہ کریں۔ غالب صاحب آپ کا حساب چکتا کر کے جائیں گے۔

مسدّس لال اگر ڈھولک رام جی ذمے داری لیں تو میں جاتا ہوں۔

ڈھولک رام بالکل میری ذمے داری ہے۔ غالب صاحب کو آپ کا قرض چکائے بنا ہلنے بھی نہیں دیا جائے گا۔ (پروفیسر بے پر فضول کا داخل ہوتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

چھٹا منظر

تمام شاعر آچکے ہیں مشاعرے کی محفل جم چکی ہے۔ نظامت کے فرائض حقیر عذر صاحب انجام دینے والے ہیں۔ پیچھے بینر لگا ہے، جس پر لکھا ہے "ایک ملاقات مرزا غالب کے ساتھ۔"

حقیر عذر خواتین و حضرات آج ہمارے لئے یہ شام ایک یادگار شام ہے۔ آج ہمارے درمیان اردو کے سب سے بڑے اور عظیم شاعر مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب تشریف فرما ہے۔ جو اس غالب صدی کے موقع پر ملک عدم سے تشریف لائیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرزا غالب کا تالیوں سے استقبال کیا جائے۔

(تمام لوگ تالی بجاتے ہیں)

مرزا غالب مشاعرے میں تالیوں کا کیا کام۔ آپ نے تو جہالت کی حد کر دی۔ صاحبزادے یہ مشاعرہ ہو رہا ہے یا نوٹنکی کر رہے ہو۔ مشاعرے کی شان تو سبحان اللہ، واہ واہ، مکرر ارشاد، جیسے ادبی الفاظ ہوا کرتے تھے۔ مشاعرے سے تالیوں کا تعلق کب سے جڑ گیا۔

حقیر عذر آپ کے زمانے میں مشاعرہ عوامی نہیں تھا، درباری مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور درباری آداب ہی اس وقت رائج تھے۔ کل غزل میں صرف حسن و عشق کی باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن آج غزل کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔

مرزا غالب صاحبزادے! اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم

مشاعرے میں شریک رہیں تو آپ کو مشاعرے کے آدب کا لحاظ و پاس رکھنا ہوگا، اگر نہیں تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔

حقیر عذر میرے تمام شعرا حضرات اور باذوق سامع سے مودبانہ گزارش ہے کہ آداب مشاعرہ کا لحاظ و پاس رکھتے ہوئے کوئی تالی نہ بجائے۔صرف اچھے شعر پر واہ واہ سبحان اللہ کی صدائیں بلند کریں۔میں سب سے پہلے صاحب خانہ جناب ڈھولک رام جی کو اس محفل کے آغاز کے لئے بلانا چاہتا ہوں کیوں کہ وہ میزبان بھی ہیں اس لئے اس محفل کی ابتدا کرنا ان کا حق بھی ہے۔ڈھولک رام جی ڈائس پر تشریف لائیں اور اپنے تازہ کلام نوازیں۔

ڈھولک رام مرزا غالب کی مشہور غزل یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا کی زمین میں کچھ شعر نکالنے کی جسارت کی ہے۔صدر کی اجازت سے پیش کر رہا ہوں۔اسی مصرعے پر گرہ لگائی ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
شبِ وعدہ آ بھی جاتے تو ہمیں بخار ہوتا

(سبھی لوگ ایک ساتھ واہ واہ کرتے ہیں)

جی ذرہ نوازی شکریہ مہربانی۔۔۔۔غزل کا شعر پیش خدمت ہے۔

تری یاد میں مری جاں مرا حال اور کیا ہو
کبھی جاں مربہ بنتی، کبھی دل اچار ہوتا

(داد کا پھر ایک ریلا اٹھتا ہے)

یہاں سب مشاعروں میں جو ہمیں بلایا جاتا
مرے پاس ایک طبلہ ہے جو ستار ہوتا

حقیر عذر ڈھولک رام جی کیا کیا شعر فرما رہے ہیں۔آپ یہ آپ ہی کا حق ہے۔

ڈھولک رام غزل کا مقطعی عرض کر رہا ہوں۔

حقیر عذر جی پیش کریں۔

ڈھولک رام

ہم کو بھی خوب آتے پیغام حسینوں کے
اپنا اگر گدھوں میں ڈھولک شمار ہوتا

حقیر عذر یہ تھے صاحب خانہ مشہور غالبیے ڈھولک رام ڈھولک جنہوں نے بجا طور پر غالب کی زمین میں جدید لہجے کے شعر نکالے۔جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔اب میں دعوتِ کلام دینا چاہتا ہوں۔آج کے مشہور شاعر پروفیسر بے پر فضول کو جن کی غزل جدید ہوتے ہوئے بھی جدید نہیں ہے۔ان کی غزل کے شعر خود ان کو سمجھ نہیں آتے تو پھر دوسروں کو کیا سمجھ آئیں گے۔پھر بھی پروفیسری کا تمغہ ہونے کی وجہ سے یہ اردو رسالوں خوب چھپتے ہیں۔میری مراد ہیں پروفیسر بےؔ پرؔ فضول سے کہ وہ آئیں اور اپنے فضول کلام سے سامعین کو محظوظ فرمائیں۔

بےؔ پرؔ فضول غزل کا مطلع عرض ہے۔صدر صاحب کی اجازت سے۔

مفت کا قورمہ روٹی اگر کھانے لگ جائیں
سال دو سال کیا دو دن میں ٹھکانے لگ جائیں

مرزا غالب لاحول ولا قوت الہ بلاہ عظیم۔اماں صاحبزادے کس سے شرفِ تلمذ ہے آپ کو؟اس مطلع کو سن کر تو ہمیں متلی ہونے لگی ہے۔اس مطلع میں ایک بھی لفظ غزل کا نہیں ہے۔

ڈھولک رام مرزا جی دو سو برس میں غزل میں تبدیلی آئی ہے۔یہ مطلع اس تبدیلی کا امین ہے۔بے پر فضول کو آپ فضول نہ سمجھیں۔یہ آج کے دور کے مستند و معتبر شاعر ہیں۔

بےؔ پرؔ فضول

عظمتیں چوم لیں قدموں کو ہمارے بےؔ پرؔ
میرؔ و غالبؔ کے اگر شعر چرانے لگ جائیں

(سب طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی

ہیں)

مرزا غالب صاحبزادے یہ بھی کوئی شعر ہوا؟ اِسے ہمارے زمانے میں قافیہ پیمائی کہا جاتا تھا۔

بے پر فضول معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا مرزا جی۔! آپ نے اپنی عمر کا بہترین حصہ گلی قاسم جان میں گذارا مگر کسی شعر میں کبھی آپ نے گلی قاسم جن کا ذکر نہیں کیا۔ صرف فرضی باتیں کرتے رہے۔ آج کا شاعر حقیقت پسند ہے۔ آج ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ہے۔

مرزا غالب میاں کیوں زبان کا بیڑا غرق کر رہے ہو۔ آپ شاعر ہیں یا بکری کے بچے میں میں کر رہے ہو، نہ معنی آفرینی ہے، نہ محاورے کا چٹخارہ ہے، نہ روز مرّہ کی چاشنی۔۔۔ کیا آپ لوگ اسی کو شاعری کہتے ہو؟ موزوں کلام کو شاعری نہیں کہتے، تک بندی کہتے ہیں۔

حقیر عذر دو سو برس میں اُردو زبان سماجی سروکاروں سے جڑی ہے۔ اس نے نئے نئے الفاظ قبول کیے ہیں۔ آپ اِس تناظر اس شعر کو دیکھیں۔ ڈھولک رام ڈھولک نے اس شعر میں کھاری باؤلی کا ذکر کر کے شعر کو عظیم تر بنا دیا ہے۔

مرزا غالب ادب نہیں پھوہڑ پن ہے۔ میاں صاحبزادے آپ کو ادب تو ابھی چھو کر بھی نہیں گذرا۔ کسی بحر میں شعر موزوں کر لینا شاعری نہیں ہے جب تک شعر میں تخیل نہ ہو گہرائی اور گیرائی نہ ہو۔ اس کلام کو ہم شاعری کا نام نہیں دے سکتے۔

حقیر عذر میں اب آپ کے روبرو ایک ایسے عظیم شاعر کو پیش کر رہا ہوں جس نے اپنی شاعری اور پڑھنے کے منفرد انداز سے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔ جس کا شمار آج غزل کے صفِ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ میری مراد ہے، محترم جناب غارت اندوری سے۔ وہ آئیں اور اپنے مخصوص انداز میں ہمیں اپنے کلام سے محظوظ فرمائیں۔

غارت اندوری (مائیک پر اٹھ کر آتا ہے) یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آج اردو کے سب سے بڑے شاعر جن کا میں خود بھی مداح ہوں ان کے روبرو شعر پیش کرنے کی سعادت مل رہی ہے۔ صدر محترم کی اجازت سے ایک غزل کے چند شعر پیش کر رہا ہوں۔ مطلع دیکھیں عرض کرتا ہوں۔ (چیخ کر مطلع پڑھتا ہے)

یہ گھر کا پیس ہے کپڑے کا تھان تھوڑی ہے
یہ کان پور کی امراؤ جان تھوڑی ہے

(داد کا ایک طوفان اٹھتا ہے مگر مرزا غالب خاموش ہیں۔ سارے شاعر داد دے رہے ہیں)

حقیر عذر غارت صاحب آپ نے امراؤ جان کا قافیہ باندھ کر اس شعر کو لازوال بنا دیا۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ مکرر پڑھیں واہ واہ

غارت اندوری (دہراتا ہے)

یہ گھر کا پیس ہے کپڑے کا تھان تھوڑی ہے
ہماری بیوی ہے امراؤ جان تھوڑی ہے

توجہ طلب شعر۔

ہمیں خبر ہے ہمیں بے وقوف مت سمجھو
تمہارے دہن میں گٹکا ہے پان تھوڑی ہے

(ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں)

قہریار بھئی غارت صاحب واقعی غارت کر دیا اتنی عمدہ غزل پڑھ رہے ہو کہ داد نہیں دی جاتی۔ کیا کیا قافیے تلاش کیے ہیں۔

غارتؔ اندوری ذرہ نوازی آپ کی

مرزا غالب برخوردار ہم تو سمجھے تھے اردو غزل نے دو سو برس میں بہت ترقی کر لی ہوگی ۔ مگر آپ لوگ دن بدن غار میں اترتے جا رہے ہو ۔ آپ اسے شاعری کہتے ہو ۔ آپ اسے غزل کہتے ہو یہ تو غزل کے نام پر بدنما داغ ہے۔

ڈھولک رام مرزا جی آپ کے زمانے میں فارسی شرفا کی زبان ہوا کرتی تھی ۔ ایڈمنسٹریشن کی زبان بھی فارسی تھی، آج وہی مقام ہندی اور انگریزی کا ہے ۔ آج کی اردو غزل اگر اپنا رشتہ انگریزی اور ہندی سے مضبوط نہیں کرے گی تو اپنی موت آپ مرجائے گی۔

مرزا غالب میاں ڈھولک یہاں زبان کا مسئلہ نہیں ہے، غزل کے کنٹینٹ کا ہے آپ معنی اور مقصد کا ہے ۔ ایک دم بکواس غزل پر آپ لوگ سر دھن رہے ہو ۔ جسے میں ہزل کے خانے میں بھی نہیں ڈال سکتا۔

غارتؔ اندوری ڈائس پر بیٹھے میرے عزیز دوست اور ملکِ عدم سے تشریف ہمارے سب کے بزرگ شعر اعظم مرزا غالب صاحب میں اس شعر میں قافیے کی تلاش کی داد ضرور چاہوں گا۔

میاں یہاں پہ کوئی کوکروچ نہیں کھاتا

مرزا غالب (اٹھ جاتے ہیں ۔) برخوردار ڈھولک رام میں اور برداشت نہیں کر سکتا اس شاعری کو لاحول ولاقوت ۔ میاں آپ اسے شاعر کہتے ہو نہ یہ عقل سے شاعر لگتا ہے نہ شکل سے ۔ یہ غزل پڑھ رہا ہے یا غزل سے دشمنی نکال رہا ہے۔

غارتؔ اندوری میاں یہاں پہ کوئی کوکروچ نہیں کھاتا
پرانی دلّی ہے یہ تائیوان تھوڑی ہے
(ایک بار پھر داد کا ریلا اٹھتا ہے)

پولس نے جس کو اٹھایا ہے رات ڈیڑھ بجے
علیم بھائی کا لڑکا سبحان تھوڑی ہے

حقیرؔ عذر غارت بھائی پڑھے جاؤ کیا کیا شعر آپ پڑھ رہے ہو۔

غارتؔ اندوری آپ کی محبت ہے ۔ یہ شعر اُردو غزل کے لئے بالکل نیا ہے ۔ یہ مضمون صرف اُردو میں میں نے پہلی بار باندھا ہے۔

یہ چینئی ہے یہاں کھاؤ اڈلی اور ڈوسہ
یہاں نہاری نلی کی دکان تھوڑی ہے

مرزا غالب یہ کیا ہے؟ غزل میں نہاری نلی جیسے غیر فصیح اور بازاری الفاظ استعمال کر رہے ہیں اور یہ چینئی کس زبان کا لفظ ہے؟؟

بےؔ پرفضول مرزا جی دو سو برس میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ شہروں کے نام بدل گئے ، چینئی آپ کے زمانے میں مدراس ہوا کرتا تھا ۔ آپ کے زمانے میں جسے بامبے کہا جاتا تھا آج وہ ممبئی ہے ۔ رہی بات نہاری نلی کی ، وہ تو آپ کے زمانے میں بھی حویلی اعظم خاں میں بنا کرتی تھی ۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے دور میں شاہی باورچی نہاری بنایا کرتے تھے، آج کل بہاری باورچی نہاری بناتے ہیں۔

غارتؔ اندوری غزل کا آخری شعر عرض کرتا ہوں ؎

ہمارا دل جہاں چاہے گا سو تھوکیں گے
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

(سبھی لوگ مل کر داد دیتے ہیں، سبحان اللہ، مکرر، ارشاد کی صدائیں بلند ہوتی ہیں)

حقیرؔ عذر حضرات جیسا کہ میں نے کہا تھا آبروئے غزل آبروئے اُردو حضرت غارتؔ اندوری نے اپنی معنی خیز اور پر اثر پرفارمینس سے ایک طرح سے یہ مشاعرہ لوٹ لیا ۔ اب ان کے بعد میں اس

کشمکش میں ہوں کہ کس کی قربانی پیش کروں۔ میرے خیال میں اس قربانی کے لئے میں سب سے موزوں بکرا ہوں۔

ڈھولک رام مگر اسلام میں عیب دار بکرے کی قربانی حرام ہے۔

حقیر عذر جہاں تمام بکرے ہی عیب دار ہوں وہاں کم عیب والے کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ (اور اٹھ کر مائیک پر آجاتے ہیں) غزل کا مطلع عرض کرتا ہوں۔ مرزا صاحب آپ اپنے دور کے غالب تھے مگر مجھے اس دور کا غالب کہا جاتا ہے۔

مرزا غالب برخوردار شعر پڑھیں تقریر نہ کریں۔

حقیر عذر مطلع یوں کہا ہے۔ صدر صاحب اور سامع کی اجازت سے۔

کسی موسیقی کی دکان سے، نیا طبلہ اور ستار لوں
ابھی اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کے کپڑے اتار لوں

ڈھولک رام واہ واہ کیا جدت ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

مرزا غالب لاحول ولا قوت اللہ باللہ عظیم۔۔۔ یہ مطلع ہے مجھے تو اسے سن کر متلی ہونے لگی ہے۔ آپ لوگوں نے تو غزل کی شکل ہی بگاڑ کر رکھ دی۔

حقیر عذر ترے عشق میں کنفیوز ڈ ہوں، ترے واسطے مری جان جاں
میں کھلونے والی دکان سے کبھی سائیکل کبھی کار لوں

قہر یار میاں آپ اکیسویں صدی کے عظیم شاعر ہو۔ اس شعر کو پڑھے جاؤ!

(تمام لوگ جھوم جھوم کر داد دیتے ہیں)

حقیر عذر نوازش کرم مہربانی آپ کی سماعتوں کے نام یہ آخری شعر اور زحمتیں تمام۔

مرزا غالب میاں صاحبزادے اگر آپ ہمارے زمانے میں یہ غزل پڑھ رہے ہوتے تو آپ شہر بدر کر دیا جاتا۔ اس غزل کو تو میں ہزل کے خانے میں بھی نہیں رکھ سکتا۔

حقیر عذر غزل کا آخری شعر عرض کر رہا ہوں۔

یہ ہیں زندگی کی حقیقتیں، یہ رفاقتیں یہ محبتیں
تو چنے کی روٹی پکا ذرا میں ارڑ کی دال بھگار لوں

(ہر طرف سے داد تحسین کی آوازیں بلند ہوتی ہیں)

مرزا غالب برخوردار، پہلا مصرعہ تو پھر غنیمت ہے۔ مگر دوسرے میں تو آپ نے بیڑا غرق کر دیا۔

حقیر عذر اس سمع خراشی کے بعد میں اب میں جس شاعر کو دعوت سخن دینے جا رہا ہوں۔ اس کا مقام اُردو مشاعرے کی تاریخ میں جلی حرفوں میں لکھا جائے گا۔

مرزا غالب یہ مشاعرے کی کیا تاریخ ہوتی ہے۔ ادب کی تاریخ ہوتی ہے، زبان کی تاریخ ہوتی ہے۔ یہ کیا اول فول بک رہے ہو صاحبزادے۔

حقیر عذر مرزا صاحب یہ اٹھارویں صدی نہیں اکیسویں صدی ہے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا عہد ہے۔ اب غزل میں "ہیں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" کو کوئی نہیں سمجھتا۔ اب تو مشاعروں میں مقبول ہونے کے لئے ڈائریکٹ اپروچ کی شاعری کرنا پڑتی ہے۔

ڈھولک رام بالکل درست فرمایا ڈاکٹر صاحب۔

حقیر عذر تو میں عرض کر رہا تھا۔ حلیم بریلوی جو مشاعروں کی دنیا کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ پچھلے تیس سال سے انہیں ایسا ہی دیکھ رہے ہیں اور ایسے ہی سن رہے ہیں۔

حلیم بریلوی ایک مطلع سے اپنی بات شروع کرتا ہو۔ یہ میری

خوش نصیبی ہے کہ اردو کے سب سے بڑے اور عظیم شاعر مرزا غالب کے رو برو شعر پڑھ رہا ہوں۔ مطلع دیکھیں ؎

وہاں پہ ہم نہیں رہتے ، جہاں نہیں ہوتا
وگرنہ عشق کا مچھر کہاں نہیں ہوتا

حقیر عذر واہ واہ کیا مچھر کو استعارے کی شکل میں استعمال کیا ہے۔ حلیم صاحب یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

ڈھولک رام عشق کا مچھر شاید اُردو ادب میں پہلی بار ڈاکٹر حلیم بریلوی صاحب نے ہی اُردو غزل میں استعمال کیا ہے۔

قہریار بھئی بے پناہ مطلع ہے۔ پھر عطا کریں۔

حلیم بریلوی
وہاں پہ ہم نہیں رہتے ، جہاں نہیں ہوتا
وگرنہ عشق کا مچھر کہاں نہیں ہوتا

شعر عرض ہے اگر کچھ نئی بات ہوگئی ہو تو ضرور داد سے نوازیں۔

ہدف نہ پار ہو جب تک چہار بیوی کا
وہ بے وقوف مکمل میاں نہیں ہوتا

(دادو تحسین کی آوازیں بلند ہوتی ہیں مگر غالب اپنے سر کو پکڑ لیتے ہیں)

ڈھولک رام مکمل میاں نے شعر بنادیا۔ جیتے رہو کیا کیا شعر پڑھ رہے ہو، پڑھتے رہو۔

حلیم بریلوی
کرائے دار ہی رہتا ہے عمر بھر یارو
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

(تمام لوگ داد سے نواز رہے ہیں)

مرزا غالب اگر آپ اسی کو ترقی کہتے ہیں، اسی کو غزل کہتے ہیں تو ہمارا پرانا دور لاکھ درجے بہتر تھا۔ آپ نے غزل کو ہزل کے دائرے میں لا کر رکھ دیا ہے۔ کیا بے ہودہ شاعری ہو رہی ہے اور آپ لوگ ان متشاعروں کو داد سے نواز رہے ہیں۔ ارے میں تو انہیں شاعر ہی ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

حلیم بریلوی مقطع عرض کر رہا ہوں ملاحظہ کریں ؎

حلیم چاند پر جب تک نہ عاشقوں کو پڑے
کسی حسین کا جوتا رواں نہیں ہوتا

(ہر طرف سے داد کا شور اٹھتا ہے)

حقیر عذر واہ واہ کسی حسین کا جوتا رواں نہیں ہوتا کیا تخئیل ہے۔ حلیم بریلوی صاحب کا اپنا انداز ہے۔ اب میں صاحب اعزاز ہمارے سب کے محترم ملک عدم سے تشریف فرما مرزا غالب جو اب مسٹر غالب بن چکے ہیں۔ ان کو بہت ادب و احترام سے دعوت سخن دیتا ہوں وہ آئیں اور اپنے کلام سے حاضرین کو نوازیں۔

مرزا غالب (مائیک پر آتے ہیں) ہم نے محسوس کیا ان دوسو برسوں میں بہت کچھ بدل گیا ہے ۔ہمارے زمانے میں یہ مائیک وغیرہ نہیں ہوا کرتے تھے ۔تالیوں کو بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مشاعرے صرف رئیسوں کی حویلیوں یا بادشاہ کے دربار میں ہوا کرتے تھے ۔اب مشاعرہ بازاری ہوگیا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ مشاعرے باز شاعر الگ ہیں اور ادبی شاعر الگ ہوتے ہیں۔

ایک آواز تقریر مت کر شعر سنا شعر۔۔۔

حقیر عذر آپ خاموش بیٹھیں، ہمارے بہت معزز مہمان ہیں غالب صاحب!

وہی آواز میں نے کون سی بری بات کہدی جو اتنا بدک رہے ہو شعر ہی سنانے کو تو کہا ہے۔ یہ تو اتنی دیر سے تقریر کئے جارہا ہے۔

ڈھولک رام اگر آپ کو پریشانی ہے تو آپ تشریف لے جائیے یہاں سے آپ اپنے مہمان کی عزت بھی نہیں کر سکتے۔ جی محترم ارشاد کریں۔

مرزا غالب میں شعر عرض کرتا ہوں ۔

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(ایک دم ساؤنڈ سسٹم سے نے سامع کی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی)

غارتؔ اندوری غالب صاحب اگر گستاخی نہ سمجھیں تو کچھ عرض کروں۔

مرزا غالب جی فرمائیں برخوردار

غارتؔ اندوری آپ کے اس شعر میں معنی کی ترسیل نہیں ہو پائی ،دوسری بات اس میں بڑا فنی سقم یہ ہے کہ پہلا مصرعہ آپ کا واحد ہے اور دوسرا مصرعہ جمع کے صیغے میں جا رہا ہے۔عشق نے غالب نکما کر دیا دوسرے مصرعے میں آپ فرما رہے ہیں ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔پھر آپ کس کام کے آدمی تھے یہ بھی شعر سے کہیں سے کہیں تک پتہ نہیں چلتا۔

قہریار صحیح پکڑے ہیں غارت صاحب!

مرزا غالب یہ شاعری ہے نثر نہیں ہے جس میں ہر بات کا خلاصہ کیا جائے۔آپ کو کس نے شاعری کی سند دیدی ،آپ تو ابھی ٹھیک سے شعر فہم سامع بھی نہیں ہیں۔ویسے آپ کے خیال سے یہ شعر کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔

غارتؔ اندوری

عشق نے مجھ کو نکما کر دیا
ورنہ میں بھی آدمی تھا کام کا

(چاروں طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں)

حقیر عذر کچھ اور عرض کریں استاد!

مرزا غالب غزل کا مطلع عرض ہے ۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(سب طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں)

حلیم بریلوی معافی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں استادِ محترم اگر اجازت ہو۔

مرزا غالب پوچھیے برخوردار اجازت ہے۔

حلیم بریلوی آپ مصرعہ اولیٰ میں فرماتے ہیں کہ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔یعنی آپ کو علم نہیں ہے کہ نادان دل کو کیا مرض ہے ،لیکن مصرعہ ثانی میں آپ کہتے کہ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔یعنی آپ کو علم ہے کہ دل میں درد ہے۔جس کی آپ دوا معلوم کرنا چاہتے ہیں ۔ دوا آپ کس سے معلوم کر رہے ہیں حکیم سے ڈاکٹر سے یا اپنے کسی یار دوست سے یہ بھی شعر میں کوئی خلاصہ نہیں ہوتا۔میرے خیال میں یہ شعر ایک دم مہمل ہے۔

(غالب اِس تشریح پر اپنا سر پیٹ لیتے ہیں)

لڈّن یہ مسائرہ کب ختم ہوگا ۔ مجھے اس ٹوپی والے سائر سے نہاری کے پیسے وصول کرنے ہیں۔

ڈھولک رام اماں لڈّن بھائی آپ کے مرزا غالب پر کون سے پیسے بقایا ہیں۔

لڈّن اماں ڈھولک رام جی ہمارے ابّا کے ابّا ابّا کے ابّا ابّا کے ابّا کی ڈائری میں تین ٹکے تین نہاری کے مرزا کے نام لکھے ہوئے ہیں۔اٹھارہ سو ستاون کے تین ٹکے آج کے تو کروڑوں بیٹھیں گے۔ کوئی ان کے ملنے والے میر مہدی مجروحؔ یہ ادھار لے کر گئے تھے۔

ڈھولک رام مرزا جی آپ نے ادھار کا ذکر خود اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔گزارش بہ حضور شاہ میں کیا ہے۔

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر کھاؤں ادھار

اس نظم سے یہ ثابت ہے کہ آپ پر بازار کا قرض تھا، جسے آپ کو چکتا کرنا چاہیئے۔

باربر ہاں میرے لکڑ دادا کی گلی قاسم جان میں باربر کی دکان تھی ان کے بھی ضرور ان پہ بال کٹانے کے پیسے ہوں گے، میرے پیسے بھی ملنے چاہئیں۔

دھوبی ہمارا بھی بلّی ماران میں لونڈری کا خاندانی کام ہے۔ مرزا غالب کی اچکن ہماری دکان پر ہی دھلا کرتی تھی۔ اِن کے نام ساڑھے چار ٹکے لکھے ہوئے ہیں۔

(پولس انسپکٹر داخل ہوتا ہے)

انسپکٹر ہمیں خبر ملی ہے یہاں غالب کا بھیس بدل کر پاکستانی جاسوس آیا ہوا ہے۔ ہمارے پاس اس کے گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ تم میں سے کون ہے مرزا غالب جلدی بولو اگر ہم نے خود ڈھونڈھ کر نکالا تو بہت برا ہوگا۔

ڈھولک رام (غالب کے پاس انسپکٹر کو لے جا کر) صاحب یہ ہے وہ بہروپیا۔۔۔ اِس نے غالب کے چار شعر یاد کر رکھے ہیں اور اپنے آپ کو غالب کہتا ہے۔

انسپکٹر ہمارے پاس اس کے خلاف پختہ ثبوت ہیں یہ آئی ایس آئی کا پاکستانی ایجینٹ ہے۔ اوئے گھڑی دکھا اپنی (غالب کلائی سے گھڑی کھول کر دیتا ہے) یہ دیکھو۔۔۔ اِس گھڑی پر ”آئی ایس آئی مارکہ“ لگا ہے۔

باربر صاب اس کو مت چھوڑنا یہ دوسو سال سے ہمارے لکڑ دادا کے ساڑھے چار ٹکے لیکر بھاگا ہوا ہے۔

انسپکٹر اب تو اس کے ٹھاٹ ہی الگ ہیں، انگلی میں ہیرے کی انگوٹھیاں چمک رہی ہیں۔ یہ شیروانی بھی سونے کے تار کی بنی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں چین بھی سوگرام سونے سے کم نہیں ہے۔

(اتنا سنتے ہی ساری پبلک غالب سے لپٹ جاتی ہے اور اس کا لباس، اس کی انگوٹھیاں، اس کی چین سب کچھ چھین لیتی ہے، لباس تار تار ہو جاتا ہے، ساری پبلک غالب سے شہد کی مکھیوں کی طرح لپٹ جاتی ہے اور انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ اسی بھیڑ میں مرزا غالب غائب ہو جاتے ہیں)

(بیک گراؤنڈ سے آواز ابھرتی ہے)

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

(انسپکٹر پبلک کو غالب سے چھڑانے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو وہاں غالب نہیں ہوتے، مسٹر غالب غائب ہو چکے ہوتے ہیں)

(صحافیوں کا داخلہ، ای ٹی وی اردو، ڈی ڈی اردو، اور اے این آئی کے نمائندے کیمرے اور مائیک لیکر مرزا غالب کا انتظار کر رہے ہیں)

ایک نمائندہ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی دوسو برس بعد دوبارہ دنیا میں واپس آ جائے۔

دوسرا نمائندہ یہ اکیسویں صدی ہے اس میں سب کچھ ممکن ہے۔

تیسرا نمائندہ آپ کیسے آئی ڈینٹی فائی کریں گے کہ جس شخص کو یہ غالب بنا کر پیش کر رہے ہیں وہ وہی غالب ہے جس پر گلزار نے سیریل اور سہراب مودی نے مرزا غالب فلم بنائی تھی۔ کسی کو بھی غالب کے گٹ اپ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس میں کونسی بڑی بات ہے۔

(عین اسی اثناء میں اسٹیج پر پروفیسر قہریار نمودار ہوتے ہیں)

قہریار عزیز دوستو انتظار کے لمحے اب ختم ہوا چاہتے ہیں ۔آپ کے اور ہمارے سب کے چہیتے شاعر اعظم مرزا غالب اب کچھ ہی لمحوں میں آپ کے درمیان ہوں گے ۔جشنِ غالبؔ کے اس مبارک موقع پر آپ ملکِ عدم سے یعنی دوسری دنیا جسے ہندی میں پرلوک کہا جاتا ہے، اِس عالم فانی میں تشریف لائے ہیں۔

(تب ہی مرزا غالب جینس اور رنگ برنگی ٹی شرٹ میں نمودار ہوتے ہیں)

ڈھولک رام دوستو آج ہمارے لئے بہت مسرت کا مقام ہے کہ وہ غالب جس کی تصویریں ہم نے کتابوں میں دیکھیں جس کی زندگی پر ہم ٹی وی سیریل بنائے ،فلمیں بنائیں وہ عظیم شخصیت بہ نفسِ نفیس ہمارے درمیان موجود ہے۔

ایک صحافی ہم کیسے یقین کریں کہ جس شخص کو آپ مرزا غالب بنا کر ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں، وہ اصلی مرزا غالب ہیں۔

ڈھولک رام یہ جانکاری آپ گورنمنٹ آف انڈیا کے ودیش منترالیہ سے حاصل کر سکتے ہیں، کہ مرزا غالب کو پرلوک سے مرتیولوک میں آنے کا ویزا جس شخص کو دیا گیا ہے وہ یہی شخص ہے یا کوئی اور۔

دوسرا صحافی غالب صاحب آپ دوسو سال بعد دوبارہ دنیا میں تشریف لائے ہیں، آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟

مرزا غالب میاں صاحبزادے یہ کوئی سوال ہوا، دوسو برس بعد آج ان گلیوں میں واپسی ہوئی ہے جہاں ہم نے اپنی زندگی کا سنہری دور گذارا، جہاں ہمارے یار غار دوست حریف شاعر نا شاعر کونسی یاد ہے جوان گلیوں سے وابستہ نہیں ہے ۔میں کیسے اس بات کو بھول سکتا ہوں کہ مجھے دوسو برس بعد بھی آپ لوگوں نے یاد رکھا ورنہ بہت سے لوگوں کو تو قبر کی مٹی سوکھنے سے پہلے بھلا دیا جاتا ہے۔

ایک صحافی آپ نے کہا تھا کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اب تو آپ کو جنت اور دوزخ کی حقیقت معلوم ہو چکی ہوگی۔

مرزا غالب دنیا میں ہمارے کارنامے ایسے نہیں تھے کہ ہمیں جنت ملتی مگر ہماری شاعری نے ہمیں بچا لیا۔بادہ خواری پہ شرمندگی نے سارے گناہ دھو دیئے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو بچ رہے تھے عرقِ انفعال کے

(پردہ گرتا ہے)

برباد دسمبر میں مری خاک بہت ہے
آنکھوں کی طرح ناک بھی نمناک بہت ہے
نوید ظفر کیانی

محمد عارف

جولیاں، انار کی یخنی اور فارم ہاؤس

ہم "جولیاں" کی گلیوں میں بھٹک رہے ہیں، گلیاں ایسی ہیں کہ موٹر سائیکل اور سائیکل کے علاوہ گھوڑے، گدھے ہی جا سکتے ہیں کہ بعض مقامات پر انجینئر نے گلی سے گزرنے والی ڈیڑھ دو فٹ چوڑی اور اس سے کہیں زیادہ گہری نالی کو اس طرح پھیر دیا ہے کہ نالی وسط کے بجائے دائیں بائیں لہراتی جاتی ہے، یقیناً انجینئر، یو۔ای۔ٹی ٹیکسلا کا فارغ التحصیل ہوگا۔ اس وقت اسی انجینئر کا بھائی بند اور یو۔ای۔ٹی ٹیکسلا کا استاد میرے ہمراہ ہے، زوہیب حسن نقوی، جو بیک وقت یو۔ای۔ٹی میں استاد بھی ہے اور پی۔ایچ۔ڈی کا طالب علم بھی۔

"اوئے بات سن!"

"جی عارف بھائی!!"

"تم اس سے پہلے جولیاں آئے ہو؟"

"نہیں عارف بھائی!"

"پھر تیس برس سے ٹیکسلا میں کیا جھک مار رہے ہو؟"

"ٹھہریں! میں اس شاپ سے پتا کرتا ہوں۔۔۔ چاکلیٹ کھائیں گے؟"

"نہیں، پینے کے لیے کچھ لے لو اور پہلے اس سے یہ پتا کرو جولیاں کے کھنڈرات کدھر ہیں۔"

جونہی موصوف نے دکان دار سے سوال کیا، جواب آیا" لہجے سے تو آپ مقامی لگتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ ہوں تو مقامی۔۔۔ لیکن باہر کم کم نکلتا ہوں۔"

یہاں سے ایک کلو میٹر پیچھے نکڑ آس پمپ سے بائیں ہاتھ مڑ جائیں سیدھا جولیاں پہنچ جائیں گے۔

باہر خان پور روڈ پر آئے تو سامنے چپل کباب کے چند کھوکھے نظر آئے۔

"کباب کھاتے ہیں، ادھر چپل کباب، بہت اچھے ملتے ہیں۔"

"کہاں سے اچھے ملتے ہیں؟" میں نے تین چار دکانوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تو موصوف گویا ہوئے" پچھلی مرتبہ تو شاید ادھر سے اچھے ملے تھے۔"

اب ہم اس کھوکھے پر بیٹھے جولیاں سے خریدے گئے جوس سے

لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں جس کے سامنے والے کھوکھے پر ''جولیاں فوڈ سٹریٹ'' کا بورڈ دعوتِ تبسم دے رہا ہے، پہلا سپ لیتے ہی میں نے زوہیب کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر اپنے چہرے جیسے تاثرات پائے، ''یار اس جُوس کا ذائقہ کیسا ہے؟ عارف بھائی یوں لگتا ہے جیسے انار کا جوس نہیں، انار کی یخنی ہو۔۔۔اور اب ہم انار کی یخنی نوشِ جاں کرتے ہیں۔''

کباب آ گئے لیکن روٹی نہ آئی کہ تنور بجھ چکا ہے لیکن کچھ دیر بعد اسی بجھے تنور سے کچی پکی اور کہیں کہیں سے کڑکڑاتی روٹیاں سپلائی ہونا شروع ہوتی ہیں اور ہم نپٹتے جاتے ہیں۔تنور پر موجود لڑکا روٹی لگانے کے بعد تنور کو ڈھک دیتا ہے، ہمارے آواز لگانے کے بعد بھی وہ چند لمحے انتظار کر کے تنور کے منہ سے دھاتی چادر کا گول ٹکڑا اُٹھاتا، روٹی اُتارتا اور جتنی دیر تک وہ اگلی روٹی اُتارتا ہم پہلی معدے میں اُتار چکے ہوتے۔آخری روٹی کے چند نوالے باقی تھے کہ قہوے کا آرڈر دیا گیا جسے دوسری طرف چائے کا آرڈر سمجھا گیا۔۔۔کافی دیر تک جب قہوہ نہ آیا تو ہم اُٹھ کھڑے ہوئے تو پتا چلا کہ ایک ہی پتیلی ہے جس میں عام طور پر چائے ہی بنتی ہے قہوے کی فرمائش پر اسے دھونا پڑتا ہے۔۔۔اب پتیلی نہا دھو کر چولھے پر چڑھ چکی ہے لیکن کالے بادلوں کے تیور دیکھ کر ہم بغیر قہوہ پیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

جب خان پور روڈ چھوڑ کر نکڑ آں پمپ (کیسا عجیب نام ہے) سے جولیاں کے کھنڈرات کی طرف مڑے، اس چھوٹی روڈ کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیت ہیں اور پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلتی ایک نہر۔

''عارف بھائی ادھر زمین سستی ہوگی، میرا دل کرتا ہے کہ ادھر زمین لے کر فارم ہاؤس بنایا جائے۔''

''ہاں ٹھیک ہے لے لو اور فارم ہاؤس بھی بنالو۔۔۔''

ایک قہقہہ سنائی دیا۔راستے میں ایک جگہ سے رہنمائی لی اور ہم ایک موڑ مڑ کر مطلوبہ جگہ پہنچ گئے جہاں سے آگے پہاڑ کے ٹاپ تک سیڑھیاں جاتی ہیں۔ہم بائیک یہاں موجود اکلوتے گفٹ شاپ ٹائپ کھوکھے کی بغل میں لاک کر کے ایک اچٹتی سی نظر اس شاپ کے آئٹمز پر ڈالتے زینہ بہ زینہ ہو گئے۔یونی ورسٹی سے ڈائریکٹ آنے کی وجہ سے لیپ ٹاپ زوہیب کے پاس تھا جسے اس نے کمر پر کس لیا۔خراماں خراماں اُوپر اُٹھتے گئے آدھی سیڑھیاں چڑھ کر ایک جگہ ستائے اور اس بات پر غور کیا کہ اکثر زیارات و مقدسات پہاڑوں کی چوٹی پر ہی کیوں ہوتے ہیں اور یہی سوچتے سوچتے جولیاں کھنڈرات تک پہنچ گئے، سامنے ایک پھاٹک ہے جو بند ہے، اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی دکھائی نہ دیا تو اس پھاٹک پر لگا ہُک ہٹا کر اندر داخل ہو گئے، اندر شدید خاموشی نے استقبال کیا، خاموشی اور اکلاپا اس قدر تھا کہ خوف محسوس ہوا، اس بے پناہ خاموشی اور خوف کو بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک نے توڑا ۔۔۔یہاں ایک بڑا اسٹوپا ہے، جس کے گرد کئی چھوٹے سٹوپے اور بدھا کے مجسمے ہیں، جن کا موٹی جالی جو لکڑی کے ستونوں میں پروئی ہے، سے احاطہ کیا گیا ہے، چھت ٹین کی ہے، جس پر اب بارش کی بوندوں نے جلترنگ بجانا شروع کر دی ہے۔دائیں طرف چار چھ فٹ چوڑے ایک تنگ سے کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہے، جس کی پائنتی ایک لوئی پڑی ہے۔چارپائی کے سامنے کی دیوار پر بدھا کے مجسمے کے مٹے مٹے آثار یہ بتاتے ہیں کہ یہ چھوٹا کمرہ جو اب آرام گاہ ہے، کبھی عبادت گاہ رہا ہے۔ہم سٹوپے، مجسموں اور یادگاروں کو جالیوں سے دیکھتے ہیں اور اس در کو بھی دیکھتے ہیں، جس پر پرانے زمانے کا ایک قفل پڑا ہے۔سوچا کیوں نہ جانے سے قبل اس احاطے کا چکر ہی لگا لیا جائے، دائیں طرف سے اس کام کا آغاز کیا تو اس دیوار کے اختتام پر ایک کمرے کے باہر

ضمیر جعفری جن دنوں سٹیلائٹ ٹاؤن میں رہتے تھے۔ایک جیسے مکانوں کے نقشے کی وجہ سے ایک شام بھول کر کسی اور کے دروازے پر دستک دے بیٹھے۔دروازہ کھلنے پر دوسری عورت کو دیکھ کر جعفری صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔فوراً واپس پلٹے۔اس فعل کا ذکر جب جعفری صاحب نے ایک دوست کیا تو اس نے سوال کیا ''جعفری صاحب، آپ کو غلط گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے پر شرمندگی نہیں ہوئی؟''

''مجھے اس فعل پر تو کوئی شرمندگی نہیں ہوئی، لیکن یہ دیکھ کر ضرور تکلیف ہوئی کہ دروازہ کھولنے والی عورت میری بیوی سے بھی بدصورت تھی۔'' جعفری صاحب نے جواب دیا۔

ایک بزرگ دیکھے جو آری سے لکڑی کاٹنے میں مصروف تھے اور اس قدر منہمک تھے جیسے صدیوں سے اسی کار پر معمور ہوں، سلام کا جواب دینے کے بعد گویا ہوئے ''آپ اُوپر ''یونی ورسٹی'' دیکھ آئیں، میں آتا ہوں۔''

ہم کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے الٹے قدموں پھر کر اس سٹوپے کے سامنے سے ہوتے ایک اور بے پناہ خاموشی میں غوطہ زن ہو گئے۔

یہاں پتھر ہی پتھر ہیں، خاموش پتھر، جو صدیوں سے گُم صم ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں صرف قوتِ گویائی نہیں۔۔۔

بہت نیچے ٹیکسلا ہے اور اُوپر آسمان کی پنہائیاں ہیں، گنبدِ نیلگوں آج واقعی نیلگوں ہے کہ پچھلے کئی دنوں کی مسلسل بارش سے آسمان اور فضا دُھل دُھلا کے اپنے رنگ میں رنگ چکے ہیں۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر بائیں ہاتھ ایک کمرہ ہے جس میں بدھا کی کئی خاص مُورتیاں تھیں جنھیں اب ٹیکسلا میوزیم میں شفٹ کر دیا گیا ہے اور اب اس جگہ ان مُورتیوں کی نقول موجود ہیں، سامنے کئی گز لمبا چوڑا ایک مربع شکل کا احاطہ ہے جس کی چوڑی دیوار میں گونگے پتھروں سے بنے چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جو صحن سے اڑھائی تین فٹ بلند اور روشن و ہوادار ہیں لیکن ہیں بالکل گم صم، ان کے سامنے چوڑی روشیں ہیں جن سے آگے کبھی ایک تالاب تھا، جو اب مٹی سے بھر بھرا کے تقریباً برابر ہو گیا ہے۔ اب اس تالاب میں کتاب کی صورت کھلی، روسٹرم اسٹائل میں دو دھاتی تختیوں پر اس جگہ کی مختصر تاریخ کندہ ہے، ان دو روسٹرم کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ آدمی با آسانی گزر سکتا ہے یا بیک وقت دونوں پر کہنیاں ٹکا کر کھڑا ہو سکتا ہے، اس شخص کو بے ساختہ داد دینے کا خیال آیا جس نے ان دھاتی تختیوں کو یہ وضع دے کر اس جگہ کو ''لیکچر ہال'' کی سی صورت دے دی ہے۔ میری چشمِ تصور اس قدیم درس گاہ کے اس لیکچر ہال میں اُس دور کے استاد کو دیکھ رہی ہے جو ایک خاص گاؤن میں ملبوس اپنے شاگردوں سے محوِ کلام ہے اور شاگرد دھونی رمائے، بُدھ آسن میں ہمہ تن گوش ہیں بالکل ایسے جیسے یہ پتھر۔۔۔

بارش کا ایک زوردار چھینٹا پڑا تو ہم نے بھیگتے بھیگتے چند تصویریں لیں اور بھاگم بھاگ اس چھوٹے کمرے میں پہنچے جہاں ایک چارپائی پر موجود لوئی اب موجود نہیں تھی۔ سامنے پھاٹک کے درمیان بڑے

ایک ترقی پسند شاعر جو شراب کے بے حد رسیا تھے، فراق گورکھپوری صاحب کے گھر پہنچے اور پریشان حال صورت بنا کر بولے ''فراق صاحب! بات عزت پر آ گئی ہے میں بہت پریشان ہوں۔ کسی طرح تیس روپیہ ادھار دے دیجئے۔''

فراق صاحب کچھ کہنے والے تھے کہ وہ بولے ''دیکھئے انکار نہ کیجئے گا، میری آبرو خطرے میں ہے۔''

فراق صاحب نے تیس روپے ان کے حوالے کر دیئے اور وہ روپیہ پاتے ہی فوراً فراق صاحب سے رخصت ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد فراق صاحب کے گھر کے سامنے ایک تانگہ آ کر رکا اور اس میں سے وہی شاعر برآمد ہوئے اور آتے ہی فراق صاحب سے کہنے لگے ''آپ فوراً اس تانگہ میں بیٹھ جایئے۔''

''آرے بھائی معاملہ کیا ہے؟'' زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے فراق صاحب تانگہ میں بیٹھ گئے۔ تانگہ سیدھا ایک شراب خانہ پر پہنچا جہاں فراق صاحب کی خاطر تواضع انہیں کے روپوں سے کی گئی۔ شراب و کباب کے دور کے بعد ان کو اسی تانگہ میں بٹھا کر واپس ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔

دوسرے دن فراق صاحب نے ایک قریبی دوست سے بڑے مصیبت زدہ لہجے میں شکوہ کیا ''میرے تیس روپے گئے صاحب! میں کس منہ سے اس مانگوں گا۔ وہ سب تو اُس نے میرے ہی اوپر خرچ کر دیئے۔''

میاں کھڑے شاید ہمیں نیچے وادی کی طرف دیکھ رہے تھے، ہماری بھاگ دوڑ کی آواز سے پلٹے، جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور چپ چاپ جالی کے دروازے میں لگا، قفل کھول کر اندر داخل ہو گئے، ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔۔۔

''آپ کو ڈر نہیں لگتا؟''

''نہیں!'' اس کے جواب سے یوں لگا جیسے ہر آنے والا اس سے یہ سوال ضرور پوچھتا ہوگا۔

''کتنا عرصہ ہو گیا ہے ادھر؟''

''تیس سال''

''آپ کتنے آدمی ہوتے ہیں ڈیوٹی پر؟''

الٰہ آباد یونیورسٹی میں کچھ لوگ فراق اور ڈاکٹر امرناتھ جھا کو لڑانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ایک بار ایک محفل میں فراق اور جھا دونوں موجود تھے۔ دونوں کو تقریر بھی کرنا تھا۔ انگلش ڈپارٹمنٹ کے ایک لکچرر نے جس کی مستقلی کا معاملہ زیرِ غور تھا، کہنا شروع کیا کہ فراق صاحب اپنے کو کیا سمجھتے ہیں، ڈاکٹر جھا ان سے زیادہ انگریزی، اردو نیز ہندی جانتے ہیں۔ فراق صاحب نے کھڑے ہو کر کہا ''بھائی، میں جھا صاحب کو ایک زمانے سے جانتا ہوں۔ ان کو اپنی جھوٹی تعریف قطعاً پسند نہیں ہے۔''

''دو''

''بارہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے ایک بندہ دن کو ایک رات کو۔'' یہ پہلی بات تھی جو اس شخص نے بنا پوچھے بتائی۔

''کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو؟''

''کبھی کچھ نہیں ہوا، یہ بہت اچھی اور پُرسکون جگہ ہے۔''

اندر پہنچے تو باباجی رواں ہو گئے، بڑے سٹوپے کے دائیں طرف موجود بُدھا کے مجسمے کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ یہ بُدھ کی انتہائی مقدس مُورتی ہے، بدھ مت کے پیروکاروں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس مُورتی کی ناف میں انگلی رکھ کر مانگی جانے والی ہر دعا پوری ہوتی ہے، اسے شفا بخش بُدھا بھی کہتے ہیں۔ چھوٹے بڑے سٹوپے دیکھتے، دکھاتے، تصویریں بناتے، بنواتے بڑے اسٹوپا کی بغل سے ہوتے اس کے عقب میں پہنچ گئے۔ یہاں بُدھا کے خاص آسن میں دو بڑے لیکن تباہ حال بُت بھی موجود ہیں، چھوٹے سٹوپوں کے پتھروں پر کھدائی سے مختلف مناظر بہت واضح ہیں۔ بڑے اسٹوپا کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا اسٹوپا ہے، جس پر بدھ کا ایک مجسمہ تقریباً اصل اور محفوظ حالت میں دیکھا جا سکتا ہے اور شاید یہی مجسمہ جولیاں میں موجود اس وقت کے مجسموں میں مکمل بھی ہے۔ بڑے سٹوپے کی چوتھی طرف ایک لائن میں پانچ مجسمے ایستادہ ہیں، جن میں سے صرف درمیان والا مجسمہ اصلی ہے، باقی چاروں تزئین و آرائش کے دوران بنائے گئے۔ چوتھی سمت سے گھوم کر پھر سامنے پہنچے اور اوپر جاتی قدیم سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے بڑے اسٹوپا کے اوپر پہنچ گئے، چھت اور جالی دار دیواروں کے درمیان فاصلہ ہے کہ چھت لکڑی کے ستونوں پر کھڑی ہے یہاں سے ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ٹیکسلا شہر اور گرد و نواح کا خوب نظارہ ہو رہا تھا۔ نیچے اُترے اور پھر اُترتے چلے گئے۔۔۔ نہر پر موجود پُل پر رُکے تو بارش بھی مکمل طور پر رُک چکی تھی، سامنے کے پہاڑ کی ایک پگڈنڈی پر ریوڑ کی بھیڑیں تنگ رستہ ہونے کے باعث قطار میں چلتی پہاڑ کی دوسری طرف سورج کی طرح گم ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔

''یہاں بھی زمین سستی ہو گی، میں ادھر بھی فارم ہاؤس بناؤں گا۔'' زوہیب نے بیساختہ کہا۔ اب کے میری ہنسی نکلی۔

''عارف بھائی! دیکھیے گا زوہیب ایک دن اس مُلک کا صدر ہو گا۔۔۔''

''ہوسکتا ہے بھائی، کیوں نہیں ہوسکتا، یہی ایک عہدہ ہے، جس کے لیے واحد قابلیت ساٹھ سالہ ہونا ہے۔۔۔''

نیچے پہنچ کر کھوکھے والے کو چائے کا بولا، وہ مسکرایا تو میں سمجھا کہ گا دودھ نہیں ہے لیکن اس نے کہا ''صاب سیلنڈر میں گیس ختم ہو گئی ہے۔'' ہم مسکرا کر اُٹھ دیے بائیک اسٹارٹ کی اور واپسی کی راہ لی۔ خان پور روڈ پر ایک ڈرائیور ہوٹل پر رُکے، چائے آئی تو ساتھ بسکٹ طلب کیے۔ بیرے نے شیشے کے ایک مرتبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''صرف یہ فروٹ کیک پیس ہیں۔'' کیک کے پہلے ہی بائٹ نے بتا دیا کہ یہ انارکی اسی یخنی میں تیار کیا گیا ہے جسے آج ہم نے نوش فرمایا ہے۔۔۔ یہاں سے اُٹھے تو ٹیکسلا کے مضافات میں داخل ہو گئے، علاقہ کچھ دیکھا بھالا لگا تو زوہیب سے پوچھا ''یہ کون سی جگہ ہے اور آپ کے گھر سے کتنی دور ہے؟''

''گھر سے تو کافی دُور ہے، کیوں، کیا ہوا؟''

''ایک رات کا ذکر ہے، بلکہ ایک آدھی رات کا ذکر ہے تمھیں گھر ڈراپ کرنے کے بعد میں رات کو سمت کھو بیٹھا اور ادھر آ نکلا اور کافی دیر بھٹکنے کے بعد راہ راست پر آیا اور اس سے پہلے کہ رات آئے، ہمیں گھر پہنچنا چاہیے اور یہاں ادھر زمین کا کیا ریٹ ہو گا؟''

''کیوں خیریت؟''

''میں فارم ہاؤس نہ بناؤں۔''

اب کے ایک مشترکہ قہقہہ فضا میں گونجا!

سفر وسیلۂ ظفر

پے گئی اے ٹھنڈ؟

ذہین احمق آبادی

جیسا کہ بتایا تھا کہ ہم "سیف الملوک" گئے تھے اور اُدھر قیام بھی کیا تھا چھوٹی سی خیمی میں۔۔۔وہ بھی عاریتاً۔۔۔جب چلت پھرت کے دوران ترشح شروع ہوا تو ہم خیمہ کی طرف بھاگے اور پھر جو بارش شروع ہوئی ہے تو کم وبیش آدھے گھنٹے کی خبر لی اس نے۔۔۔ سارے "سیاح" جس میں کچھ بزعمِ خود ہماری مانند شاعر بھی رہے ہوں گے اور برستے ابر کی نکہت وندرت کے بیان میں دیوان کے دیوان بہائے ہوں گے، سے وہ بارش نہ سہاری جاسکی گویا "بارش" کوئی نصیحت گو "بارِیش" رہی ہو۔۔۔ دامن نچوڑ دیں تو بس پھر وہ پانی استنجے کے ہی کام آسکے۔۔۔ خیر۔۔۔ بارش جو تھمی تو باہر آئے۔ بارش نے جو نقصان پہنچایا تھا اس کا ازالہ کیا، کوئلے ایک طرف بھیگے ہوئے منھ چڑھا رہے تھے، ساتھ کے کچھ خیمہ زن بارش کے باعث پہلے ہی رفو چکر ہوچکے تھے۔ ایک اپنا تکیہ اور ایک جینز کی پتلون چھوڑ گیا تھا۔۔۔ دونوں چیزیں اپنی نااہلی پر پانی پانی ہورہی تھیں۔ کھانا وانا کھاتے شام نے ہاتھ بڑھا کر رات کی زلفوں کو بربط کے تاروں کی مانند چھیڑا تو بجیلی بھیگی زلفیں ایک عجب نشاط آفریں سر سنبھالے لامتناہی سیاہی میں تابہ فلک پھیلتی چلی گئیں۔ خاموشی نے شور مچایا تو خنکی کے احساس نے الاؤ کا خیال جگایا مگر خشک کوئلے ندارد۔ سب شب باش ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے تاکہ دردِ دل کا درماں ہورہے۔ کسی نے جانے کہاں سے لکڑی پکڑی تو کسی نے آب گزیدہ پتلون سنبھالی۔۔۔ کوئی کوئلے تھامے

آ رہا۔ اللہ اللہ کر کے گیلی چیزوں نے آگ پکڑی تو ہمت ہار جانے والے اور دلچسپی نہ لینے والے بھی قریب تر ہو کر فروکش ہو گئے۔ زمین گیلی تھی مگر کسی نے خیمے کے اوپر کی پانی بیزار (واٹر پروف) چادر بچھادی۔ باتیں چلتی رہیں اور ہم لوگ اپنے چھوٹے سے دو بندوں کے خیمے میں آ گئے جسمیں دس بندے گھسے ہوئے تھے۔ بس ایسے گھسے ہوئے تھے کہ ایک کے پیر تھے تو دوسرے کا منہ تھا۔ باہر جمی محفل میں کسی نے سیف الملوک کی بابت مشہور پر اسرار باتیں چھیڑ دیں۔

باہر سے کسی ڈرپوک کی رازدارانہ آواز ''سنا ہے اِدھر رات کے وقت پریاں چڑیلیں آتی ہیں اور اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔۔۔ بچ کر رہنا۔۔۔ رات کو ایک دوسرے کی خبر رکھنا۔۔۔!''

ہماری طرف سے ٹھٹھہ اڑاتی آواز ''بھائی انہیں کوتو دیکھنے آئے ہیں، چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ ویسے وہ تمہاری عزت نہیں لوٹیں گی۔۔۔ فکر نہ کرو! اوّل تو اُن کی جمالیاتی حِس پر مجھے کوئی شک نہیں لیکن اگر پھر بھی وہ کور بیں واقع ہوئیں اور تمھیں پکڑ بھی لیں تو شور مچا دینا ہم آ جائیں گے۔۔۔ باقی کام ہمارا۔۔۔ آہو۔۔۔ یعنی اب من وسلویٰ کو کون ٹھکرائے عقل کے اندھے، گونگے، بہرے۔۔۔!''

ظاہری بات ہے ہماری طرف سے ایسا ہی جوب آنا تھا جبکہ نیچے میدانی علاقوں والیاں گھاس پھوس کے بارے میں کافی کفایت شعار واقع ہوئی ہیں اور ہم سدا کے جگالی باز۔۔۔ اسی باعث میدانی انگور ہمیشہ کھٹے بلکہ کڑوے محسوس ہوئے۔ ویسے نشہ ان میں بھی بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ آخر نشہ بھی سڑے ہوئے انگور ہی دیتے ہیں۔ یہی دربدری خاک و باک چھنواتی اس مقام تک لے پہنچی۔۔۔!

زِندگی آمد برائے ''رِندگی''
زِندگی ''بے رِندگی'' شرمندگی

خیر، چونکہ صبح ناران سے سیف الملوک جھیل تک پیدل ہی آئے تھے اِس لئے لحموں میں اٹا غفیل ہوگیا میں تو باقیوں نے بتایا کہ رات خنکی اور نمی کے باعث بڑی بے آرامی میں گزری بلکہ رات کو جب کوئی جانور آ کر کھانے کی باقیات میں منہ مارنے لگا تو سہمے ہوئے پڑوسیوں نے کافی خلل ڈالا آرام میں۔ گجر دم آنکھ کھلی تو باہر کے اُجالے میں پنہاں سپیدۂ سحر سے ذہن کو جھٹکا لگا کہ فجر کی نماز کیا ہوئی۔۔۔؟ مگر پھر گھڑی دیکھی تو تسلی ہوئی کہ وقت باقی ہے۔ باہر آ کر یخ بستہ پانی سے وضو کیا تو دانت بجنے لگے۔۔۔ گو پتلون قمیص میں تھا مگر پھر بھی دو بندوں نے امامت کی دعوت دی تو میں نے بھی حامی بھرلی۔ نماز کے لئے بنے چبوترے پر نماز ادا کی۔۔۔ سلام پھیرتے سیاحوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔۔۔!

نماز سے فارغ ہوئے تو میں ذرا ایک طرف کو آ گیا۔ پیٹھ کی طرف مقامی عمارتوں کے ذودکشوں (چمنیاں۔۔۔ ذود بمعنی دھواں) سے دھواں ولادت باسعادت پا کر فضا میں مرغولے بناتا تحلیل ہوا جا رہا تھا۔ طلوعِ آفتاب نے سرگ (صبح کی پہلی کرن) کے مساس سے اپنا احساس دلایا تو منظر کی خیرگی نے جکڑ لیا۔۔۔ ''جَاعِلِ النُّورِ مِنَ الظُّلَمِ'' والا سماں تھا۔ بلند قامت چوٹیاں جھیل میں اپنا عکس دیکھنے میں محو تھیں۔۔۔ جھیل کے نیلاہٹ مائل سبز رنگ میں پڑتا عریاں چوٹیوں کا بانکا، شرمیلا عکس عدیم المثال منظر پیش کر رہا تھا۔ جھیل سے جڑا ساحل نما میدان فقید البشر ہو چکا تھا۔ تاحدِ نگاہ تنہائی بال کھولے، افسردہ تبسّم لئے، آنکھیں بند کئے، لب سیئے، ننگے مرمریں پیروں، رقص کناں تھی۔۔۔ بشر نہ شجر، ایسا سکوت طاری تھا گویا پورا منظر مبہوت ہو کر نظارگی میں کھو گیا ہو۔۔۔ گویا نگاہوں کے قدموں کا لمس پہلی مرتبہ نم گھاس کے خنک جذب سے آشنا ہوا ہو۔۔۔ سینے کا اتار، چڑھاؤ بھی مدھم ہو کر اس لامتناہی سُر میں ضم ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔ ''وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔۔۔'' اور قسم صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے۔

شاعرِ فطرت ہوں، جب بھی فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

ارمان یوسف

لندن ایکسپریس

باب دوم

''دو بھئی دیکھو! چند روز بعد ہماری فلائیٹ ہے اور ابھی لاہور میں بھی کچھ وقت گزارنا ہے، واپس آ کر سب لوگوں سے فرداً فرداً مل لیں گے''

ہم نے فون پر ماموں طاہر رانا کو وضاحت کی اور ملتان آنے سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ مگر وہ بھی بضد تھا

''آپ ابھی ملتان آ جاؤ، دوست احباب سب ایک جگہ پہ جمع ہوں گے، بے شک صبح سویرے لاہور روانہ ہو جانا''

اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور کہتے ''لاری والے اڈے پہ رسیو کر لوں گا اور کچھ نہیں سننا مجھے'' کہتے ہی فون بند کر دیا۔

چار و ناچار جانا پڑ گیا۔ یہ بے تکلف دوست بھی ایسے ہوتے ہیں کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سوچا اس بہانے ایک بار پھر ملتان کی جھلک بھی دیکھ لیں گے۔

لو جناب، کرتے کراتے ہم نے تلیری بائی پاس سے ملتان کی گاڑی پکڑی۔ ڈرائیور بڑی جلدی میں دکھائی دیتا تھا، وہ بار بار گاڑی کو ریس لگاتا گویا آن کی آن میں اڑنا شروع کر دے گا اور ادھر کنڈکٹر بھی با آوازِ بلند یہی صدا لگاتا کہ ''بس آخری سیٹ رہ گئی ہے'' ہم تو سمجھے کہ ہمارا ہی انتظار تھا۔ مگر پتا چلا کہ ابھی اور بھی کچھ سیٹیں خالی ہیں۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر دونوں پھر اسی پریکٹس میں جت گئے۔

ہم نے گاڑی میں نظر دوڑائی اور کونے میں ایک ماہ جبیں کو جلوہ نما پایا۔ ہم نے احتیاطاً ایسی سیٹ منتخب کی کہ بلاوجہ بھی نظر اٹھے تو رخ زیبا ہی پہ پڑے۔ ایک بار اس حسینہ نے بھی نظریں اٹھا کے یوں دیکھا کہ دل بیچارہ یہ جا وہ جا۔ اتنے میں ہائی ایس چل پڑی، مگر ہمارا دل گاڑی کی رفتار سے کہیں زیادہ دھڑک رہا تھا۔ ابھی ہم حسن کی تپش سے محظوظ ہو ہی رہے تھے کہ ''اپنا اپنا کرایہ دے دو بھئی'' کی صدا کانوں سے ٹکرائی۔ ہم نے یہ سوچ کر مطلوبہ رقم کنڈکٹر کو تھما دی کہ یہ تو جلوۂ حسن کا صدقہ اتار رہے ہیں، سفر تو مفت میں کریں گے۔

''بھئی دس روپے کم ہیں'' کنڈکٹر نے ہمارے دیئے ہوئے پیسے ہمیں واپس لوٹاتے ہوئے کہا۔

ہم سمجھے کہ شاید گننے میں غلطی ہو گئی ہو گی۔ ہم نے پیسوں کی دوبارہ گنتی کی، شہادت کی انگلی کو تھوک سے گیلا کر کے ایک بار پھر گنے۔

''یار کیوں جھوٹ بولتے ہو، ہم نے تو پورے پیسے دیئے بے شک گن لو!''

''دس روپے کم ہیں صاحب جی! ستر روپے کرایہ بنتا ہے اور آپ نے ساٹھ دیئے!'' کنڈکٹر نے وضاحت کی۔

''ستر روپے کب سے ہو گئے؟''

''جب سے ڈیزل کی قیمت بڑھی!'' کنڈکٹر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''بھئی اول تو یہ کہ آپ کی گاڑی ڈیزل پہ نہیں سی این جی پہ چل رہی ہے اور دوسرا یہ کہ ہم کل شام ہی ملتان سے لوٹے ہیں اور اِتنا ہی کرایہ دیا تھا جتنا کہ آپ کو دے رہے ہیں اور ہر صبح اخبار پڑھنا ہماری عادت ہے، کسی اخبار میں نہیں تھا کہ قیمتیں بڑھی ہیں۔''

''دس روپے ہی کی تو بات ہے بیٹا، دے دو اور جان چھڑاؤ اس سے'' ایک بزرگ نے معاملہ نمٹانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

اِسی لمحے اس حسینہ کا آنچل بھی سرکا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈٹ جانے کا اشارہ بھی دیا۔

اب محض دس روپے کی بات نہیں رہی تھی بلکہ معاملہ عدالتِ حسن میں پہنچ چکا تھا اور ہم اسے ہر صورت جیتنا چاہتے تھے۔

''بابا جی! آپ کا مشورہ بجا سہی مگر یہ تو سوچیں کہ پچیس سواریاں اگر دس روپے اضافی دیں تو فی چکر ۲۵۰ روپے بنتے ہیں اور دن میں یہ چھ چکر بھی لگائیں تو ۱۵۰۰ روپے اضافی منافع بنتا ہے، یوں مہینے کے ۴۵۰۰۰ اور سال کے ۵ لاکھ چالیس ہزار بنتے ہیں۔ اگر آپ یہ دس روپے کسی ضرورت مند کو نہ بھی دینا چاہیں تو گنے کا رس ہی پی لیجئے گا، تھوڑا چہرے پہ رونق تو آئے گی، دوسری شادی کا چانس بھی بن سکتا ہے۔''

ہم نے یوں وضاحت کی جیسے وکیل جج کے سامنے دلائل پیش کرتا ہے۔ گاڑی میں موجود ہر شخص ہم سے متاثر نظر آنے لگا مگر ہم تو فقط اس پری چہرہ کو خوش کرنا چاہتے تھے، اس نے بھی میٹھی میٹھی نگاہوں سے داد دی۔

اُدھر کنڈکٹر بھی ضد پہ اڑ گیا کہ یا تو پورا کرایہ دیں یا گاڑی سے اتر جائیں۔

ارے بھائی ہم کیسے اتر جائیں گاڑی سے، وہ بھی آدھے راستے میں، اس شوخ حسینہ کو یوں تنہا چھوڑ کر؟۔ نہ بھائی، ہم سولی پہ تو چڑھ سکتے ہیں مگر گاڑی سے نہیں اتریں گے۔ ایک فرہاد تھا کہ جس نے اپنی محبت کے حصول کے لئے پہاڑ تک کھود ڈالا تھا۔ ہم بھلا کیوں پیچھے رہتے۔ کنزیومر کورٹ جانے کی دھمکی بھی دے ڈالی مگر کنڈکٹر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ موٹروے پولیس کو فون کر ڈالا اور اس کے بعد جتنی بھی قرآنی آیتیں زبانی یاد تھیں پڑھ کر دعا کرنے لگے کہ اللہ میاں بھرم رکھ لینا۔ مگر پاکستانی پولیس کی کارکردگی بھی سامنے تھی۔ اِسی کشمکش میں تھے کہ گاڑی ایک جگہ روک لی گئی۔ یہ موٹروے پولیس ہی تھی۔ پوچھا گیا کہ کس نے شکایت کی اور کیوں؟

ہم نے شیشے سے سر نکال کر اپنا نام ''ارمان'' کچھ اس انداز سے بتایا کہ بھلے پولیس آفیسر کو سنائی دے نہ دے اس ماہ جبیں کو کم از کم ہمارا نام تو معلوم ہو جائے کہ کبھی دل کے ارمان جاگیں بھی تو ''ارمان'' کا نام ہی گلاب ہونٹوں پہ مچل جائے۔

موٹروے پولیس نے چھان بین کی تو ہم ہی فاتح ٹھہرے۔ دس دس روپے ہر ایک کو معذرت کے ساتھ واپس کیے گئے۔ ایک جواں سال پولیس آفیسر نے ہمارا شکریہ ادا کرتے ہو کہا ''لوگ شکایت تک نہیں کرتے، ہمیں کیا خبر کہ گاڑی کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ مجھے اسی روٹ پر ڈیوٹی کرتے دس سال ہو گئے ہیں اور آج پہلی بار کسی کی شکایت موصول ہوئی ہے۔''

خیر ہم فاتحانہ انداز میں اپنی سیٹ پر واپس آکر بیٹھے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد پتہ چلا کہ ہم منزلِ مقصود یعنی ملتان پہنچنے والے ہیں، گویا جدائی شروع ہونے والی ہے۔ اس بات نے دل کو رلا دیا۔ ''خدایا گاڑی ہی پنکچر ہو جائے، اس کا پیٹرول ہی ختم ہو جائے، یا کم از کم یہ سفر ہی تھوڑا اور طویل ہو جائے''

مگر تمام تر تمناؤں کو ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھا۔ لاری اڈہ پر اس کو لینے اس کے عزیز آئے ہوئے تھے اور ہمیں لینے مون۔ اس نے بھی الوداعی سلام کیا اور نظریں جھکا لیں، ہم نے بھی مون کو گلے لگاتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔

عجیب داستاں ہے یہ، یہیں شروع یہیں ختم

احمد سعید

پیرس اوئے پیرس

بڑے بھائی کے گھر سے ٹرین سیدھی ''ایفل ٹاور'' جاتی ہے جسے یہ ''توغ ایفل'' کہتے ہیں، اور معذرت ٹرین بالکل سیدھی نہیں تھوڑا بہت بل بھی کھاتی ہے۔ ایک اور بات کہ بھائی کے گھر سے نہیں تھوڑا اُن کے گھر سے باہر نکل کر۔

بھائی کا پیرس میں ہونا ساس کے ہونے سے کم نہ تھا، اور میری حیثیت ان کے سامنے پرانی بہوؤں کی سی تھی، جس پر ہر پل انہوں نے نظر رکھی ہوئی تھی۔ ہر دو گھنٹے بعد فون آجاتا کہ کہاں ہیں کب آنا ہے؟

میں نے کہا جی کہ ''توغ ایفل'' آکر کوئی غلطی ہوگئی۔ یہ کیا ڈانٹنے لگ جاتا ہے اگر زیادہ دیر یہاں گزاریں تو؟ لیکن ایفل ٹاور کا جیسے سنا تھا ویسا ہی نکلا۔ واقعی دنیا کا ایک عجوبہ ہے۔ بہت ہی لمبا ہے۔ سنا ہے کہ لمبوں کی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے۔ جتنا یہ لمبا ہے اس کے پاس تو عقل نام کی کوئی شئے نہ ہوگی۔

اس کے اوپر جانے کی خواہش اس لئے نہ کی کہ ٹکٹ لینے کے لئے سینکڑوں لوگوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ اپنا تو حوصلہ نہ پڑا۔ ہم نے جہاز سے اترتے ہوئے سارا پیرس دیکھ لیا تھا۔ ایفل ٹاور کے اوپر سے بھی ویسا ہی نظر آنا تھا۔ وہاں ایک عجیب بات دیکھی ، ایفل ٹاور کے سامنے ''لموزین'' گاڑیاں آتی تھیں۔ اُس میں کوئی دس کے قریب لڑکیاں اترتیں اور ایک آدھا لڑکا۔ عجیب لموزین کا آنا نہیں تھا۔ یہ جو ایک آدھ لڑکے کے ساتھ دس دس حسیناؤں کا جھنڈ تھا۔ اس کا کچھ سمجھ آیا کچھ نہیں۔

فرانس ایک جدید قوم ہے، لیکن آم ابھی بھی پاکستان سے ہی آتے ہیں۔ فرانس کے دوسرے شہروں سے بھی فرنچ لوگ ''پیرس'' میں آم خریدنے آتے ہیں انہیں اکثر دکاندار کہہ بھی دیتے ہیں کہ ''ایتھے اَمب لین آیاں'' وہ آگے سے مسکرا کے جی جی کہہ دیتے ہوں گے۔ جی جی کو یہاں سی سی کہتے ہیں۔ اس قسم کا ملتا جلتا لفظ پاکستان میں بھی بہت کارآمد ہے یعنی ''ٹی سی''۔ بس ٹی سی کرتے جائیں کام نہ کریں، پر یہاں ٹی سی نہیں چلتی۔ البتہ ٹیکسیاں بہت چلتی ہیں۔ بہت پیاری پیاری ٹیکسیاں چلتی ہیں، یعنی
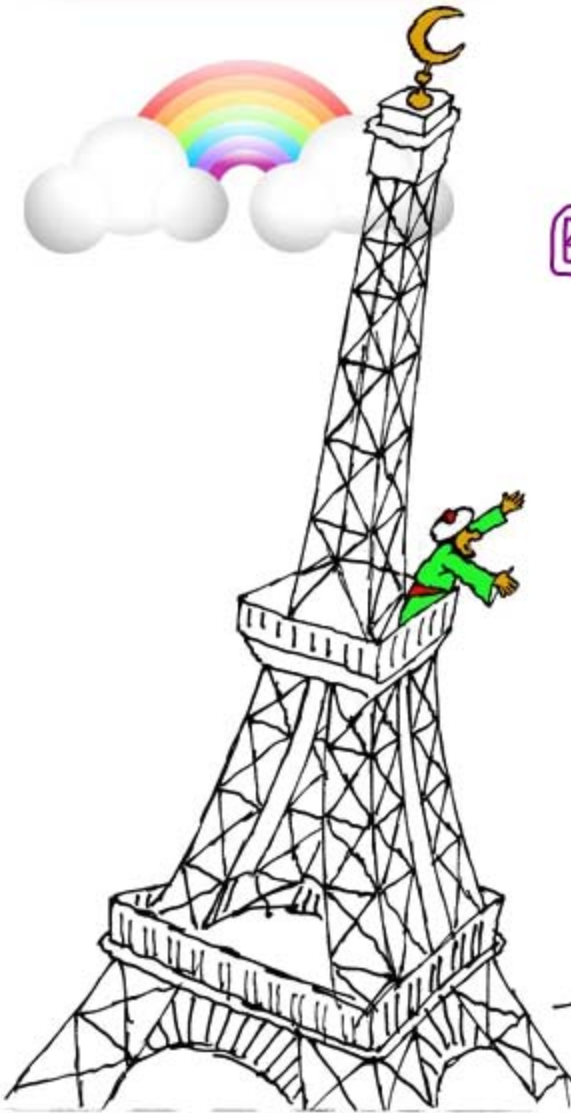
مرسڈیز وغیرہ بطور ٹیکسیاں ہی چلتی ہیں۔ فرانس میں غلط فرنچ بولنا صحیح انگلش بولنے سے بہت بہتر ہے۔ انگلش بولیں گے تو پھر یہ آپ سے نہیں بولیں گے۔ ''کُٹی ہو سکتی ہے، بلکہ ہو کیا سکتی ہے، ہو جائے گی۔ لیکن اب کہیں نہ کہیں ایڈریس پوچھنے کے لئے چل جاتی ہے۔ اکثر فرنچ ایسے بھی ملیں گے جنہیں انگلش بھی آتی ہو گی آپ کی بات بھی سمجھ لیں گے پر جواب فرنچ میں ہی دیں گے یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کو فرنچ نہیں آتی۔ کیونکہ فرنچیوں کا کہنا ہے کہ اگر آپ کو فرنچ نہیں آتی تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ پیرس شہر دیکھ کر محسوس ہوا کہ پیرس پیرس ہے، پر پیرس جتنا بھی خوبصورت ہولا ہورلا ہوراے۔

فرنچ لمبے اور بہت سمارٹ ہوتے ہیں۔ اتنے سمارٹ کہ پاکستان میں ہوں تو ہر شخص گزرتا ہوا کہے کہ جناب کچھ کھا بھی لیا کریں، لیکن بہت فریش اور ایکٹو ہوتے ہیں۔ بات سیدھی کرتے ہیں اکثر بدتمیزی کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں لیکن سب ایسے نہیں ہیں۔

ٹرین سسٹم میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ دنیا کی سب سے تیز ترین ٹرین انہی کی ایجاد ہے۔ بغیر ڈرائیور کے ٹرین بھی انہی کی ایجاد ہے۔ دنیا کی سب سے فضول ترین ایجادیں بھی یہیں

اِس محبت سے اللہ بچائے

کسی جلسہ میں سردار جعفری اقبالؔ کی شاعری پر گفتگو کر رہے تھے۔ اِدھر اُدھر کی کی باتوں کے بعد جب سردار نے یہ انکشاف کیا کہ اقبال بنیادی طور پر اشتراکی نقطۂ نظر کے شاعر تھے تو مجمع میں سے کوئی ''مردِ مومن'' چیختے ہوئے بولا ''جعفری صاحب! آپ یہ کیا کفر فرما رہے ہیں۔ شاعرِ مشرق اور اشتراکیت لاحول ولا۔ آپ اپنی اس خرافات سے اقبالؔ کی روح کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔''

جلسے کی پہلی صفوں سے مجازؔ پھلجھڑی کی طرح چھٹتے ہوئے بولے ''حضرت! تکلیف تو آپ کی اپنی روح کو پہنچ رہی ہے جسے آپ غلطی سے اقبالؔ کی روح سمجھ رہے ہیں۔''

دستیاب ہیں، جیسے کہ فرنچ کٹ اور ''فرنچ کِس'' وغیرہ۔ ٹائم کے بہت پابند ہیں۔ یورپ کے دوسرے ممالک سے بھی زیادہ۔ میں اور میری بیگم صاحبہ جب بارسلونا سے پیرس فرنچ ٹرین ''تے جے وے'' پہ آئے تو پیرس پہنچنے سے کچھ لمحات پہلے بار بار کوئی اناؤنسمنٹ ہو۔ مجھے شک گزرہ کہ ٹرین میں کوئی بڑی شخصیت نہ گھس گئی ہو۔ ذہن میں کبھی'' انجلینا جولی'' اور کبھی ''نکول کڈ مین''۔ یہاں تک کہ وینا ملک کی طرف بھی ذہن چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ'' تے جے وے'' تین سو پچاس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ یہ کیسے آسکتی ہے۔ دل پھر بھی کہے کہ آ گئیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ'' سپائیڈر مین'' کے توسط سے آئی ہوں۔ اس معرکے کے بانی وہی ہوں گے۔

کس احمق کی خواہش تھی کہ'' سپائیڈر مین'' کو دیکھے، میں تو Nicole کی آنکھوں اور ''انجلینا'' کی اداؤں کے تعاقب میں تھا۔ فوری طور پر ایک لڑکی سے دریافت کیا کہ بار بار یہ کیا اعلان ہو رہا ہے؟ فرمانے لگیں کہ ٹرین تین منٹ دیر سے فرانس پہنچ رہی ہے۔ میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ ٹرین رُکی تو اناؤنسمنٹ ابھی بھی جاری تھی۔ دل نے کہا کہ کوئی نہ کوئی تو آ گئی ہے اور نہیں تو '' میرا'' ہی آئی ہو گی۔ ان میں سے تو کوئی نہ آیا، البتہ بھائی ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ انہیں وہاں رہتے ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ کہنے لگے، ٹرین تین منٹ لیٹ پہنچی۔ غصہ مجھے پہلے ہی بہت تھا کسی ایکٹرس کے نہ آنے پر، بھائی کی بات سنتے ہی میں بولا کہ فرنچ ٹی وی چینلز پہ آپ نے سُنا ہو گا۔ اب تھوڑی دیر تک CNN اور BBC پر بھی یہ خبر چلتی ہو گی۔ بھائی میرا منہ دیکھیں، میں پیرس دیکھوں۔ جی دیکھنے جو پیرس آئے ہوئے تھے، ایک دوسرے کا منہ تھوڑی۔

فرانس جانے سے پہلے میں فیصل آباد، ایگریکلچر یونیورسٹی سے فرنچ کورس کر کے نکلا تھا اور یہاں آ کے کئی ''فرنچیوں'' کے دانت کھٹے کر چکا تھا۔ ایک جگہ دو'' فرنچ'' لڑکیوں کے ساتھ ایسی فرنچ بولی کہ ان کے دانت ہی اندر نہ جائیں۔ وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ، حالانکہ میں نے فرنچ میں کوئی لطیفہ نہیں سنایا تھا۔ اب تین چار ماہ کے فرنچ کورس سے اتنی ہی فرنچ آتی تھی، جیسے کسی'' ٹھیٹ'' پنجابی بولنے والے نے نئی نئی اُردو بولنی شروع کی ہو۔ وہ ہنستی جائیں اور معذرت کرتی جائیں۔ معذرت کی کیا ضرورت؟ میں تو چاہتا تھا کہ ہنستی جائیں۔ آپ نے وہ محاورہ تو سنا ہی ہو گا کہ ''ہسی تے پھسی۔''

لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ آپس میں پہلے ہی پھنسی ہوں۔ یہ یورپ تھا، اوپر سے فرانس کا شہر پیرس، یورپ کا بھی باپ۔ یہاں سب کچھ ہوسکتا ہے، جہاں بے غیرتی عام ہو وہاں سب کچھ ہی ہو سکتا ہے۔ ہنسی ابھی بھی متواتر جاری تھی کیونکہ میری فرنچ اُن پہ طاری تھی۔ میں اپنی جارحانہ فرنچ مسلسل جاری رکھے ہوئے تھا، جس سے ایک لڑکی سے تو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے پیٹ کو تھاما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے مسلسل اشارے کر رہی تھی کہ بس کر دو۔

میں بھی فیصل آباد سے آیا ہوا تھا، موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے فرنچ اور تیز کر دی۔ اب میری فرنچ، فرنچ ٹرین ''تے جے وے'' کے مقابل جاری تھی یعنی تین سو پچاس کلو میٹر فی گھنٹہ۔ اس سے آدھی سپیڈ پر بھی شعیب اختر نے کبھی گیند نہ پھینکی ہو گی جتنی تیز میں فرنچ پھینک رہا تھا۔ ویسے وہ بھی بہت دل پھینک لگ رہی تھیں اور میں اُس لمحے ٹھنک ٹینک۔

لے سانس ذرا دیکھ کے

امراضِ وبائی سے ہے دل تنگ و پریشان
آفت ہے عجب جسم پہ، مشکل میں پڑی جان
لے سانس ذرا دیکھ کے ہوجائے نہ ٹی۔بی
"ہاں کھانس، پہ آہستہ کہ نازک ہیں بہت کان"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کمرشل

بنا کر زندگی کی ہر اک شے کو تجارت
سمجھتا تھا کہ مشکل مری حل ہوگئی ہے
نمودِ ظاہری کا مگر ہے بوجھ اتنا
"کمرشل" ہوتے ہوتے کمر، شل ہوگئی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

چمٹا

بدلتے جارہے ہیں دن بہ دن اندازِ الفت کے
با آسانی ہمارے پیار سے نمٹا نہیں جاتا
جو اظہارِ محبت کے لئے مطبخ میں جاتے ہیں
اٹھاتے ہیں وہ چمٹا اور پھر چمٹا نہیں جاتا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ن م راشد

اگر چہ میم پہلے بعد اسکے نون آتا ہے
مگر کیا فرق پڑتا ہے الٹ پھیری سے کچھ ان کو
اگر ہو شاعری آزاد تو شاعر کا کیا کہیے
یہ ترتیب تہجی بھی نہیں ہے بے سبب یارو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دولت

لفظ بہت سے ایسے دیکھے
جیسا مطلب ویسی صورت
دولت ہے کیا غور کرو گر
ایک سے دو کرنے کی ہے لت

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈکار مارنے دے

ہمیں بھی شیخیاں کرنے دے سر ابھارنے دے
نہیں ہیں شیخ، پہ شیخی ہمیں بگھارنے دے
پتہ چلے یہ انہیں ہم نہیں کوئی بھوکے
پھُلا کے پیٹ ہمیں بھی ڈکار مارنے دے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

یا انقلاب

یہ بولے شیخ جی محبوبہ سے بصد الفت
میں جس میں غرق ہوں، وہ جھیل بن گئی ہو تم
یہ انقلاب ہے کیسا، اب اُس سے کہتے ہیں
کہ بعد شادی کے، اِک چیل بن گئی ہو تم

تنویر پھول

چپلی کباب کلیجی اور نہاری

منہ میں تھے چپلی کباب اور لب پہ یہ آواز تھی
ہم کلیجی اور نہاری کھانے سے عاجز نہیں
ایک سبزی خور نے سن کر یہ فوراً کہہ دیا
جو مزا سبزی میں ہے، وہ گوشت میں ہرگز نہیں!

تنویر پھول

بتاؤ تو بھلا!

ہیں قومِ لوطؑ کے حامی بڑے زعمِ ترقی میں
کوئی ان سے یہ پوچھے، کس طرح تشریف تم لاتے؟
نہ تم دنیا میں آتے اور نہ باتیں یہ بناتے تم
تمھارے باپ ماں جو تھے، اگر یہ سوچ اپناتے

تنویر پھول

برعکس نام

پڑھنے لکھنے سے ہے عاری، نام فاضل رکھ دیا
آدمی بے فیض ہے وہ، فیض جس کا نام ہے
رکھ دیا کافور نام اُس کا جسے زنگی کہیں
رنگ کوّے کی طرح، کہلاتا وہ گلفام ہے!

تنویر پھول

شیر اور ٹارزن

دیکھ کر منظر زباں پر پھولؔ کی یہ آ گیا
شہر کی مانند یارو! سج گیا ہے آج بن
سُن کے حیراں رہ گئے، کس نے لگائی یہ صدا!
شیر کو مرغا بنانے آ گیا ہے ٹارزن

تنویر پھولؔ

اپنا اپنا احوال

زبانِ شعر میں مومن یہ کہہ گئے ہیں پھولؔ!
"ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہُوا"
ہمارا یار گویّا ہے، وہ یوں گاتا ہے
ہمارے عشق کا بھونپو کہاں کہاں نہ بجا!

تنویر پھولؔ

عیدِ قرباں پر

گائے اور بکرے کی شامت آگئی
بکریاں بولیں، قیامت آگئی
مرغی والے بھی قصائی بن گئے
پھولؔ! اُن میں کیا شہامت آگئی

تنویر پھولؔ

ڈارون کا قول

آپ یہ کہتے ہیں، والد آپ کے تھے بوزنہ
کل کہیں، خالہ زغن تھیں، آپ کے ماموں تھے زاغ
ڈاروِن کا مورثِ اعلیٰ تو بندر ہے مگر
ہم کو آدمؑ سے ملا ہے آدمیت کا سراغ

تنویر پھولؔ

مفتی اور فتویٰ

ایک مُفتی آئے ٹی وی پر، عجب لہجہ سُنا
پھولؔ! قرآں کی زباں سے ہیں وہ کتنے نابَلَد!
کیا زباں اہلِ عرب کی جانتے مُفتی نہیں؟
جو "غَلَط" کو "غلْط" بولیں، اُن کا فتویٰ بے سَنَد

تنویر پھولؔ

رائے ونڈ مارچ

دیکھتے رہیے نتیجہ پھولؔ! اِس دنگل کا آپ
آگئے ہیں رائے ونڈ اب ٹارزن عمران خان
شیر کی جنگل میں شاہی، وہ بنے ہیں ٹارزن
قوم سے رکھتے ہیں اپنی، حُسنِ ظن عمران خان

تنویر پھولؔ

پی ٹی آئی کی پٹائی

توبہ! توبہ! دیکھیے، ڈنڈوں، دھماکوں کا یہ راج
ہو نہیں سکتی کبھی یہ قوم کیا شیر و شکر؟
دیکھ کر ٹی وی ہمارے منہ سے نکلا پھولؔ! یہ
پی ٹی آئی کی پٹائی ہو رہی ہے کس قدر

تنویر پھولؔ

واعظ

واعظ نے مجھ سے رات یہ بازار میں کہا
ہیں مرتکب سزا کے کدھر دیکھتے ہیں آپ
میں نے کہا گناہ میں دونوں شریک ہیں
اپنی نظر وہیں ہے جدھر دیکھتے ہیں آپ

محمد انس فیضی

بکرا

ہم تو انس اب آپ ہی اپنی مثال ہیں
ہم سا کوئی ملے گا نہ قرب و جوار میں
مفلس غریب لوگوں سے نظروں کو پھیر کر
بکرا خرید لائے ہیں ستر ہزار میں

محمد انس فیضی

گیس

نسخے قریب دور کے سب آزمائے ہیں
پہنچا ہوا حکیم بھی ناکام ہوگیا
مرغا بنا کے دیکھا تھا بیگم نے کل مجھے
اب لگ رہا ہے گیس کو آرام ہوگیا

محمد انس فیضی

چینی

جن کی فطرت جناب کڑوی ہے
ان کے لب پر بھی آج چینی ہے
ہم بھلا کیسے چھوڑ دیں چینی
ہم سبھی کا مزاج چینی ہے

محمد انس فیضی

بعد از نکاح

ہم جیسا خوش مزاج بھی ملتا نہ تھا کہیں
لیکن وفا کی راہ میں رونا پڑا ہمیں
بعد از نکاح چہرے کی رنگت اتر گئی
جیون میں جو سکون تھا کھونا پڑا ہمیں

محمد انس فیضی

بال

وہ بھی کیا دن تھے اس جوانی کے
ہم سراپا جمال ہوتے تھے
غور تو کر حسین چہرے پر
تب ہمارے بھی بال ہوتے تھے

محمد انس فیضی

ٹین ایج غزل

جب سے مری شہرت کا زمانے میں ہے چرچہ
ہر ایک کو میں اپنی غزل بانٹ رہا ہوں
تو تو ابھی نادان ہو کم سن بھی ہو ٹھرو
میں ایک دو ٹین ایج غزل چھانٹ رہا ہوں

محمد انس فیضی

زعفرانی مزاج

زعفرانی مزاج ہے اس کا
اور عادت ہے اقتداری کی
سر پہ الزام ہے عداوت کا
بات کرتا ہے پاسداری کی

محمد انس فیضی

بین السطور

گو بظاہر ذکر تھا اِک بے وفا کا شعر میں
اُن کو جو کہنا تھا ہم سے، کہہ گئے بین السطور
لِکھ دیا ہم نے جواباً، ''کیا ہی عمدہ شعر ہے!''
چوٹ ہم بھی مُسکرا کر سہہ گئے بین السطور

ابنِ منیب

حکومت کیجئے

ملک کے حالات اب گھمبیر ہیں
کچھ توجہ تو ادھر بھی دیجیے
کیسے جزوقتی چلے گا ملک یہ
چھوڑ کر بزنس حکومت کیجیے

انجینئر عتیق الرحمٰن

ڈنڈے کی حکومت

دراصل ہے اس ملک میں پیسے کی حکومت
دیکھا ہے جہاں ہے وہیں لے دے کی حکومت
اقدار کی ہوتی ہے یہاں اب تو تجارت
لگتا ہے کہ پھر آئے گی ڈنڈے کی حکومت

انجینئر عتیق الرحمٰن

فنکار
ہم تو رکھتے ہیں شہادت کی تمنا یارو!
جانے کس آس پہ لڑتا ہے یہ مودی ہر وقت
عالمی سطح پہ تسلیم ہوا فن اُس کا
پینترے خوب بدلتا ہے یہ مودی ہر وقت
انجینئر عتیق الرحمٰن
مردانی
رنگ میاں کی سامنے بیگم کے زرد تھی
جس سے سبھی تھے ڈرتے وہ اک ایسا فرد تھی
مرنے کے بعد بھی نہیں نکلا دلوں سے خوف
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھی"
شہاب ظفر
لوڈشیڈنگ
یہ موقع خوبصورت ہاتھ سے جانے نہیں پائے
تم اپنا کام تھوڑی دیر کو یونہی چلا لینا
صنم کو دیکھنے کا لوڈ شیڈنگ میں مزا کیا ہے
اگر بتی چلی جائے، اگر بتی جلا لینا
شہاب ظفر
خُودکش حملہ
مرنے جینے کا جو وعدہ تھا بھلایا اُس نے
پیار کا اپنے رہے گا یونہی اونچا شملہ
ساتھ جینا نہ سہی، ساتھ میں مرنا ہی سہی
اُس کی محفل میں کروں کیوں نہ میں خودکش حملہ
شہاب ظفر
بدنظری
ہر اک عمر کے بوڑھے، جوان اور نیک و بد
بد نظری کے کتنے ہی دلدادہ تھے
جتنے پھول تھے اس کی کالی کرتی پر
گھورنے والے بھنورے اس سے زیادہ تھے
ڈاکٹر عزیز فیصل
شک
بعض اوقات بجا ہوتا ہے
شک کرنا اچھا ہوتا ہے
کار میں ایکس (x) اگر لکھا ہو
اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟
ڈاکٹر عزیز فیصل

عارفہ صبح خان

حماقتوں کی پوٹلی

اندرونِ شہر کے تھڑے پر بیروزگاری اور لاچاری سے عاجز آزاد بخت عرف بہلو سوچ رہا تھا کہ سارا دن آوارہ گردی کرنے اور اماں کی جھڑکیاں کھانے کے بعد بہتر ہے میں ہر روز اسی جگہ بیٹھ جایا کروں۔ کم از کم اُدھار کی بیڑی تو پی لیا کروں گا۔ آزاد بخت عرف بہلو اکثر بیکاری سے عاجز آ کر اندرونِ شہر کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر اپنا وقت کاٹا کرتا۔ ایک طرف اماں ابا کی لعن طعن اور بہنوں کی خدمتیں کرنے سے بچ جاتا، دوسرے مزے سے سگریٹ کے کش لگا لیتا، کبھی تاش کے پتے پھینٹ لیتا اور کبھی گولیاں کھیل لیتا لیکن اصل چیز تو وہ لڑکیاں تھیں جو یہاں سے گزرتے ہوئے مسکرا کر یا آنکھ مار کر اسے بھی دیکھ لیتی تھیں۔ آزاد بخت غربت کے لحاظ سے بدبخت سہی مگر چہرے مہرے سے بڑا خوش بخت اور وجیہہ مرد تھا۔ اب وہ لڑکا تو رہا نہیں تھا۔ لڑکپن سے کئی سال پہلے تنگ آ کر اسے چھوڑ چکا تھا۔ اب آزاد بخت تیس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ بی اے کئے اسے گیارہ بارہ برس بیت چکے تھے۔ نوکری ملتی نہ تھی، وہ درخوستیں لکھ لکھ کر عاجز آ گیا تھا۔ اس کی کوئی درخوست اور خواہش بر نہیں آتی تھی۔ وہ اکثر لمبی چمکیلی مہنگی گاڑیوں میں اپنے ہم عمر جوانوں کو دیکھتا جن کے رنگ تانبے اور لوہے جیسے ہوتے۔ آفٹر شیو لوشن اور کریموں اور پرفیوموں کے باوجود ان کے چہروں کی کالک اور بدصورتی چھپائے نہ چھپتی تھی۔ تھری پیس سوٹ اور قیمتی سگار منہ میں دبائے اگرچہ کارٹون ہی لگ رہے ہوتے تھے لیکن نہایت قیمتی گاڑی میں بیٹھے، جب وہ موبائل کان سے لگائے، ایک ہاتھ سے اپنا خوبصورت وولیٹ نکال کر نوٹوں کی گڈیاں یا ڈالروں کی تہوں میں سے کچھ رقم آئسکریم یا کولڈ ڈرنک سرو کرنے والے لڑکے کو دیتے تو فرنٹ سیٹ پر پہلو میں بیٹھی سیکرٹری، کولیگ، گرل فرینڈ یا بیوی بڑے فخر سے اس کالے جن کو دیکھتی اور اپنی تمام اصلی اور نقلی مسکراہٹ، چاہت اور محبت اس للو جیسے بھوت پر نچھاور کرنے لگتی۔ اگر غلطی سے اس کی نگاہِ حسین و جمیل آزاد بخت عرف بہلو پر پڑ جاتی جو سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھا، گھٹیا برانڈ کی سگریٹ یا بیڑی سُلگا رہا ہوتا تو وہ ایسے حقارت سے منہ پھیرتی جیسے اس نے چیچک یا چنبل کا مریض دیکھ لیا ہو۔

آزاد بخت عرف بہلو خدا کے ان آزاد قوانین پر سخت جُز بُز ہوتا جن کے تحت انسان، انسان پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اِتنا فرق انسان اور حیوان میں نہیں تھا جتنا ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا، خدا سے لڑنے بھڑنے کے بعد معافی شافی مانگ کر وہی دعائیں مانگنے لگتا جو کبھی قبول نہیں ہوتی تھیں۔ آزاد بخت چھوٹی عمر سے ہی دنیا پر غور کرنے لگا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ زندگی محض حماقتوں کی پوٹلی ہے۔ جو امیر ہیں، وہ دولت کمانے

کے چکر میں گن چکر بنے رہتے ہیں اور غریب غربت کی چکی میں گھن کی طرح پس جاتے ہیں۔ایک کی زندگی دولت سمیٹتے اور کماتے گزر جاتی ہے۔دوسرے کی زندگی دولت کے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزر جاتی ہے۔ جب بوڑھے کھوسٹ ہو جاتے ہیں، پھر سر کے بال نوچتے اور کفِ افسوس ملتے ہیں کہ ناحق زندگی گنوائی، زندگی کا اصل لطف تو اُٹھایا ہی نہیں۔

آج آزاد بخت کو یہ گوشۂ تنہائی میسر آیا تو وہ شام تک سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہا۔کبھی اسے بچپن کے قصے یاد آتے تو کبھی لڑکپن کا جوبن ستاتا۔کبھی جوانی کے خواب سرسراتے۔۔۔لڑکیاں اور دو سابقہ منگیتریں یاد آتیں۔کبھی کالج لائف یاد آتی۔اس نے سوچا کہ مجھ جیسے آوارہ، بیروزگار اور فارغ البال کے لئے یہ جگہ جنت سے کم نہیں۔رات ہو چکی تھی چنانچہ اس نے لکڑیاں اکٹھی کر کے الاؤ دھکایا۔ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ رات کو کیا کھائے کہ اچانک ایک چور ایک پوٹلی اور بیگ سمیت نیچے آ گرا۔ابھی دونوں تعارفی مرحلے میں تھے کہ ایک فقیر آ گیا۔ذرا سی دیر میں آگ روشن دیکھ کر ایک چرسی بھی گرتا پڑتا آ پہنچا۔کچھ ہی دیر میں پولیس کے سائرن فضا میں گونجنے اور گولیاں چلنے کی آواز آئی اور اسی آواز کے ساتھ دھم سے کسی کے گرنے کی آواز آئی۔یہ دہشت گرد تھا جو منہ لپیٹے ہوئے تھے۔وہ گولی کھانے سے بال بال بچ گیا تھا مگر سانس پھولنے کے باوجود گلا صاف کرنے کی گولی ''ہویسٹ'' کھا رہا تھا۔آنسو گیس نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا کیونکہ اس نے منہ چادر سے لپیٹا ہوا تھا، البتہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔سب لوگ اسے دیکھ کر ڈر گئے کہ ہو نہ ہو، کوئی ڈاکو لٹیرا ہے، مگر دہشت گرد نے بُرا مناتے ہوئے کہا کہ'' میں کوئی چور ڈاکو نہیں بلکہ دہشت گرد ہوں، ذرا پولیس کی گرد کم ہو تو میں تمھیں اپنا احوال سناؤں۔مجھ سے ڈرومت بھائی بندو، میں بھی تمھاری طرح ایک خوبصورت اور تعلیم یافتہ جوان ہوں'' یہ کہہ کر اُس نے ایک فانٹا کی گولی منہ میں ڈالی اور فوراً چبا گیا۔پھر بولا'' بھائیو!اگر کھانے کے لئے کچھ ہے تو دو، میں صبح سے بھوکا ہوں۔'' فقیر بولا کہ میرے پاس آلو بھرے پراٹھے اور بریانی تنجن پلاؤ ہے جو مجھے داتا دربار سے قطار لگانے سے ملا ہے اور آلو بھرے پراٹھے ایک خوبصورت نوبیاہتا نے اپنے خوبصورت نرم ہاتھوں سے پکا کر دئے ہیں۔اس کا شوہر دو سال سے بیرونِ ملک مقیم ہے۔تنہائی اور پیار کی ماری اس دلہن نے مجھ پر خاص عنایت کر رکھی ہے۔ہفتے میں ایک بار آلو بھرے پراٹھے اور دو بار قیمے والے نان بنا کر دیتی ہے۔''

چور بولا کہ آج میں نے دو گھروں میں چوری کی۔ایک متوسط گھرانا تھا جہاں سے مجھے زیور، روپیہ اور پرائز بانڈ ملے۔دوسری کوٹھی تھی مگر وہاں کوشش کے باوجود پیسے نہ ملے۔معلوم ہوا کہ کوٹھی والے نے اپنا مال اسباب بنکوں میں رکھوا رکھا ہے اور خود کریڈٹ کارڈ پر چلتے ہیں۔تنگ آ کر میں واپس جانے کا قصد کر رہا تھا کہ کچن سے بھینی بھینی خوشبو نے میرے قدم پکڑ لئے۔معلوم ہوا کہ کچھ ہی دیر پہلے کوٹھی میں شاندار عشائیہ دیا گیا تھا اور یہ کھانے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔میں نے بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق یہ کھانے چرا لئے کیونکہ چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے، میں نے ایسا ہی کیا اور جتنے پیزے، برگر، چکن فِش او کباب پڑے تھے، سب ایک پوٹلی میں باندھ لئے۔آؤ بھائیو! ہم سب مل کر آج ایک اچھا کھانا کھاتے ہیں۔چرسی بولا کہ ابھی آتے ہوئے مجھے دو پیپسی کی بوتلیں ملیں، میں سمجھا کہ شائد اس میں سفوف والا مکسچر ہو گا اس لئے میں نے دُکان سے چپکے سے اُٹھا لیں۔آپ کو تو معلوم ہے، چرسی اپنی ذات میں چور بھی ہوتا ہے۔ آزاد بخت عرف ببلو نے کہا کہ اے درویشو! میرے پاس سگریٹ ہیں، کھانے کے بعد ہم مزے سے سگریٹ پئیں گے۔یہ رات ہم لوگوں کی زندگی کی خوبصورت رات ہو گی۔فقیر گویا ہوا کہ بھائیو! میرے پاس دسمبر کی یخ بستہ اس حسین رات کے لئے ڈرائی فروٹ بھی ہے جو مجھے اس حسین دُلہن نے دیا ہے تاکہ میں سردی میں گرم رہوں۔چھ اُبلے ہوئے انڈے بھی ہیں، ایک ایک تم کھا لینا اور دو میں کھا لوں گا کیونکہ مجھے رات کے پچھلے پہر اس حسین دلہن کے گھر کے پچھواڑے والے کمرے میں جانا ہوتا ہے۔ایک گھنٹے بعد دلہن کے کام سے فارغ ہو کے اپنی کٹیا میں لوٹ آتا ہوں۔

آزاد بخت عرف ببلو نے کھانا لگایا اور بولا'' میں تم سب کا

میزبان ہوں۔تم چاروں درویشوں کے حالاتِ زندگی دلچسپ اور نادرِ روزگار لگتے ہیں۔آج کی رات کو کیوں نہ زیادہ تابناک اور یادگار بنالیں،تم چاروں درویش دکھیارے اور غم کے مارے لگتے ہو۔آج رات ہم کھانے کے ساتھ ساتھ اپنی داستانِ حیات سنا کر دل کا بوجھ بھی ہلکا کریں گے۔ اگرچہ تم چاروں درویشوں میں صرف دو کے منہ پر داڑھی ہے لیکن جو حال چرسی اور چور درویش کا ہے اس سے ان کی درویشی میں کسی طرح کمی نہیں آتی۔ میں اگرچہ چرسی اور چور کی طرح کلین شیو نہیں اور نہ ہی فقیر اور دہشت گرد کی طرح باریش ہوں۔ پہلے کبھی میں بھی آرنلڈ شیوانگرز، سلویسٹر سٹالون، ٹام کروز کی طرح کلین شیو ہوتا تھا لیکن میری پہلی منگیتر اور دو محبوباؤں نے ایک ہی شکایت کی کہ تمھاری محبت میں گداز نہیں ہے۔ جب میں نے کہا کہ میں تو محبت میں بہت گرمجوش ہوں تو میری پہلی منگیتر نے شاکی انداز میں کہا کہ ''نہ تو تم کوئی تحفہ دیتے ہو اور نہ تمھارے پیار سے گدگدی ہوتی ہے۔میرے کلاس فیلو کی اِتنی خوبصورت مونچھیں ہیں کہ مجھے گدگدی ہونے لگتی ہے۔''

میں بیوقوف احمق نوجوان سمجھ نہ سکا کہ مونچھوں سے گدگدی کا کیا تعلق ہے۔ جب دو محبوباؤں نے بھی یہی شکایت کی تو میں نے ایک لنگوٹیئے یار سے سبب دریافت کیا تب اُس اللہ کے نیک بندے نے راز سے پردہ اُٹھایا اور میں نے فٹافٹ تلوار مارکہ مونچھیں رکھ لیں کیونکہ اس سے زیادہ گدگدی ہوتی ہے۔''

آزاد بخت عرف ببلو کے اس واقعہ نے چاروں درویشوں کو بہت متاثر کیا۔آزاد بخت عرف ببلو نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اے نیک بختو، گردش کے ستارو، افلاک کے سہارو! سب سے پہلے میں اپنی داستانِ غم سناتا ہوں تاکہ تم عبرت پکڑو۔ تم چہرے مہرے سے جس طرح اعلیٰ حسب نسب کے چشم و چراغ لگتے ہو اور خوبصورت و وجیہہ دانا مرد ہو کر بھی یوں رُلتے پھرتے ہو،اس خاکسار کا قصہ سنو اور سر دھنو۔میرا اصلی نام عمر جان ہے۔ مجھے سب پیار سے ببلو ببلو کہا کرتے تھے۔ میرے آباو اجداد بھارت کی ریاست جوناگڑھ کے رہنے والے تھے۔میرے دادا مرحوم ریاست کے نواب تھے۔میرے والد ریاست کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ ایکڑوں مربعوں میں زمین تھی۔میرے داد کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے جوانی میں ہی عشق میں خراب ہوئے۔ پہلے عشق کیا پھر شادی کی۔ کثرتِ عشق کا نتیجہ کہ جلد بیمار پڑ گئے۔حکیم طبیب سیانے پیر فقیر سبھی کو دکھایا، کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔مرنے کے قریب پہنچے تو فرمایا کہ اُنہیں ایک کالے برقعے والی سے پیار ہوگیا ہے۔دو چار بار راستے میں مدبھیڑ ہوئی اور نشانہ دل کے پار ہو گیا۔میں نے ایک رقعہ لکھ کر ڈالا اور حالِ دل کہہ سنایا۔دلنشین نازنین میرے عشق میں سراپا ڈوب گئی۔ میں نے اُسے بتایا کہ ''اے دلربا! میں تم سے عقدِ ثانی کا متمنی ہوں۔ بارگاہِ عشق میں خادم کو بہ عوض ۱۰۰ تولہ سونا حقِ مہر قبول فرماؤ۔'' اس نے مارے شرم کے حامی بھرلی لیکن اس کے باپ، دادا اور بھائی نہ مانے۔حسینہ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بجائے ظالموں نے اسے لہولہان کر کے صندوق میں بند کر کے سپردِ دریا کیا۔ میں اتفاق سے اس کے عشق میں خراب دریا کی لہریں گن رہا تھا کہ صندوق کنارے آ لگا۔کھول کر دیکھا تو دل سے آہ نکلی، نقاب اُٹھا کے دیکھا تو محبوبہ نکلی۔ حالانکہ کئی کیسوں میں ایسا بھی ہوا تھا کہ جب عاشق صادق نے یہ شعر پڑھا۔

برقعے والی کو دیکھا تو دل سے آہ نکلی
نقاب اُٹھا کے دیکھا تو کالی سیاہ نکلی

بہرحال صندوق کیا تھا حُسن کا خزانہ تھا۔ اگرچہ میری نیت بہت خراب ہوئی لیکن دوسری طرف اس کی حالت بھی بہت خراب تھی کیونکہ صندوق میں ایک معشوق کا منی سی عورت ، اس کے دیکھنے سے ہوش جاتے رہے۔لہو میں تربتر، آنکھیں بند کئے کلبلاتی ہے۔آہستہ آہستہ ہونٹ ہلتے ہیں اور آواز منہ سے نکلتی ہے۔اے کمبخت بے وفا۔۔۔اے ظالم پُر جفا، بدلہ اس بھلائی عشق اور محبت کا۔۔۔یہی تھا جو تو نے دیا۔۔۔بھلا مجھے کیا خبر تھی کہ عقدِ ثانی دوسری شادی کو کہتے ہیں۔ایک بیوی کا شوہر اور دو بچوں کا باپ اور پھر بھی شادی کا متمنی۔۔۔حیف ہے تجھ پر۔۔۔تو دو سال سے مجھے بیوقوف بناتا رہا اور سبز باغ دکھاتا رہا، بھلا ایک زخم اور لگا اور مجھے جنت الفردوس میں بھجوا۔مگر وہاں بھی حوریں ہیں، نیک مظلوم

عزتوں کو شہد اور کھجوروں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔۔۔ اُلٹا شوگر کی موئی بیماری لگے گی۔۔۔۔ مرنے کا بھی فائدہ۔۔۔"

یہ کہہ کر اُس ماہِ لقا نے بیہوشی کی حالت میں دوپٹے کا آنچل منہ میں چباڈالا جس کی وجہ سے اس کا سانس رُکنے لگا۔ وفا کی اس پُتلی نے میرے سامنے آخری ہچکی لی اور خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ میں نے پکڑے جانے کے خوف سے صندوق میں پتھر بھر کر دریا میں دھکیل دیا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری، لیکن جب سے میرے کانوں میں اس کے یاس انگیز فقرے سیسے کی طرح پگھل کر کان کے پردے پھاڑ رہے ہیں، سوچتا ہوں کہ میری بیوی نے تو چھ سال میرے ساتھ عیش و عشرت میں بسر کئے لیکن اس ماہ جبین نے شوہر کا پیار بھی نہ دیکھا بلکہ اسے محبوب کی محبت بھی نہ ملی۔ وہ صحیح کہتی ہے کہ مرنے کا فائدہ بھی مرد کو ہوگا؟ جنت، حوریں، نہریں مردوں کو ملیں گی۔ عورتوں کے لئے خدا نے جنت میں نہ بادشاہ رکھے نہ نواب، نہ راجے نہ مہاراجے۔۔۔ حد تو یہ ہے کہ اُنہیں کوئی عام مرد بھی نصیب نہیں ہوگا اور جن عورتوں کے خاوند ہیں۔۔۔ اُن کے خاوندوں کو کیا پڑی کہ پرانی باسی سڑی ہوئی بیویوں کو دوبارہ جنت میں منہ لگائیں۔۔۔ حوروں کے ہوتے عورتوں کا کیا کام۔۔۔ افسوس عورت کے ساتھ ازل سے بدسلوکی روا ہے۔ میرا اس دنیا اور اپنی چھ سالہ پرانی بیوی سے دل بھر گیا ہے۔" یہ کہہ کر تایا ابا نے عین عالمِ شباب میں دارِ فانی کو الوداع کہا۔

عمر جان المعروف آزاد بخت عرف ببلو نے لمبی سرد آہ کھینچی اور بولا "دوستو! زندگی ہے کیا۔۔۔ آہا ہا پانی کا بلبلہ!! میرے والد کا نام جانِ علم تھا۔ وہ بھی بھائی کی طرح بہت خوبصورت آدمی تھے۔ جب جوان ہوئے تو لڑکیاں اُن پر مرنے لگیں۔ اُنہوں نے یہ حال دیکھا تو ازراہِ مہربانی سب لڑکیوں کو "بہن جی" کہنے لگے کیونکہ ڈر تھا کہ لڑکیاں اس رفتار سے مرتی رہیں تو آبادی کیسے بڑھے گی اور باقی لڑکوں کا کیا بنے گا۔ والد اسمِ بامسمیٰ تھے۔ اُنہوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کبھی جلسے جلوسوں میں جاتے، کبھی تقریریں کرتے، کبھی چندے اکٹھے کرتے، کبھی دادی مرحوم سے ہزاروں روپے لے کر غریب، مظلوم اور مجروح مسلمانوں کی مدد کرتے۔ بھائیو! ان دنوں ہندوستان فسادات کی زد پر تھا۔ مسلمانوں کو روز مارا جاتا، ان کی املاک لوٹی جاتیں اور مسلمان لڑکیوں کی عزتوں پر حملے کئے جاتے۔ جانِ عالم بہت افسردہ ہوتا اور راتوں کو چھپ چھپ کر روتا۔ جہاں ہندو حملہ کرتے، جان کی پرواہ کئے بغیر مسلمانوں کو بچانے پہنچ جاتا لیکن مسلمانوں کو پیسوں کی ہر وقت ضرورت رہتی۔ اس دنیا میں مسلمان کبھی پنپے ہی نہیں، جو پنپ گئے اُن میں مسلمانی نہ رہی۔ جانِ عالم نے ایک دن سوا ایکڑ زمین چپ چاپ جا کر بیچ دی اور اس سے مجبور، بے بس مسلمانوں کی مدد کی۔ جانِ عالم کی اس ادا پر ان کے والد مر مٹے اور ایسے مٹے کہ مٹی میں مل گئے۔ اب جانِ عالم اور اُن کے خاندان کے پاس ایک محل، دو اصطبل، چار کھیت اور چند کنال کی اراضی باقی رہ گئی۔ اس کے علاوہ جانِ عالم کی والدہ کے پاس ڈھائی سو تولہ سونا اور تین سو تولہ چاندی بھی تھی۔ جانِ عالم نے تحریکِ پاکستان پر یہ رقم بھی جھونک دی، حتیٰ کہ اب صرف ایک حویلی باقی رہ گئی جس میں پورا خاندان پاؤں پسارے ہوا تھا۔ جانِ عالم کی والدہ کہتیں کہ جانِ عالم کو پاکستان سے عشق ہے، آزادی کا متوالا ہے، جب اس کے ہاں بیٹا ہوگا تو اس کا نام ہم "آزاد بخت" رکھیں گے۔ پاکستان بنا تو چچا قاسم جان نے فٹافٹ کلیم کرایا اور اس وسیع و عریض حویلی کے عیوض جو گھر لیا وہ اپنے نام کرا لیا۔ جانِ عالم اگرچہ جوان تھا لیکن پاکستان بننے کے سترہ برس بعد کہیں جا کر سہرہ باندھا۔ جانِ عالم پاکستان کی خدمت میں چور چور تھا۔ کبھی مہاجرین کو بساتا، کبھی لٹے پٹے لوگوں کو آباد کرتا۔ کسی کو نوکری دلاتا، کسی کو گھر، کسی کو دکان، کسی کو رقم۔ سترہ سال مسلسل جانِ عالم پاکستان کی خدمت میں دیوانہ وار کام کرتا رہا۔ ایک دن جانِ عالم کی ماں نے کہا کہ آزاد بخت پرانا دقیانوسی نام ہے، ویسے بھی جس آزادی کے نام پر پاکستان بنا تھا وہ تو یہاں مفقود ہے اور جو آزادی ملی ہے اس سے ہول آتا ہے، لہٰذا میں اپنے عظیم شوہر کے نام پر بیٹے کا نام پر "عمر جان" رکھوں گی تاکہ خدا اِسے لمبی عمر دے۔ دونوں ساس بہوئیں میں خاصی

چونچلیں چلیں۔ بڑی مشکل سے طے پایا کہ دونوں نام رکھے جائیں۔ اب ماں ،اور اُن کے ہمنوا مجھے آزاد بخت کہتے جبکہ دادی اور ان کے حامی مجھے عمر جان پکارتے۔ میرے باپ نے مجھے مشکل سے بچانے کے لئے ''ببلو'' کہنا شروع کر دیا۔ پاکستان کی خدمت کرتے کرتے میرے باپ کی کمر دوہری ہو چکی تھی لیکن کسی نے اُنہیں نوکری نہ دی۔ کچھ عرصے صبر، دال روٹی اور میری دادی کے بچے کھچے زیورات سے کام چلتا رہا۔ دادی مر گئیں تو چچا نے اُس گھر سے ہم سب کو کان پکڑ کر نکال دیا جو انہوں نے کلیم میں لیا تھا۔ شکر ہوا کہ میں بی۔ اے کر چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ نوکری کر کے گھر کے حالات بدل دوں گا۔ سی ایس ایس کروں گا اور بیوروکریٹ بن جاؤں گا۔ تین بار سی ایس ایس کا امتحان دیا۔ ہر بار فرسٹ آیا لیکن تینوں بار انٹرویو میں ناکام رہا۔ پھر سوچا چلو کوئی ٹیچر یا معمولی افسر ہی لگ جاؤں اس دوران ایم۔ اے بھی کر لیا مگر مجھے نوکری نہ ملی۔ پھر سوچا کلرک کے لئے اپلائی کروں لیکن وہاں بھی نوکری نہ ملی کہ جی آپ اوور ایج ہو گئے ہیں۔ تھک ہار کر چپڑاسی کے لئے درخواست دی لیکن اُنہوں نے مجھے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہمیں عمر رسیدہ چپڑاسی چاہیے، یہاں لڑکیاں کام کرتی ہیں، یہ نہ ہو وہ کام کے بجائے اِس لونڈے پر دھیان دینے لگیں۔ کچھ عرصہ بعد مجھے یہ جواب ملنے لگا کہ ہمیں فریش پوسٹ گریجویٹ چاہئیں، آپ تو کافی باسی اور پرانے ہو چکے ہیں۔ غرض میرے قلندر دوستو، ایک دن زندگی سے ہو کر میں نیلا تھوتھا کھانے لگا کہ والدِ بزرگوار آ گئے اور بولے کہ بیٹا کیوں جان کے درپے ہے، تو اکلوتی اولادِ نرینہ ہے گھر میں۔۔۔ ورنہ کوئی ثمینہ ہے کوئی زرینہ، کوئی تہمینہ، فہمینہ اور نگینہ ہے۔ تو پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی، مجھ بڈھے کا وارث، ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک، ایسا کیوں کرتا ہے۔ میں مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری رہا۔ ۱۹۴۷ء میں صدر بنا، قائدِ اعظم نے سینے سے لگایا اور فرمایا کہ پاکستان میں کوئی تمھاری حق تلفی نہیں کرے گا۔ تمھیں عزت، دولت، سکھ اور خوشیاں ملیں گی لیکن ہم تو عزت کے لئے بھی ترس گئے ہیں اور دولت کے نام پر پیسے پیسے کو ترسے ہوئے ہیں۔ کیا معلوم تھا کہ پاکستان آ کر بھوکوں مر جائیں گے اور اکلوتا بیٹا حالات سے دلبرداشتہ ہو کر مرنے کی ٹھانے گا۔۔۔ یہ کہا اور کہہ کر مر گئے۔ سوئم پر میں سیپارے اور گھٹلیاں پڑھ رہا تھا کہ لوگوں کے طنزیہ فقرے میرے کانوں میں اُبلے ہوئے تیل کی طرح گرنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے'' چلو یار یہاں دماغ کھپانے اور وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ، نہ کھانے میں زردہ ہے نہ پلاؤ نہ قورمہ ہے نہ دیسی گھی کے شیر مال، نہ تنبو نہ قناتیں، نہ کرسیاں نہ صوفے۔۔۔ خالی چائے اور دو چار کلو کھٹل چنے ہیں، ہونہہ!! غریب آدمی کا مرنا بھی بے فائدہ ہے، دفع کرو یار۔۔۔'' یہ سُن کر میرا دل پھٹ گیا مگر سب جا چکے تھے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شریف آدمی مجھے دیکھ کر خود بھی روتا ہے۔ وہ میرے پاس آیا اور بولا'' میں خواجہ سگ پرست ہوں۔ میں مانتا ہوں، جانتا ہوں کہ اس آزاد ملک میں جن لوگوں نے جانوں اور مالوں کے نذرانے دئے، اپنا تن من دھن لٹایا، آج وہی مفلوک الحال ہیں اور جنھوں نے پاکستان میں کرپشن کی، وہی خوشحال، فارغ البال ہیں۔ ان کے پاس مال و دولت کی ریل پیل ہے۔ ان کے پاس گاڑی، بنگلہ، بنک بیلنس اور اندرون و بیرونِ ملک جائیدادیں ہیں۔ لوگ ایسے ہی کمینوں کو اُٹھ کر سلام کرتے ہیں اور شرفاء کو اُن کے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔ تمھارے باپ کے ساتھ اور تمھارے خاندان کے ساتھ بڑا ظلم، ناانصافی ہوئی۔ تمھیں اور تمھارے باپ کو آج پاکستان کے اہم عہدوں پر ہونا چاہیے تھا لیکن اِس ملک میں ایماندار، شریف اور سچے لوگوں کو چٹنی کی طرح پیس دیا گیا ہے، مگر تم میری دکھ بھری کہانی سنو گے تو اپنا کرب بھول جاؤ گے۔ لو سنو میرے اوپر کیا بیتی، اے جوانِ رعنا! اگر تجھ پر وقت مہربان ہوتا تو میں تجھے ''اے آقا یا اے بادشاہ'' کہتا۔ میری داستان دنیا کی بے ثباتی، خود غرضی اور نفسا نفسی پر مشتمل ہے۔ تمھارے باپ کی طرح ہم بھی تین بھائی تھے۔ میں سب سے چھوٹا تھا اور سمجھ عقل کا کھوٹا تھا۔ نادان تھا کہ بھائیوں کو باپ جانا، انہوں نے باپ کے مرنے کے بعد مال و متاع قبضے میں کر لیا اور مجھے چلتا کیا۔ میں نے دنیا جہان کی خاک چھانی۔ مجھ پر ایک امیر زادی عاشق ہوئی اور محبوب سے دولہا بنا کر

لے گئی۔ اپنی جوانی اور دولت مجھ پر نچھاور کی۔ میں نے کاروبار کیا اور لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ ایک دن مجھے اپنے دونوں کمینے بھائی خستہ وخراب بھیک مانگتے ملے۔ میں دونوں کو گھر لایا، نہلایا، اچھی خوراک دی اور پھر بیوی سے ملوایا۔ دونوں میرا ٹھاٹھ باٹھ، دولت اور بیوی کو دیکھ کر ریجھ گئے۔ میں نے اپنے کاروبار میں دونوں کو شریک کیا۔ دونوں نے بیوی اور میرے کاروبار پر قبضے کا منصوبہ بنایا اور مجھے دریا بُرد کر کے ایک بیوی کا، دوسرا کاروبار کا مالک بن گیا۔ خدا کی کرنی کہ ایک شہزادی دریا کی سیر کر رہی تھی۔ مجھے دریا کی لہروں نے اس کے قریب کر دیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور دل و جان سے مجھ پر فریفتہ ہو گئی۔ شہزادی نے مجھ سے شادی کی درخواست کی جو میں نے صدقِ دل سے قبول کی۔ شادی کے بعد میں شہزادہ بن گیا اور مزے کی زندگی کرنے لگا۔ ایک دن محل کی چھت سے دیکھا تو ایک یہودی نے دو آدمیوں کو بندر کی طرح زنجیر گلے میں ڈال کر پکڑ رکھا تھا اور ان کا تماشہ دکھا رہا تھا۔ دونوں کی حالت گیدڑ سے بدتر تھی۔ غور سے دیکھا تو میرے بھائی تھے۔ یہ منظر دیکھ کر دل کٹ گیا۔ فوراً جا کر اشرفیاں لیں، روپے لئے اور باہر کو چل دیا۔ جہاں پناہ! یہ دونوں بدبخت ناشدنی مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ حضورِ والا سچ کہتا ہوں کہ میں نے اُنہیں اشرفیاں دے کر یہودی کی قید سے چھڑانا چاہا تو یہودی نے یہ کہہ کر اشرفیاں لینے سے انکار کر دیا کہ بھائی اشرفیاں تو مسلمانوں کی کرنسی ہے اور ان دو ٹکے کے غلاموں پر آپ اشرفیاں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ لائیں چند روپے دے دیں اور ان نمک حراموں کو آزاد کرا لیں۔ تو قبلۂ عالم، میں نے اپنے بھائیوں کو بڑے حمام میں ڈیٹول سے نہلوایا، حجامت بنوائی، ست رنگے کھانے کھلائے اور قیمتی پوشاک پہنوا کر اپنی شہزادی سے ملوایا۔ ان میں سے ایک شہزادی پر، دوسرا محل پر عاشق ہو گیا۔ چالیسویں دن میرے نامراد بھائیوں نے مجھے باندھ کر دریا میں پھینک دیا۔ ایک نے شہزادی سے شادی کر لی اور دوسرا بادشاہ بن گیا۔ اے بیروزگار بادشاہ، افلاک کے مارے! سُن!! سات دن دریا میں اور اتنے دن بھائیوں کے بہتان کے باعث دانہ میسر نہ آیا۔ پانی میں بے بس ولاچار غوطے

کھاتا اور پانی پیتا تھا کہ ایک گل رُخ، دلنشین رانی نے اپنی رتھ سے مجھے دیکھا اور دل وجان سے مجھ پر مرمٹی۔۔۔ میں۔۔۔''

آزاد بخت عرف ببلو نے خواجہ سگ پرست کی رقت انگیز کہانی سن کر کہا کہ بس، بس۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ رانی نے بھی آپ سے منت سماجت کر کے اور بھگوان کی سوگند دے کر شادی کر لی۔'' خواجہ سگ پرست نے جوش سے کہا ''ارے! آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' آزاد بخت عرف ببلو نے کہا ''یار خواجہ سگ پرست، مجھے سب پتہ ہے، میر امن کی ''قصہ چہار درویش'' ہم آٹھویں جماعت سے پڑھتے آرہے ہیں۔ رانی سے شادی کے بعد تمھاری ملاقات پھر تمھارے بھائیوں سے ہوئی جو خستہ و خراب تھے۔ اُنہوں نے پھر رانی اور راجدھانی پر قبضہ کر لیا اور تمھیں دریا میں پھنکوا دیا۔ رانی کا کتا تمھارا وفادار اور خیر خواہ تھا۔ اس نے تمھاری جان بچائی۔ تم نے رانی کو مسلمان کر کے نکاح پڑھوایا اور راجدھانی واپس لی۔ بھائیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لوہے کے پنجروں میں بند کروایا۔ کتے کے گلے میں سونے کا پٹہ ڈلوایا۔ اب اپنے بھائیوں کو کتے کا جھوٹا کھلاتے ہو، جب تمھاری بیوی میکے جاتی ہے یا روٹھ جاتی ہے تو کتے کو اپنے ساتھ بستر پر سلاتے ہو۔ رانی کتے سے حسد کرتی ہے، تم کتے پر رشک کرتے ہو۔ اسی لئے لوگ تمھیں خواجہ سگ پرست کہتے ہیں۔۔۔ یار ایک بات بتاؤ، تم نے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو کولہو میں کیوں نہ پلوا دیا یا پنجروں میں قید کروایا، یا زنداں میں پھنکوایا؟ وہی ہر بار تمھیں دریا میں پھینکتے رہے۔ بندۂ خدا تم انسان ہو یا گھسیارے؟ اس کہانی میں عبرت کا ہر پہلو تمھارے لئے ہے، ہمارے لئے نہیں۔۔۔ بہر حال تمھاری غمزدہ سٹوری سے میرا وقتی طور پر غم غلط ہو گیا ہے۔''

آزاد بخت نے چاروں درویشوں سے کہا کہ بھائیو! میں اب چھتیس برس کا بوڑھا جوان ہوں۔ ابھی تک نوکری نہیں ملی۔ تین بہنوں کی مجبور ہو کر تین شادی شدہ گھسے پٹے اُدھیڑ عمر مردوں سے شادی کر چکا ہوں۔ دو بہنیں اور ایک ماں اب بھی سینے پر مونگ دلنے کو موجود ہیں۔ شادی کے خواب رات کے علاوہ دن میں بھی آ کر ستاتے ہیں مگر اُنہیں تھپک تھپک کر سُلا دیتا ہوں۔ بیروزگاری اب جان لیوا بیماری بن چکی ہے۔ حکومت سوائے میٹھی میٹھی باتوں کے کچھ نہیں کرتی۔ حکومت کہتی ہے کہ غربت مٹانے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ غریب مٹا دئے جائیں۔ میں اس زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں، کسی کے پاس مرنے کا کوئی آسان نسخہ ہو تو بتاؤ۔''

آزاد بخت عرف ببلو کی داستان میں محرومیوں، مایوسیوں اور وسوسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ کسی لڑکی سے محبت کی رنگین کہانی، نہ جرم و سزا، نہ سنسنی خیزی، نہ تجسس، غرضیکہ بیروزگار نوجوان کی کہانی بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی مانند ہے لیکن سب درویشوں نے غور سے سُنی اور اپنی رائے محفوظ رکھی۔ اب پہلے درویش کی باری تھی۔ یہ درویش دہشت گرد تھا۔ دہشت گرد نے اپنے منہ سے چادر ہٹائی اور فرنچ کٹ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنا قصہ کچھ یوں شروع کیا ''اے صاحبو! میرا باپ ملک فارس کا ایک بہت بڑا سوداگر تھا۔ ہم دو بہن بھائی تھے، بہن بڑی اور میں چھوٹا تھا۔ بہن کی شادی ایک اونچے بڑے گھر میں ہو چکی تھی، کیسا کہ آج کل کی ماؤں کا دستور ہے کہ بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں سے پیار کرتی ہیں اور جہیز کے علاوہ باپ کی جائیداد میں سے چوری چھپے اُنہیں بھرتی رہتی ہیں۔ بیٹی کو ساری جائیداد قسطوں میں پہنچا دیتی ہیں اور بیٹوں کو اللہ توکل پر چھوڑ دیتی ہیں۔ میری ماں کا بھی یہی حال تھا۔ میری بہن بہت سارا جہیز، پلاٹ نقدی لے کر گئی، اس کے باوجود اپنے پھوہڑ پنے اور زباں درازی کی وجہ سے اس کی سسرال میں کسی سے نہ بنتی تھی، حتیٰ کہ شوہر سے بھی نہیں۔۔۔ مگر بہن جہاندیدہ تھی، اس لئے رات کو شوہر سے صلح کر لیتی۔ ایک دن ماں کو خبر ملی کہ بہن کو اس کے شوہر نے بدتمیزی پر تھپڑ مارا ہے۔ میری ماں داماد کو بکتے جھکتے سامان باندھنے لگی، ساتھ ہی اس نے ایک کروڑ کے شیئرز بھی رکھ لئے تا کہ داماد کے ہاتھ پر رکھ کر اسے رام کر سکے لیکن میرے باپ نے دیکھ لیا اور شیئرز چھین لئے۔ ماں صدمے سے جاں بحق ہو گئی۔ کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ باپ بھی چل بسا۔ اب میرے پاس ایک کروڑ کے شیئرز کے علاوہ اراضی، بینک بیلنس، کوٹھی اور مال و متاع تھا۔ میں نے دھوم دھام سے باپ کا سوئم، دسواں اور چہلم کیا۔ ایک عالیشان مقبرہ بنوایا۔ اتنی دولت دیکھ کر کچھ لوگ

میرے قریب آ گئے۔ میں ٹین ایجر تھا، ناسمجھ، نابالغ ،نادان۔۔۔دوستوں نے شراب کباب پر لگا دیا۔ چھ ماہ میں دو کروڑ کی جائیداد ختم ہوگئی۔ اب میں پائی پائی کا محتاج تھا۔ ان سب نے مل کر مجھے معذور اور اپاہج بنا دیا۔ بہت جلد میں فاقے کاٹنے لگا۔ کاغذات ٹٹولے تو ماں کے خطوط ملے جن میں اس نے میری بہن کو زیور، روپیہ، ڈالر، پرائز بانڈ، کمیٹیاں اور جانے کیا کیا بھجوایا تھا۔ میں پڑھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ شکر ہے کہ میں اپنے باپ کی طرح خط پڑھ کر مرا نہیں۔ میں بھی حیران تھا کہ میرا باپ ماں کے فوراً بعد کیسے مر گیا یعنی کہ اگر دو کروڑ مجھ پر لگا ہے تو بہن اب تک تین کروڑ ہضم کر چکی ہے اور کسی کے فرشتوں کو خبر تک نہیں ہوئی۔ از رُوئے قانون یہ جائیداد اور روپیہ پیسہ میرا تھا مگر میری بہن قبضہ کئے بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا چلو ماں جائی ہے۔ کوئی بات نہیں، میں اپنی بہن کے پاس کچھ دن رہنے کے لئے چلا گیا تاکہ بہنوئی سے کچھ سیکھ سمجھ سکوں۔ وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے کر، گلے مل کر بہت روئی۔ تل ماش اور کالے تکے مجھ پر صدقے کئے حالانکہ اگر وہ چاہتی تو ایک کالی مرغی یا کالا بکرا بھی مجھ پر وار سکتی تھی مگر وہ سدا کی کنجوس اور خود غرض تھی۔ اس کا تو اسی بات پر منہ پھول گیا کہ میں اس کے لئے تحفے تحائف لے کر کیوں نہیں آیا اور اس بات پر بھی کہ میں یہاں کچھ عرصہ رہنے اور سیکھنے کے لئے آیا ہوں، تو کیوں آیا ہوں۔ اس نے پہلے دن سے مجھے بوجھ سمجھا، میرا ہی مال کھا رہی تھی اور مجھے ہی آنکھیں دکھا رہی تھی مگر اے بھائیو!! میری بہن تھی بڑی ڈرامے باز، موقع دیکھتے ہی کردار اور سین میں تبدیلی لے آتی۔ میری بی جمالو قسم کی بہن واقعی برِصغیر کی صحیح کاپی تھی۔ پاکستان کے ایک عظیم نقاد ڈاکٹر ایل بی ڈبلیو بخاری نے اس نام نہاد بہن کے کردار کو بہت سراہا ہے اور اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "پہلے درویش کی بہن سرتاسر ہندوستانی ہے جس طرح کالی داس کی "شکنتلا" ہر ہندو کی بیٹی ہے اسی طرح یہ برصغیر کے ہر مسلمان کی بہن بیٹی ہے جو بیک وقت بھائی، شوہر، مرے ہوئے باپ اور پیدا ہونے والے بیٹے کی جائیداد پر قبضے کے منصوبے بناتی اور ہشیاری سے مال ہڑپ کرتی ہے، جو بھائی کو کنگلا کرنے کے باوجود مظلوم اور قربانی کا بکرا بننے کی ایکٹنگ کرتی رہتی ہے۔"

پہلے درویش نے باقی درویشوں کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا کہ بہن کے ذکر پر تمھیں نیند ستانے لگی، صبر سے کام لو، میری داستان بہت رنگین ہے لیکن اس اللہ مارے میر امّن نے میری کہانی میں بہن کا کردار شروع میں ہی ٹھونس دیا ہے۔ لیکن اچھا ہے کہ آج تمھیں اور دنیا کو ایسی چالاک اور دھوکہ باز اور منافق بہنوں کا علم ہوجائے جو باپ بھائیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہیں۔۔۔ ہاں تو مہربانو!!! میری بہن نے مجھے دو دن تو کچھ نہ کہا مگر تیسرے دن آ کر بولی کہ ایک دن مہمان، دوسرے دن مہمان، تیسرے دن بلائے جان۔۔۔اے بیرن، تو میری آنکھوں کی پتلی، ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی، تیرے آنے سے میرا کلیجہ گرم ہوا، تیرے جانے سے ٹھنڈا ہوگا۔ اے میرے ناعاقبت اندیش بھائی! مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے، کھانے اور ٹھونسنے کے لئے نہیں۔ گھر میں بیٹھ کر روٹیاں توڑنا لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بیٹھتا ہے، اس کو دین برادری کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ اس شہر کے سب آدمی بے سبب تمھارے رہنے پر باتیں کرتے ہیں کہ یہ نہایت بے غیرتی، کمینگی اور ذلالت ہے۔ میری تمھاری جگ ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں تیری چمڑی بنا کر پہنوں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔"

پھر میرے امان ضامن کا روپیہ باندھ کر اور دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر، خوشی دبا کر بولی "جاؤ سدھارو، تمھیں خدا کو سونپا، اب جیتے جی منہ نہ دکھانا۔۔۔ اگر آنا تو مال و متاع کے ساتھ آنا ورنہ خدا حافظ!!"

پہلے درویش نے کہا کہ بہنوں کا دستور ہے کہ چھاتیوں پر مونگ دلنے آ جاتی ہیں اور ایک دو ماہ سے پہلے ٹلنے کا نام نہیں لیتیں۔ ہر دوسرے مہینے ایک ماہ کے لئے بھائی کے گھر ڈیرہ ڈال لیتی ہیں۔۔۔ تب انہیں شرم نہیں آتی کہ بھائی بیچارہ ان کا اور ان کے بچوں کا خرچہ پانی کیسے اُٹھائے گا۔ ہر وقت مطالبے، ہر وقت فرمائشیں اور ہر وقت اعتراضات کر کے بھائیوں، بھاوجوں اور بھتیجے بھتیجیوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔ جو کنواری ہوتی ہیں، وہ حق

جتا جتا کر باپ کے علاوہ بھائیوں کی بھی جیبیں خالی کروالیتی ہیں۔ ایک کپ چائے پلا کر یا دو روٹیاں کھلا کر خدمتوں کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں۔ یار درویش بھائیو! یہ عورتیں رشتوں کے نام پر ہمیں کس قدر بیوقوف بناتی ہیں۔ بیوی بیچاری جو ہر قدم پر ساتھ دیتی ہے اور تن من دھن سے خدمت کرتی ہے مگر ہم اسے خاطر میں نہیں لاتے اور ہمیشہ اس پر فرائض کا ملبہ ڈال کر حقوق سے بھاگتے رہتے ہیں۔ اس کی محبت، ایثار، خدمت اور قربانی کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر ماں، بہن آنکھوں میں انگلیاں کریں یا لوٹ گھسوٹ کریں، ہم ان پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیتے ہیں۔

پہلا درویش بولا کہ میں اپنی بہن کے چنگل سے نکلا تو مجھے ترقی اور کامیابی نصیب ہوئی، ایک زہرہ جبین مجھے راہ میں ملی اور میرے حُسن پر فریفتہ ہوگئی۔ بولی کہ میں کالج جا رہی ہوں، کیا تم مجھے اپنا موبائل نمبر دے سکتے ہو؟ میں نے بتایا کہ اے حسینۂ عالم، میں غربت اور فرقت کا مارا موبائل افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس ماہ جبین نے کالج کا ارادہ ملتوی کیا اور لارنس گارڈن کی پہاڑی پر کب مجھ سے میرے مسائل و افکار پر گفت و شنید کی، بولی کہ تم نے ناحق کالج چھوڑا۔ تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اگر تم نے دو سال میں گریجویشن کر لیا تو میں اپنے باپ سے کہہ کر تمھیں نوکری دلوا دوں گی۔ دیکھو! تعلیم بڑی نعمت ہے، تم خاندانی اور شریف لڑکے لگتے ہو۔ دل لگا کر پرائیویٹ امتحان دے لو تو رزلٹ آنے پر نوکری اور میں تمھیں مل جاؤں گی۔" میں نے کہا کہ نیک بخت، تمھارے میرے ارادے نیک سہی، مگر میرے پاس کالج داخلہ فیس اور کتابوں کے پیسے کہاں۔۔۔ میری بہن نے تو مجھے صرف دس روپے اپنے سر سے اُتار کر دئے تھے تاکہ میں اس شہر سے دفعان ہو جاؤں۔ وہ گلبدن میرے آنسو پونچھ کر بولی کہ آج کل زیادہ تر اسی برانڈ کی بہنیں آ رہی ہیں جو صرف اُن بھائیوں سے محبتیں جتاتی ہیں جن کی جیبیں، بریف کیس اور بینک بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ غریب بھائیوں کو تو یہ گیلے کپڑوں کی طرح نچوڑ لیتی ہیں۔ تم غم نہ کرو، یہ میرا موبائل اور گھڑی لو۔ انہیں بیچ کر داخلہ فیس جمع کراؤ۔۔۔ اور یہ لو سو روپے جو میں نے سہیلیوں کو آئسکریم کھلانے کے لئے رکھے تھے۔ جاؤ خدا تمھارا حامی و ناصر۔۔۔ ہم جلد ملیں گے بریک کے بعد۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں نے دو سال بعد بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ اس نیک دل دوشیزہ نے بڑی خوشی منائی۔ کہنے لگی کہ تم ایم اے بھی کر لو کیونکہ ہمارا خاندان بڑا پڑھا لکھا ہے اور میں بھی آج کل یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر رہی ہوں۔ میں تمھیں ہر ماہ اپنا جیب خرچ دے دیا کروں گی۔ تم سکون سے بس پڑھا کرو۔ میں نے دو سال بعد ایم اے کیا اور پورے پنجاب میں ٹاپ کیا۔ مجھے سکالرشپ مل گئی اور امریکہ سے مجھے پی ایچ ڈی کی آفر ہوئی۔ وہ معصوم لڑکی بہت خوش ہوئی۔ اس نے مجھے نجانے کس طرح ایک لاکھ روپیہ لا کر ہاتھ میں دیا۔ میں شرمندگی سے زمین میں گڑ گیا تو بولی کہ یہ سب تم پر اُدھار رہا۔ شادی کے بعد مع سود لوٹا دینا۔۔۔ خدارا شرمندہ نہ ہو، میرا دل کٹتا ہے۔"

اس نے مجھے ائرپورٹ پر سی آف کیا اور پہلی بار میرے ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگالئے۔ میں امریکہ چلا گیا۔ جب پی ایچ ڈی کر کے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کے گھر والوں نے زبردستی اس کی شادی کر دی لیکن حجلۂ عروسی میں اس نے زہر پھانک لیا۔ میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ ایک سال ایک ماہ تک اپنی محسنہ کا غم مناتا رہا لیکن آخر کب تک۔۔۔ خیال تھا کہ مجھے کوئی شاندار جاب مل جائے گی لیکن چار سال تک درخواستیں اور انٹرویو دیتا رہا اور ہر بار ٹکا سا جواب۔۔۔ جب بڑی نوکری ملنے کی اُمید نہ رہی تو چھوٹی موٹی نوکریوں کے لئے مارا مارا پھرتا رہا۔ کبھی خانساماں، بیرے، چپڑاسی، ہرکارے کی نوکریوں کے لئے اپلائی کیا لیکن کوئی پی ایچ ڈی لڑکے کو نوکری دینے پر راضی نہیں ہوتا تھا کیونکہ اکثر افسران میٹرک تھرڈ ڈویژن اور پروموٹی (promotee) تھے۔ غرض اس طرح بے یار و مددگار مجبوراً دو چار ٹیوٹر کے طور پر بچوں کو پڑھانے ان کے بنگلوں میں گیا۔ ان کوٹھی بنگلوں کے مالکان چند سال پہلے تک کمی کمینے تھے۔ ان نودولتیوں اور جاہلوں نے انسان اور علم کی جو بے حرمتی کر رکھی تھی اس پر میں خون کے آنسو روتا۔ یہ اور ان کے بچے میرے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک کرتے کہ اگر میں اس کی تفصیل بیاں کر دوں تو لوگ پڑھنا اور استاد بننا چھوڑ دیں۔

ان کی چھچھوری حرکتیں اور نودولتیانہ باتیں آدمی کو خودکشی پر مائل کرتی تھیں اور تعجب اس پر ہوتا کہ ہر شخص ان کو بڑے مؤدب انداز میں سلام کرتا۔ چاپلوسی اور خوشامد میں بالکل گر جاتا اور بجائے اس کے کہ کوئی مجھے ''سر'' کہے، سب اُنہیں سر کہتے۔ سچ ہے کہ دولت بڑی نعمت ہے اور دولت کے بغیر آدمی دو کوڑی کا ہے۔ دھوبی، نائی، قصائی، حلوائی، قاری، مولوی، آپریٹر، پوسٹ مین، ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، حد تو یہ ہے کہ سکولوں، کالجوں کے پرنسپلز بھی اُنہیں ''سر'' کہہ کر بلاتے اور مجھے گوالا، نائی قصائی بھی ''اوئے'' کہہ کر پکارتے۔۔۔ انسانیت کی تذلیل اور ان نودولتیوں کے ہاتھوں اپنی روز روز کی بے عزتی کے بعد میں پھر بے روزگار ہوگیا۔ پانچ دن اور چار راتیں اسی فاقے اور سوچ بچار میں گزر گئیں۔ ماں باپ مرکھپ گئے۔ بہن نے کبھی پلٹ کر نہ پوچھا، اگر میری جگہ میری بہن ہوتی تو میرے گھر پاؤں پسار کر پڑ رہتی اور مارے تاویلوں کے میرے ناک میں دم کر دیتی۔ مجھے بے حس، غیر ذمہ دار، خودغرض، بے ضمیر، نااہل، نالائق اور گھٹیا قرار دے کر ہاتھ پاؤں پھیلا کر مزے سے میرے گھر میں رہا کرتی۔ مجھے میرے فرائض اور اپنے حقوق یاد دلا دلا کر ناطقہ بند کر دیتی، دین دنیا کے عذاب سے ڈراتی، ٹسوے بہاتی اور بڑے آرام سے میرے سر پر عیش کرتی لیکن اب جب وہ خود عیش میں تھی تو اُسے ہوش بھی نہیں تھا کہ میں اس کا سگا اور چھوٹا بھائی ہوں۔ بھوک اور افلاس سے ناچار میں اس کے گھر پیدل ہی چل پڑا۔ چودہ کلومیٹر کا فاصلہ رات بھر میں پیدل کاٹا، صبح کاذب کے وقت بہن کے گھر پہنچا۔ اسی نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ میری حالت دیکھ کر ڈر گئی کہ بھائی خستہ وخراب اور مدد کا طالب ہے۔ چار دن گھر رکھنا اور دو روٹیاں کھلانی پڑیں گی۔ فوراً ڈرامائی انداز میں بولی ''اے کم بخت فقیر، تجھے شرم نہیں آتی بھیک مانگتے ہوئے؟ ہٹا کٹا مسٹنڈا ہو کر لوگوں کے گھروں میں روٹی اور پیسے مانگتا ہے۔ بے شرم تجھے شرم نہیں آتی، سوئے ہوؤں کو جگاتے ہوئے، چل ہٹ پرے مر ورنہ ابھی پولیس بلاتی ہوں اور تیرے ہاتھ پاؤں تڑواتی ہوں، جا دفع ہو!''

میرا دل بھر آیا کہ کیسی ماں جائی ہے، سگے بھائی کو پہچاننے سے انکاری ہے۔ میں نے ڈھیٹ ہو کر کہا ''باجی برکتے، خدا کے لئے تمھیں کیا ہوا۔۔۔ کیا تمھاری آئی سائٹ کمزور ہوگئی ہے۔۔۔ ارے اپنے بھائی کو نہیں پہچانا، باجی یہ میں ہوں۔''

باجی برکتے نے بڑی مکر بازی سے کہا ''اے چل کمینے بکواس نہ کر، میرا بھائی تو چھ سات سال سے امریکہ گیا تھا، بیچارا وہیں مرکھپ گیا، ہم نے تو اس کے قل، فاتحہ چالیسواں، سب کر چکے۔۔۔ تو میرا بھائی نہیں، میرے بھائی کا بھوت ہے۔ ویسے بھی وہ سدا کا نکھٹو، ہڈ حرام تھا، اچھا ہوا مر گیا۔'' یہ کہہ کر باجی نے کھٹاک سے لوہے کا دروازہ بند کر دیا اور دروازے کے پٹ میں میری دو انگلیاں بُری طرح زخمی ہوگئیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی دولت رشتوں کی اساس ہے۔ میں بے سُدھ ہو سڑک کے نزدیک گر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو آدمی نہر کے پل کے نیچے بم نصب کر رہے ہیں۔ میں گرتا پڑتا اُن کے پاس پہنچا اور بولا ''کچھ کھانے کو ہے تو دو۔'' بولے کہ ''دو بم ہیں، کھالو گے؟'' میں بھوک سے مر رہا تھا بولا ''ہاں بھائی کھالوں گا۔''

اُنہوں نے حیران ہو کر دیکھا اور مجھ سے کہا کہ اگر یہ دونوں بم سامنے والی گلی کے قریب فٹ کر دو تو ہم تمھیں اس کے ایک لاکھ روپے دیں گے۔ اگر شرط منظور ہے تو یہ لو لاکھ روپیہ اور بم۔''

بھوک کی وجہ سے مجھے چکر آرہے تھے، میں نے حامی بھر لی۔ یہ دنیا جب اتنی ظالم ہے کہ کسی بھوکے کو ایک روٹی دینے کی روادار نہیں۔ ایک پی ایچ ڈی ڈاکٹر اس زمین پر ذلیل ہو رہا ہے، سگی بہن نے دشمنوں سے بدتر سلوک کیا تو پھر آدمی کس کے لئے انصاف، سچائی اور ایمانداری کی راگنی الاپے۔ میرے جیسے انسان تو مر رہے ہیں اور نودولتیے کپاس کی فصل کی طرح اُگ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے بم رکھ دیئے اور ایک لاکھ لے لیا۔ اب میں اس تنظیم کا ایک اہم رُکن ہوں۔ پیارے بھائیو! آج میرے پاس چار کنال کی کوٹھی ہے۔ گاڑی بینک بیلنس اور سب کچھ ہے، میری بہن کو جب میرے حالات بدلنے کا علم ہوا تو دوڑی چلی آئی۔ واری صدقے ہوئی اور بولی کہ بھیا، تو میرے ماں باپ کی

آخری اور پیاری نشانی ہے۔ تیری بہن کو نئی گاڑی خریدنے کے لئے بیس لاکھ کی ضرورت ہے۔ مجھے بیس لاکھ دے کر ثابت کر دے کہ بہنوں کا فرض بھائیوں کو بھرنا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے اپنی بہن سے کہا کہ تیری خیر اسی میں ہے کہ تو یہاں سے چلی جا۔ میری بہن بکتی جھکتی اور کوستی، کاٹتی چلی گئی۔ خدا کی کرنی کہ جتنے کوسنے اور بددعائیں اس نے مجھے دئے تھے، سب اُسی کو لگ گئے۔ رات کو اس کے گھر میں آگ لگ گئی۔ شوہر جل کر بھسم ہو گیا، خود بھی جل گئی اور سارا گھر مٹی کا ڈھیر بن گیا۔ دوبارہ روتی پیٹتی میرے پاس آ گئی۔ میں نے رحم کھا کر رکھ لیا۔ میں نے اُنہیں دنوں نئی نئی شادی کی تھی، میری باجی برکتے نے آتے ہی میری بیوی میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے۔ کبھی کام پر لڑتی کبھی مال پر لڑتی۔ غرضیکہ اس نے دو ماہ میں گھر کو جہنم کدہ بنا دیا۔ ایک دن آیا تو بولی کہ تمھاری بیوی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ بعد میں میرے نوکر نے بتایا کہ باجی برکتے نے میری بیوی کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے۔ بڑی مشکل سے مجھے اپنی بیوی بُرے حالوں میں دارالامان میں ملی۔ میری بہن اس وقت چھت پر کھڑی تھی۔ جب میں اپنی بیوی کو گھر لایا۔ وہ غصے میں بولتی ہوئی آگے بڑھی اور دھڑام سے نیچے آ پڑی۔ اس طرح ہمیں اس بی جمالو سے نجات ملی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ تو بھائیو اور سجنو! یہ ہے میری آپ بیتی۔ آج میں شہر کی ایک معزز ہستی ہوں۔ دنیا میری ہتھیلی پر ہے۔ آج اتفاق سے میں ایک دستی بم پھینک رہا تھا کہ پولیس نے دیکھ لیا اور میں یہاں چھپتے بچتے آ گیا۔

دوسرے درویش نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہنے لگا کہ آپ مجھے جس فقیری کی حالت میں دیکھتے ہیں، اس کی وجہ ہمارے ملک کا سسٹم ہے۔ میں نے ڈبل ایم۔ اے کیا ہے۔ میں ملکِ شام کا والی ہوں۔ ایک دن بصرے کی حکومت نے مجھے دورے کی دعوت دی۔ وہاں مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی۔ اس نے شرط رکھی کہ وہ تبھی شادی کرے گی کہ جب میں اپنا ملک چھوڑ کر اس کے ملک کا باسی بنوں گا۔ میں شام چھوڑ کر بصرے چلا آیا۔ بصرے کی شہزادی بناؤ سنگھار کی انتہائی شوقین تھی۔ شہزادیٔ بصرہ سولہ سنگھار، بارہ ابرن

تخریب

حیدرآباد دکن میں ''ق'' کی جگہ عام طور پر لوگ ''خ'' بولتے ہیں۔
کسی حیدرآبادی نے مجاز کو ایک دعوت پر مدعو کرتے ہوئے کہا ''مجاز صاحب! کل میری فلاں عزیزہ کے ہاں تخریب (تقریب) ہے۔ غریب خانہ پر تشریف لائیے۔''
مجاز نے خوفزدہ ہو کر جواب دیا ''نہیں صاحب، مجھے تو معاف ہی رکھئے، مجھ سے یہ دردناک منظر دیکھا نہیں جا سکے گا۔''

بال بال موتی پرو کر، گلے میں پشواز، بادلے کی سنجاف کیے، موتیوں کا دُردامن ٹکا ہوا اور سر پر لال اوڑھنی جس میں آنچل، پلّو، لہر، گھنگھر و موری ستارے گوٹا ٹنکا ہوا، سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی، گلے میں جڑاؤ ہار، بازو بند پہنے، چوڑیاں کنگن کڑے، نتھ جھومر ٹیکا ہار انگوٹھیاں پہنے اور آدھ کلو خوبصورت میک اَپ کیے، وہ میرے سامنے آئی اور مجھ پر بجلیاں گرا کر چلتی بنی۔ جب اُس نے شادی کے لئے گھر داماد کی شرط رکھی تو میں مان گیا۔ اپنی بادشاہت کو لات ماری اور بصرے کی شہزادی کا بے دام غلام بن گیا۔

یارو، مددگارو، دلفگارو! میری سہاگ رات بڑی ڈراؤنی ثابت ہوئی۔ جونہی وہ منہ دھو کر آئی، میرے ہوش جاتے رہے۔ میں مدد مدد پکارتا رہا مگر اس نے میری ایک نہ سُنی۔ صبح مجھ میں اُٹھنے کی سکت باقی نہ تھی، میرے دل پر دہشت سوار تھی۔ بھائیو! میں آج تک سوچتا ہوں کہ میک اپ جس کسی کی بھی ایجاد ہے، وہ جہنمی سہی مگر یہ حقیقت ہے کہ میک اپ نہ ہوتا تو دنیا اِتنی حسین نہ لگتی۔ بدصورت لڑکیوں کی کبھی شادی نہ ہوتی اور اُدھیڑ عمر عورتیں کبھی جوان دکھائی نہ دیتیں۔ یار علامہ اقبال نے صحیح نہیں کہا کہ ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''۔ عورتیں جتنا میک اَپ کرتی ہیں، اگر ساری کی ساری منہ دھو کر پھریں تو یہ کائنات کتنی بے رنگ اور بیہتاک لگے۔ عورتوں سے زیادہ خوبصورت مرد ہوتے ہیں۔ اپنے ڈھلے ہوئے چہروں اور اوریجنل بیوٹی کے ساتھ کتنے کیوٹ لگتے ہیں۔ اگر عورتیں منہ دھو کے مردوں کے ساتھ مقابلۂ

حُسن میں شریک ہوں تو سارے مرد مقابلہ جیت لیں، بہرحال اے درویشو! ماضی کے بادشاہو!! حال کے قلندرو!!! میں نے ڈھائی ماہ بڑی صعوبت اور اذیّت میں کاٹے۔ ایک دن موقع ملتے ہی بھاگ لیا اور بصرے سے سیدھا پاکستان پہنچا۔ یہاں ابھی خوبصورت چہرے اور بھڑکیلے لباس اور شوخ جملے تھے۔ میں ابھی شہر میں داخل ہوا تھا کہ بیدار بخت نامی شخص نے مجھے اپنے مکان پر دعوت دی۔ شائد میرے جڑاؤ شاہی لباس سے مرعوب ہوگیا تھا۔ مکان پر پہنچ کر دیکھا کہ ضیافت کا پرتکلف اہتمام ہے۔ مجھ تنِ تنہا کے روبرو نکاول نے ایک تورے کا تورا چُن دیا۔ چار مشقاب، ایک میں یخنی پلاؤ، دوسرے میں قورمہ پلاؤ، تیسرے میں متنجن پلاؤ اور چوتھے میں کوکو پلاؤ اور ایک رقاب زردے کی۔ کئی طرح کے قلیے دو پیازہ، نرگسی، بادامی، روغنی، جوشی اور روٹیاں کئی قسم کی باقر خانی، تنگی، شیر مال، تندوری، گھر کی، بازار کی، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، نان نعمت، پراٹھے، کباب، کوفتے، تکے، مرغ، مچھلی، ملغوبہ، شب دیگ۔ دم پُخت، حلیم، ہریسا، شیر برنج، فیرنی، کھیر، حلوہ فالودہ۔

میں نے اُسے کہا کہ بھائی تو نے ناحق اتنا اہتمام کیا۔ میں انسان ہوں، اپنی ذات میں انجمن نہیں۔ بندے خدا کے، کیا ہی بہتر ہوتا اگر تو مجھے برگر یا سینڈوچ کے ساتھ ایک پیپسی پلا دیتا۔ یہ کھانا کھانے کے لئے تو میری زندگی کا وارنٹ گزر جائے گا۔ وہ شریف میزبان پھر بھی نہ مانا اور مجھے زبردستی کھلاتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے اُلٹیوں نے آلیا، پھر مجھے ایک مکان دیا جس میں یہ اسباب تھا۔

''شطرنجی چاندی، قالینیں، سیتل پاٹی، منگل کوٹی، دیوار گیری، چھت پردے، چلوتیں، سائبان تمگیرے، چھپر کھٹ، مع غلاف اوچھے، توشک، بالا پوش، سیج بند، چادر تکیے تکینی، مسند گاؤ، تکیے، لحاف، کمبل، اوڑھنی، دیگ دیگچی، پتیلی رکابی، طبقا طشتری، کفگیر چمچے ڈوئی، بکاولی سینی، چنگیر چوگھڑے، صراحیاں، لگن، پاندان۔ آب خورے اور چلمچی۔''

میں نے زِچ ہو کر کہا کہ انکل بیدار بخت، آپ نے پورے خاندانِ مغلیہ کا اہتمام کر ڈالا ہے۔ ایک بندۂ عاجز اِتنی میزبانی کا متحمل نہیں ہو سکتا، یہ مجھ پر بارِ گراں ہے۔ میرے لئے ایک چارپائی اور رضائی کافی تھی۔ کھانے کے لئے فقط ایک کپ اور پلیٹ بہت تھا۔ میزبان بیدار بخت نے ذو معنی مسکراہٹ پھینکتے ہوئے کہا ''اے کڑیل خوبرو حسین مہربان نوجوان، اب تم ہی ہر چیز کے مالک ہو۔ آج کل تمھارے جیسے صحت مند تروتازہ، وجیہہ اور گھبرو جوان کہاں ملتے ہیں۔ آج کل کے لڑکے تو نرے سینک سلائی ہیں۔ کمر لڑکیوں جیسی، آواز لڑکیوں جیسی، چال لڑکیوں جیسی اور بال بھی لڑکیوں جیسے، اس پر شہزادہ سلیم کی نقل میں کانوں میں بالی، گلے میں چین، کلائیوں میں بریسلیٹ، انگلیوں میں انگوٹھیاں اور کم بخت ایسے نحیف و نزار کہ ہینگر میں لٹکے نظر آتے ہیں۔ میاں، شانت ہو جاؤ کیونکہ ہم نے تمھیں اپنی برخورداری میں لیا۔ ابھی میری بیٹی نازنین مولوی صاحب کے ہمراہ آتی ہوگی۔ تھوڑی دیر میں تمھارا نکاح ہو جائے گا، پھر ہم دونوں آپس میں رشتہ دار بن جائیں گے۔ ابھی میں جواب کے لئے منہ کھول رہا تھا کہ نازنین اور مولوی آگئے۔ نازنین سچ مچ نازنین تھی، مگر چہرے پر نقاب تھی۔ نکاح ہوا، سلامی ملی اور ہم حجلۂ عروسی میں پہنچ گئے۔ نقاب اُٹھا کر قمقموں کی روشنی میں دیکھا تو نازنین واقعی اچھی لگی۔ صبح جب وہ نہا دھو کر نکلی تو مجھ پر بجلی گری۔ میرے ساتھ پھر ہاتھ ہوگیا۔ وہ لڑکی تھی یا کوئی بھتنی، یکلخت میرے منہ سے کاسمیٹک بنانے والوں کے لئے کئی گالیاں نکلیں۔ اگر میک اَپ نہ ہوتا تو انسان آنکھیں بند کر کے شادی کر سکتا تھا لیکن میک اَپ کی ایجاد کے بعد تو لڑکی کو کئی بار پانی میں غوطہ دے کر اور سرف ایکسل سے منہ دھلانا چاہیئے تاکہ اصلی داغ دھبے باہر آجائیں۔ اگلی صبح اپنے میزبان اور ایک دن کے سسر بیدار بخت کا گھر اور کراچی کا شہر چھوڑ کر میں ٹرین میں جا بیٹھا ٹرین ایک رات اور ایک دن چلتی رہی۔ میں کراچی اور بیدار بخت کی بیٹی سے بہت دُور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ آخری اسٹیشن آگیا اور قلی شور مچاتا آگیا ''کھان صاحب، پشور آگیا!'' (خان صاحب، پشاور آگیا) میں ڈرتے ڈرتے اُترا اور یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عورتیں حور شمائل، جیسے کشمیر کا سیب یا

دہکتے انار، کشادہ آنکھیں، سرخ ہونٹ، گلابی گال، دودھ جیسا رنگ، دراز قامت، عصمت وحیا کا پیکر، مرد تو وہ بھی صاحبِ جمال اور گورے گورے، اونچے اونچے صحت مند۔ میں نے سوچا یا اللہ ایک ہی ملک اور اِتنا فرق؟؟ میں نے پشاور میں ہی بسنے کا پروگرام بنا لیا۔ پہلے بٹے بیچنے شروع کئے پھر کپڑا بیچنا شروع کر دیا۔ ایک دن ایک بہت ہی سرخ سپید، بھوری آنکھوں والی، شیریں دہن اور غنچہ بدن نے مجھ سے کپڑا خریدا۔ میں اسے دیکھ کر گھائل ہوگیا۔ وہ بھی مائل نظر آئی۔ اب میں بہانے سے اُس کی گلی کے پھیرے لگانے لگا۔ میں جب اُسے دیکھتا تو قدرت کے شاہکار کی داد دیتا۔ وہ عشق وحُسن کا مجسمہ تھی۔ پیار محبت کی دیوی اور باغ میں کھلنے والی ایک نازک کلی۔ میرے پاس سات ہیرے تھے۔ ہر ہیرے کی قیمت پانچ لاکھ تھی۔ ایک دن اس دلنشیں کی اجازت سے میں نے اُس کے باپ اور چچا سے رشتے کی بات کی اور لالچ دینے کے لئے ہیرے سامنے رکھے مگر وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ میں نے کہا کہ لڑکی کی بھی مرضی ہے، ہم دونوں راضی ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ باپ نے بندوق اُٹھائی اور لڑکی کے چھ گولیاں مار دیں۔ اُس کا سرخ لہو بہتا ہوا مجھ تک آ پہنچا۔ لڑکی کے باپ نے واپس آکر اسی بندوق سے مجھ پر گولی چلائی لیکن میگزین خالی ہو چکا تھا۔ لڑکی کے چچا نے نیفے سے چاقو نکالا اور باپ نے سامنے پڑی ہوئی قینچی اُٹھائی۔ پھر مجھے یاد نہ رہا کہ کیا ہوا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ٹرین میں تھا اور کوئی کہہ رہا تھا ”خوچہ، بہت بُرا ہوا، اب یہ پشور نہیں رہ سکتا۔ ابا جان نے کہا ہے کہ اس کی لوتھ کراچی کے سمندر میں ڈبو دو۔ ابھی لہور (لاہور) آیا ہے، چائے پی کر سوچیں گے کہ یہ لوتھ سمندر تک کیسے اُٹھا کر لے جائیں۔“ جب میں نے یہ باتیں سُنیں، نیز لاہور کے بارے میں سُنا تو اپنا دُکھ درد بھول کر اُٹھ بیٹھا۔ زندگی بھر لاہور دیکھنے کا شوق ستاتا رہا تھا۔ اب قسمت نے خود لاہور پہنچا دیا، چنانچہ میں چپکے سے لاہور اُتر گیا۔

دوسرا درویش بولا کہ بھائیو! خوش قسمتی سے مجھے یہاں ایک ڈاکٹر مل گیا۔ وہ مجھے گھر لے گیا۔ آٹھ دس دن میں میرے زخم بھر گئے۔ میں دوبارہ جوانِ رعنا بن گیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ تمھاری خدمت کے عوض تمھیں کیا انعام دوں۔ ڈاکٹر بولا ”جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ آپ شام کے شہزادے ہیں، آپ کے پاس ہیرے جواہرات ہیں، میں غریب گھامڑ سا ڈاکٹر ہوں۔ میری تین بیٹیاں ہیں۔ ایک نرس ہے، ایک دائی ہے، تیسری ڈاکٹر ہے، آپ تینوں میں سے کسی ایک سے شادی کرلیں تو ہمارے نصیب جاگ جائیں گے۔ تینوں کی عمریں نکل چکی ہیں لیکن وہ خود کو اِتنا سلم اور سمارٹ رکھتی ہیں کہ کسی کو اُن کی اصل عمر کا اندازہ نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا کہ اچھا تینوں کو بلاؤ۔ تینوں بہنیں سج دھج کر آئیں۔ تینوں واجبی سی صورت کی تھیں۔ کافی لاغر بھی لگ رہی تھیں مگر اس کی وجہ ڈاکٹر بتا چکا تھا۔ میں نے اپنے محسن کا احسان اُتارنے کی خاطر مجبوراً اُس کی ڈاکٹر بیٹی سے شادی کرلی کیونکہ وہی تھوڑی بہت بہتر تھی لیکن شادی کے بعد میرا پچھتاوہ پچھلی دو شادیوں کی نسبت دوگنا ہوگیا۔ میں اس کی وجوہات پر روشنی نہیں ڈال سکتا کیونکہ فحاشی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ یہ شادی جو بادل نخواستہ کی تھی، بمشکل ایک ہفتے چلی۔ ڈاکٹر اور اس کی تینوں بیٹیوں نے میرے ہیرے جواہرات پر قبضہ جما لیا۔ جب میں رات کو ان کے گھر سے بھاگا تو سوائے تن کے دو کپڑوں کے، میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ دو تین دن بھوکا پیاسا پھرتا رہا۔ ایک دن مسجد میں پڑا رو رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے تسلی دی اور اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ یہ آدمی کاروباری تھا۔ مجھ پر بہت مہربان رہتا۔ ایک دن مجھے رازداری سے کہنے لگا کہ تم کنوارے لگتے ہو، دیکھو میری چار جوان بہنیں ہیں، تم جس سے کہو گے اُس سے شادی کرادوں گا۔ جتنا جہیز چاہو گے، وے دوں گا بس تم ہاں کردو۔

میں نے کہا کہ پہلے میں لڑکیاں دیکھوں گا۔ چنانچہ میں اُس کے گھر گیا۔ لڑکیاں اچھی شکل وصورت کی تھیں۔ میں نے سب سے چھوٹی والی پر ہاتھ رکھا۔ اس آدمی نے اسی وقت میرا نکاح پڑھوایا اور ایک گھر جہیز میں دیا۔ لڑکی بہت خودسر، بدتمیز اور منہ پھٹ تھی۔ مجھے کہنے لگی کہ تم کنوارے نہیں لگتے۔ مجھے تم سے شادی کی بساند آتی ہے۔ تم میرے لائق نہیں ہو۔ اگر نیکی کرنے کا شوق

تھا تو بڑی بہن سے شادی کرتے، جواب چالیس کی ہونے والی ہے، میں تو ابھی اُنیس کی ہوں اور آٹھ بہن بھائیوں سے چھوٹی اور لاڈلی ہوں۔ بہتر ہے کہ مجھ سے دُور رہو کیونکہ میں اپنی پسند کے لڑکے سے بیاہ کروں گی۔ تھوڑے دن بعد لڑکی نے خلع لے لیا اور مجھے دربدر ہونا پڑا۔ میں کئی دن تک ایک پارک میں جا کر اپنے حالات پر غور وفکر کرتا رہا۔ ایک بزرگ مجھے روز دیکھتے، آخر ان سے رہا نہ گیا، بولے ''تم شریف، رحمدل نوجوان لگتے ہو، شکل سے پردیسی نظر آتے ہو، بھوکے پیاسے ہو، تنہا رہتے ہو، اگر بُرا نہ مناؤ تو میرے گھر چلو۔ میری پانچ پوتیاں ہیں، صرف دو کی شادی ہوئی ہے اور تین کنواری بیٹھی ہیں۔ اگر تم تیسری والی سے شادی کرلو تو تمھیں بیوی مل جائے گی اور مجھے پوت داماد۔'' میں بزرگ کے ساتھ چلا گیا۔ ان کی تیسری پوتی سانولی سلونی تھی مگر نین نقش اچھے تھے۔ ہمارا اسی شام مسجد میں نکاح ہوگیا۔ ایک سال بعد ہمارے ہاں بچہ ہوا لیکن زچہ و بچہ دونوں اِکٹھے مرگئے۔ میں غمزدہ ہوکر جہانگیر کے مقبرے پر پہنچ گیا۔ اُداس بیٹھا تھا کہ ایک اُدھیڑ عمر آدمی نے کہا ''بیٹا! میں سخت پریشان ہوں، کئی بار سوچ چکا ہوں خودکشی کرلوں لیکن بزدل ہوں۔'' میں نے کہا کہ ''انکل جی، آپ تعلیم یافتہ کھاتے پیتے آدمی لگتے ہیں، آپ کیوں خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟'' اس آدمی نے کہا کہ میری تین بیٹیاں ہیں، تینوں کی عمریں تیس سے اُوپر ہوچکی ہیں مگر ان کی اب تک شادیاں نہیں ہوئیں۔ تم ہی کہو، میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ نہیں؟ خدا کے لئے اے نیک دل نوجوان، والدین کی آنکھوں کے تارے، تم میری ایک بیٹی سے شادی کرلو، تمھیں اللہ کا واسطہ ہے ''ناں'' نہ کرنا۔''

میں یہ سُن کر چکرا گیا اور بھنا کر بولا ''ارے میں انسان ہوں، کوئی مشین نہیں۔ عجیب بات ہے اس ملک میں کوئٹہ سے پشاور تک سب کو ایک ہی مسئلہ ہے کہ بیٹی یا بہن غیر شادی شدہ ہے۔ ہر گھر میں دو تین یا چار پانچ لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ توبہ ہے اس ملک میں کس قدر لڑکیاں ہیں۔ آخر میں اکیلا کس کس سے شادی کروں۔۔۔ معاف کیجئے گا انکل! اب میں مر جاؤں گا مگر کسی عمر رسیدہ کنواری سے شادی نہیں کروں گا۔''

وہ آدمی بہت دلبرداشتہ ہوا اور کہنے لگا ''ٹھیک ہے میں خودکشی کرلیتا ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا ''اچھا فیصلہ ہے، میں تائید کرتا ہوں بلکہ آپ کا ساتھ دیتا ہوں۔ میری زندگی بھی بیکار ہے۔ آیئے مل کر خودکشی کرلیں۔'' ہم دونوں نے مقبرے کی چھت پر چڑھ کر چھلانگ لگا دی۔ پہلے اس آدمی نے چھلانگ لگائی، پھر میں نے۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر گرے۔ وہ گرتے ہی دب کر مر گیا اور میں بچ گیا کیونکہ میں غلطی سے اُس پر گر گیا تھا، البتہ میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور میں کسی کام کا نہ رہا۔ تب سے فقیری اختیار کر رکھی ہے۔ شاہ سے گدا بن گیا اور اِسی گدائی میں مجھے وہ نو بیاہتا دلہن مل گئی۔ یہ ہے اس فقیر کی داستان۔''

اب چور کی باری تھی۔ تیسرے درویش یا چور سے اپنی کہانی شروع کی۔ چرسی بولا ''بھائی ذرا مختصر کرکے سنانا، فجر کی اذان ہونے والی ہے، کہیں ایسا نہ ہو تم میری کہانی سننے سے محروم رہ جاؤ، بس اپنی کہانی کی سمری (Summary) سُنا دو ورنہ مجھے صرف مرکزی خیال (Theme) پر اکتفا کرنا پڑے گا۔'' چور نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی کہانی کے صرف ضروری حصے سنائے گا۔ تیسرے درویش نے کہنا شروع کیا کہ میں ایران کا ولی عہد ہوں۔ میرے والد یعنی بادشاہ سلامت مجھے عربی، فارسی، منطق وحکمت کی تعلیم دلوانا چاہتے تھے لیکن میرا رجحان شروع سے انگریزی زبان، انگریزی لباس اور انگریزی فلموں کی طرف تھا۔ میں نے منع کرنے کے باوجود ایم ایس سی کیا اور کمپیوٹر انجینئر بن گیا۔ ایران میں کمپیوٹر کا کوئی اسکوپ نظر نہیں آتا تھا اور وہاں پردے کی سخت پابندی تھی۔ میں بہت جلد اِن حالات سے اُکتا گیا اور ایک دن ایران چھوڑ کر یورپ کی طرف نکل گیا۔ میں ایرانی تھا اور بہت خوبصورت مانا جاتا تھا۔ جونہی یورپ پہنچا، وہاں کے لوگوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میرے پاس روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ اس دوران مجھے ایک یہودی لڑکی سے پیار ہوگیا۔ یہاں زیادہ تر یہودی آباد تھے۔ وہ یہ برداشت نہ کرسکتے تھے کہ ایک مسلم لڑکے کو اپنا داماد بنائیں، چنانچہ میں شہزادی فرنگ کو لے کر ایک مکان میں گھس گیا جس کا

مالک بیوی بچوں کے ساتھ سوئیٹزرلینڈ سیر کے لئے گیا ہوا تھا۔اِسی اثنا میں ایک کٹنی دروازہ کھلا پاکراندر گھس آئی۔"

"ایک بڑھیا، شیطان کی خالہ، اس کا خدا کرے منہ کالا، ہاتھ میں تسبیح لٹکائے، برقع اوڑھے گھس آئی اور شہزادی فرنگ کو ہاتھ اُٹھا کر دعائیں دینے لگی کہ یاالٰہی تیری نتھ جوڑی سلامت رہے۔ میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں ایک بیٹی ہے کہ وہ پورے دنوں سے دردِزہ سے مرتی ہے، اتنی ہمت نہیں کہ کھانے پینے کو لاؤں۔ ایک بیٹی تم ہو شہزادی لگتی ہو مگر شکل سے مسلمان نہیں دِکھتی ہو، کہاں کی ہو، کیسے آئی ہو، کوئی اتہ پتہ، خیر خبر دو ورنہ۔۔۔اے صاحبزادی، کوئی ٹکڑا پارچہ دے دو۔"

غرضیکہ اس کٹنی نے جا کر بھید پایا اور شہزادی فرنگ کو اس کے لوگ لے گئے۔ میں پھر تنہا رہ گیا۔ کافی بدنامی ہو چکی تھی۔ تھک ہار کر ہندوستان آ گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا، یہاں سائیکل رکشہ چلانے لگا۔ یہاں اس وقت بے علمی کا دور دورہ تھا۔ کسی کو کمپیوٹر سے دلچسپی نہ تھی، نہ یہاں کمپیوٹر تھے۔ کسی نے کہا، بمبئی چلے جاؤ، وہاں لوگ کمپیوٹر سے واقف ہیں۔ میں بمبئی چلا گیا، بہت دن فٹ پاتھوں پر سوتا رہا اور ٹیکس بھرتا رہا، ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ "ایک نوجوان زرد بیل پر زین کسے سوار آ پہنچا اور اُتر کر دوزانو بیٹھا۔ ایک ہاتھ میں ننگی سیف اور ایک ہاتھ میں بیل کی ناتھ پکڑے اور مرتبان غلام کو دیا۔ غلام نے مرتبان ہر ایک کو دکھایا۔ نوجوان نے غلام کو ایسی تلوار ماری کہ سر جدا ہو کر مرتبان میں گر گیا۔ سب تھر تھر کانپنے لگے۔ نوجوان نے تلوار لہرائی، اسی وقت ایک معشوقہ سیاہ نقاب میں چست اور آدھے لباس میں نمودار ہوئی اور نوجوان کے آگے شعلہ سمائی آنکھوں سے ناچنے لگی۔ نوجوان پر مدہوشی طاری ہونے لگی۔ رقاصہ نے اس کے ہاتھ سے تلوار لے کر اپنے گلے پر پھیرنی چاہی۔۔۔ یہ دیکھ کر میں دیوانہ وار دوڑتا ہوا رقاصہ کے پاس پہنچ گیا اور تلوار پکڑ لی۔ اسی وقت شور مچ گیا کہ ساری شوٹنگ برباد ہو گئی۔ رقاصہ قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور زرد بیل پر بیٹھا نوجوان چھلانگ لگا کر مجھے ٹھڈے مار رہا تھا۔ یہ دلیپ کمار تھا اور معشوقہ مدھوبالا تھی۔ ڈائریکٹر نے آ کر مجھے گھونسوں اور لاتوں سے اتنا مارا کہ میری آنتیں پھٹ گئیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ خیر مجھے خیراتی ہسپتال بھیج دیا گیا۔ ہسپتال پہنچتے اور آپریشن سے بیڈ تک پہنچتے پہنچتے مجھے اپنی جمع پونجی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میری جوتی، ٹوپی، ڈگریاں اور بستر بچھونا سب کچھ چوری ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کی فیس کے بہانے میری گھڑی اور انگوٹھی بھی اُتروالی حالانکہ یہ سرکاری ہسپتال تھا۔ ٹھیک ہو کر پھر کام کرنا چاہا مگر آنتوں میں زخم پڑنے اور ٹانکے لگنے کی وجہ سے سائیکل رکشہ تو کیا، آٹو رکشہ چلانا بھی ممکن نہ رہا۔ فٹ پاتھ پر میں پہلے بھی کئی چوریاں بھگت چکا تھا۔ جس کے پاس چیز رکھواتا، وہ چیز سمیت غائب ہو جاتا۔ جگہ جگہ روزگار کے لئے مارا مارا پھرتا رہا۔ ہر ایک کو بتاتا کہ بھائی میں ایران کا شہزادہ ہوں تو سب ہنستے اور کہتے کہ سب ایسا ہی کہتے ہیں۔ میں نے محنت مزدوری شروع کر دی لیکن سب مجھے پاگل دیوانہ سمجھ کر میرے ہی سامنے میرا مال اسباب چرا لے جاتے۔ ایک دن میں نے ایک چور کو پکڑ لیا اور پوچھا کہ تم شریفوں کی طرح کیوں نہیں رہتے، چوری چکاری کیوں کرتے ہو؟ کہنے لگا کہ شریفوں کی طرح رہیں تو مر جائیں۔ شریفوں کو یہاں کچھ نہیں ملتا۔ اس دنیا کا اُصول ہے کہ چھین نہیں سکتے تو چرا لو۔ یہی زندہ رہنے کا فارمولا ہے۔ ایسے کب تک گلتے سڑتے رہو گے، آؤ ہمارا دھندے میں ہاتھ بٹاؤ۔"

میں نہ مانا مگر تین چار ہفتوں میں بھوک، پیاس اور سردی نے مجھے باؤلا بنا دیا۔ آخر چور کے ساتھ چوری شروع کر دی۔ جب بمبئی سے دل بھر گیا تو پاکستان چلا آیا اور یہاں بھی یہی کام کرنے لگا۔ تب اچھی گزر رہی تھی۔ یہ ہے میرا کُل قصہ۔۔۔"

تیسرے درویش کی سٹوری ختم ہوئی تو پو پھٹ چکی تھی۔ چڑی یعنی چوتھا درویش بولا "ہمسفرو! میں تمھیں کہانی اختصار سے سناتا ہوں تاکہ کہانی تکمیل کو پہنچے۔ میرا اصلی نام افتخار چڑی ہے۔ مجھے کوئی پیار سے کچھ نہیں کہتا تھا لیکن جب سکول جانے لگا تو بچے مجھے چڑیا، چڑی اور چوں چوں کا مربّہ کہنے لگے۔ خیر میں نے میٹرک کیا تو میرے باپ نے مجھے کلرک لگوا دیا۔ میں کام کرتے یا کھاتے پیتے وحشت ہو جاتا تھا۔ ایک دن دفتر میں بیٹھا ٹائپ رائٹر سے کھیل

رہا تھا۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبا تھا کہ میرے اوپر غنودگی طاری ہو گئی۔ میں نے خواب میں شہزادہ چین کو دیکھا جو جنوں کے بادشاہ ملک صادق کی امانت میں خیانت کر رہا تھا۔ پھر شہزادہ نیمروز کو دیکھا جو اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار کو فراموش کر کے ایک پری کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں نے آذر بائیجانی نوجوان کو دیکھا جو گرتا پڑتا ''زندانِ گور'' میں پہنچتا ہے۔ وہاں ہر طرف مردوں کی لاشیں اور ہیرے جواہرات کے صندوق بھرے پڑے ہیں۔ ایک عورت نظر آتی ہے جو ابھی زندہ ہے۔ دونوں شادی کر لیتے ہیں اور پہلی بار کوئی مرد کسی عورت کو حق مہر میں کھربوں ڈالر کے ہیرے موتی دیتا ہے۔ ایک سال بعد دونوں کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا۔۔۔ یہاں تک کہ وہ آٹھ ہو جاتے ہیں اور زندانِ گور کی اونچی فصیل پر چڑھ جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے کاندھوں پر چڑھ کر دیوار کے دوسری طرف اُتر جاتے ہیں۔ چلتے چلتے اُنہیں ملک زیرباد کی راجکماری ملتی ہے جو آذر بائیجان کے نوجوان کے عشق میں ہلکان ہو جاتی ہے۔ آذر بائیجان کا نوجوان راجکماری سے فوراً عقدِ سوئم کر لیتا ہے۔ پہلی بیوی غم سے مرجاتی ہے اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔'' میں ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ میرے باس آ گئے۔ میرے خراٹے اور سگریٹ کی وجہ سے کاغذ اور میز جلنے پر شدید برہم ہوئے۔ میرے کولیگز نے بتایا کہ چرسی ہے، اس میں سے چرانڈ آتی ہے اور یہ اکثر گم ہو جاتا ہے۔ میرے باس نے مجھے نکال باہر کیا۔ گھر والوں نے بھی مجھے زدوکوب کیا، زمین آسمان دشمن ہو گئے۔ میں نڈھال نکڑ پر پڑا اپنا آخری سگریٹ پی رہا تھا جب کسی نے مجھے ہیروئن کی آفر کی۔ دو پڑیاں کھا کر اور ایک انجکشن لگوا کر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر جنت میں پہنچ گیا، تب سے آج تک میں نشہ کرتا ہوں اور مست رہتا ہوں۔ پڑھے لکھے بیروزگاروں کا حال میں روزانہ اخباروں میں پڑھتا رہتا تھا کہ بیچارے پڑھ پڑھ کے ادھ موئے ہو گئے مگر نوکری نہ ملی۔ غربت، افلاس اور بیروزگاری سے سب خودکشی کر کے مرتے رہے۔ اس لیے میں نے آگے پڑھنے کی کوشش نہ کی۔ اب نشہ کر کے عیش کرتا ہوں، نہ آگے کی فکر نہ پیچھے کی۔ جب ہوش آتا ہے، کچھ کھا لیتا ہوں۔ آدھی زندگی گزر چکی، آدھی بھی یونہی گزر جائے گی۔ اس ملک میں محنت کرنے کا کیا فائدہ۔ محنتی شریف اور ایماندار آدمی کی اس دنیا میں نہ عزت ہے نہ قدر۔ کوئی ایسے سچے کھرے لوگوں کو نہیں پوچھتا۔ جھوٹے مکرباز منافقوں کی دنیا ہے یہ۔۔۔

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ
یاں دن کو دے اور رات لے

مہربانو، قدردانو اور دیوانو! بس یہی ہے میرا قصۂ کوتاہ۔''

چاروں درویش کہانی سنا چکے تو آزاد بخت نے کہا کہ اے غم کے مارو! اب کیا صلاح ہے؟ آگے کے متعلق کیا سوچا ہے؟؟

دہشت گرد نے کہا ''میرے پاس سب کچھ ہے۔ ہم نے بہن بھائیوں اور سب کو آزما کر دیکھ لیا۔ ہمارے بُرے دنوں میں کسی نے ساتھ نہ دیا بلکہ ہر ایک نے حسبِ توفیق لوٹا۔۔۔ آج سے ہم پانچوں پانچ انگلیوں کی طرح رہیں گے، ہم بھائی نہیں دوست بن کر رہیں گے۔ تمھاری کیا مرضی ہے؟'' فقیر بولا ''اندھے کو کیا چاہیئے، دو آنکھیں اور فقیر کو کیا چاہیئے، صرف بھیک! یہ تجویز معقول اور ہمارے حسبِ حال ہے۔ ہم آئندہ جو بھی کریں گے، مل جُل کر کریں گے۔''

چنانچہ پانچوں نے مل کر اپنی اپنی حماقتوں کی پوٹلی جو اس رات کھولی تھی، آگ میں جھونک دی۔ یہی حماقتوں کی پوٹلی ان کی تنگیوں اور مصیبتوں کا سبب تھی۔ پانچوں مل کر اکٹھے رہنے لگے۔ پانچوں نے ایک بار پھر شادی کا قصد کیا کیونکہ پاکستان میں لڑکیاں بہت ہیں۔ اس طرح ان کے اپنے بھلے کے ساتھ پانچ کنواری لڑکیوں کا بھی بھلا ہو گیا۔ پانچوں نے اپنے دھندے کو ازسرِنو ترتیب دیا اور اَپ ڈیٹ کر کے جدید بنیادوں پر استوار کیا۔ آج کل وہ لاہور کے پوش ایریے میں رہتے ہیں اور صاحبِ جائیداد اور صاحبِ اولاد ہیں۔ پانچوں ملک کی معزز اور محترم شخصیات ہیں۔ اِسے کہتے ہیں اتفاق میں برکت اور یہ کہ جتنا گڑ ڈالو گے، اُتنا ہی میٹھا ہوگا، البتہ اِتنے میٹھے اور بھائی چارے سے پانچوں کو شوگر ہو گئی ہے۔ راوی باقی سب چین لکھتا ہے۔

حنیف سیّد

متلون گرگٹ، سہ بروتی

محوِ غفلت تھا مَیں پہلے پہل۔۔۔! پھر لگا الیکٹران، پروٹان ٹکرا گئے ہوں آپس میں، بل کھا کر، اور نا قابلِ برداشت دھماکے سے موالید ثلاثہ کا ذرّہ ذرّہ لرز گیا، کرب سے، تھرّا کر۔۔۔! جیسے کائنات کو دو پیالوں میں کس کر بگھار دیا ہو کسی نے جامنوں کی طرح جھلا کر! پھر میرے یخ وجود میں ہلکی سی انگڑائی لی؛ حرارت نے، مسکرا کر، اُس کے بعد میرے احساس کے ساکت سمندر کی سطح پر دستک دی ہوا کے معصوم جھونکے نے، شرما کر، اور جب میرے شعور کی کالی رات کو اُفق کی نئی نویلی کرن نے احساس کرایا؛ اپنے وجود کا، جگا کر! تو میرے سامنے ایک عجیب وغریب، کیم شحیم، نٹ کھٹ، تین مونچھوں والا گرگٹ؛ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ت، ت، تم ہو کون؟'' مَیں نے جھجک کر پوچھا۔

''کیوں؟ ڈر گئے کیا؟؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے، سوال کیا مجھ سے۔

''ہاں۔۔۔!'' مَیں نے اپنے شعور کے تانے بانے توڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے داعش کی زد میں آئے معصوم ومظلوم بچّے کی طرح گھبرا کر جواب دیا۔

''ڈرنا کیا، اِس میں۔۔۔؟'' گرگٹ نے کہتے ہوئے اپنی آنکھیں پھر گھمائیں؛ گول مٹول۔ پھر مٹک مٹک کر چلتے ہوئے زمین پر ایک دائرہ بنایا، گول گول۔ پھر اپنا بدرنگا جسم پھُلایا، لمبی دُم کو اوپر اُٹھایا۔ پھر اپنے اندر کے یکے بعد دیگرے سبھی جھلکتی رنگوں کو دِکھلایا، پھر اُچھل کر پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں کالی مونچھ کو زمین میں اور بیچ کی کھچڑی دار مونچھ کو موالید ثلاثہ کے ذرّے ذرّے پر پھیلایا، پھر دائیں سفید مونچھ کو اوپر کی جانب ہوا میں لہرایا۔ یعنی کہ اپنے سارے کے سارے کرتب دکھا ڈالے؛ داعش کے کسی خوں خوار سرغنہ کی مانند، اِٹھلا اِٹھلا کر۔

''دائیں طرف کی تمھاری سفید مونچھ تو جا رہی ہے صدرۃ المنتہیٰ کو اور بائیں طرف کی کالی مونچھ تحت الثریٰ کو۔ اور بیچ کی کھچڑی دار مونچھ کائنات کو گرفت میں لیے ہوئے ہے، جو کبھی اوپر کی سفید مونچھ میں پیوست ہونے کی کوشش کرتی ہے، تو کبھی نیچے کی کالی مونچھ میں۔'' مَیں نے ڈرتے ہوئے قصیدہ پڑھا، اُس کا۔

''تو اس میں حیرت کیا ہے۔۔۔؟ جناب۔۔۔!''

''ہے کیوں نہیں حیرت۔۔۔؟''

''یہ آج سے تو ہیں نہیں، میری مونچھیں؛ یہ تو ازل سے ہیں، بچّو! اور رہیں گی بھی، ابد تک۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں، بھائی۔۔۔!''

''پر مَیں نہیں جانتا، اَنکل.....!'' مَیں نے نفی میں سر ہلاتے

ہوئے بھولے انداز میں کہا۔

''ہوتو تم بڑے فطرتی نسلاً۔یعنی کہ عالم، فاضل، اور نہ جانے کیا کیا؟ اُس پر اَشرف المخلوقات بھی، اور اتنا نہیں جانتے!!''

''نہیں انکل۔۔۔! مَیں نہیں جانتا، یہ سب۔''

''بڑے بھولے ہو، نا! بھولے کا ہے کو۔ یوں کہو کہ فطرتی، جیسی کہ فطرت ہے، تمھاری۔ یعنی کہ عام لوگوں جیسی۔ وہی تو بول رہی ہے، اندر سے تمھارے۔ تمھارے آباواجداد جیسی تمھاری اپنی فطرت۔'' امریکا؛ جیسے شیر نے دریا کا پانی؛ میمنے کے گندا کرنے سے انکار پر، الزام اس کے باپ پر تھوپتے ہوئے آنکھیں، مجھ پر نکالیں۔

''نہیں.....! مَیں یہ کچھ نہیں جانتا، فطرت وطرت۔'' مَیں نے بھی میمنے کی طرح، پانی گندا ہونے کی لاعلمی ظاہر کی۔

''آ۔۔۔ہاہاہا۔۔۔! کیا بات کہہ دی۔ کوئلے کی کان میں رہ کر کوئلہ نہیں پہچانتے؟ سمندر کے واسی پانی نہیں جانتے؟؟ آگ میں رہ کر؛ شعلوں کو نہیں گردانتے؟؟؟ اپنی مونچھوں کو، مونچھیں نہیں مانتے؟ دیکھو! دیکھو ذرا غور سے۔۔۔!'' اس نے رعب سے آنکھیں نکال کر، سینہ تان کر، اپنی مونچھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اشارہ کرتے ہوئے آگے کہا'' یہ ہیں میری، مونچھیں۔۔۔! یہ مونچھیں تو ہمیشہ رہی ہیں، میری۔ صرف میرے ہی نہیں، سبھی کے ہوتی ہیں، یہ مونچھیں۔ تمھارے بھی ہیں۔ ہیں کہ نہیں؟'' اس نے آنکھیں مزید نکال کر انگلیاں ہوا میں نچاتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں۔! میرے تو ہیں نہیں مونچھیں۔'' مَیں نے اپنے ہونٹوں کے اوپر ٹٹول کر جواب دیا۔

''ہیں؛ ہیں، ہیں! ہیں مونچھیں، تمھارے بھی مکمل ہیں، پوری طرح ہیں، سمجھے! لیکن؛ ابھی پیٹ میں ہیں، دوست!! تم محسوس بھی کر رہے ہو۔ لیکن، چھپا رہے ہو تم، اپنی ان مونچھوں کو، اپنی فطرت کے مطابق۔ ایک تم ہی نہیں، سارے کے سارے چھپائے رہتے ہیں، اپنی اِن مونچھوں کو؛ ایک دوسرے سے۔ اور مصنوعی چہرہ عیاں رکھتے ہیں سب؛ اپنا اپنا۔ اور جب بھی موقع ملتا ہے؛ اینٹھنا شروع کر دیتے ہیں؛ مونچھوں کو، بڑے رعب کے ساتھ۔ جو سب کرتے ہیں، وہی تم بھی کر رہے ہو، بچو!'' گرگٹ نے غصّے میں پہلے جسم پھلایا، پھر فٹافٹ اپنے رنگوں میں بدلاو لایا۔ بڑی بڑی مونچھیں دکھا کر امریکا کی طرح اپنے سارے ہتیاروں، اپنی طاقت اور بین الاقوامی رسوخ کی دھونس دیتے ہوئے، بندر گھڑکی کے ساتھ اُچھل کود کرتے ہوئے، پہلا مدار ہلا ڈالا۔

''اچھا، یہ بتاؤ! تمھاری اوپر اور نیچے کی مونچھوں میں تضاد کیوں ہے اِتنا؟'' مَیں نے سوال کرنے کی جسارت کی۔

''تضاد...! تضاد کا ہونا بہت ضروری ہے، پیارے...! یہ تضاد سبھی میں ہوتا ہے؛ بڑی اہمیت ہے تضاد کی، اسی تضاد سے مدارج قائم ہیں۔ مثلاً تحت الثریٰ نہ ہو تو صدرۃ المنتہیٰ کی اہمیت کیا؟ اور اگر صدرۃ المنتہیٰ نہ ہو تو تحت الثریٰ کا کیا مقام؟ نہیں سمجھے؟؟'' اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں!'' مَیں نے انکار کیا۔

''اور سمجھو گے بھی نہیں، ابھی تم! چلو سمجھاتا ہوں، تمھاری بھاشا میں، تم کو۔ یوں سمجھو کہ کالا رنگ نہ ہو تو؛ کیا مقام ہے، سفید کا؟ اور سفید نہ ہو تو۔۔۔ کیا اہمیت ہے، کالے کی؟ گرمی نہ ہو تو، سردی؛ اور سردی نہ ہو تو! کیا مقام ہے، گرمی کا؟ سمجھے؟ یا نہیں؟ اگر نہیں! تو اور سمجھاؤں؟؟ یعنی کہ تفصیل سے۔ ویسے مَیں یہ جانتا ہوں کہ تم سمجھتے سب کچھ ہو۔ چوں کہ میری انھیں مونچھوں کی طرح تمھارے اندر بھی لبادے ہیں۔ اسی لیے تم اندر کے کالے پن

یقین

''خون مانگتے ہو، خون دیں گے! جان مانگتے ہو، جان دیں گے!، کلیجہ مانگتے ہو، کلیجہ دیں گے!''

مجمع کئی دن کا بھوکا تھا۔ فوراً سے پہلے آگ جلائی گئی اور اُس پر دیگ چڑھادی گئی۔ پھر سب للچائی نگاہوں سے سٹیج پر کھڑے ضخیم وجیم لیڈر کو دیکھنے لگے۔

ابنِ منیب

کو، سفیدی کے لبادے سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔ دنیا والوں کی طرح۔ کیوں کہ تم رہ ہی رہے ہو، اس دنیا میں۔ جو نہ اوپر میں ہے ؛ اور نہ نیچے میں۔ نہ سفید میں ہے ؛ اور نہ کالے میں۔ نہ دن میں ہے ؛ اور نہ ہی رات میں۔ مطلب یہ کہ نہ اِدھر میں، اور نہ اُدھر میں۔ چوں کہ مَیں بھی اسی دنیا میں ہوں۔ اسی لیے نہ اِدھر میں ہوں ؛ اور نہ اُدھر میں۔ دنیا بھی اِدھر اُدھر کے چکّر میں لٹک گئی۔ اس لیے تو کچھ بھی نہ رہی۔ ہاہاہا!'' اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے آگے کہا: ''ایک بات اور بتاؤں؟ معر کے کی۔ لو، سن لو!! اگر یہ اوپر ہوتی، تو سبھی کچھ ہوتی، اور نیچے ہوتی ؛ تب بھی سبھی کچھ ہوتی۔ اگر یہ اُوپر ہوتی، تو اُوپر ہونے کا اندازہ کس سے لگایا جاتا؟ تحت الثریٰ نہ ہوتا تو؟؟ غالب نے یہی کہا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے ؛ نہ ہوتا مَیں، تو کیا ہوتا

غالبؔ چچا کو جانتے ہو؟'' اس نے رُک کر سوال کیا۔

''وہ تو میرے ابا تھے!'' مَیں نے خوشی سے اچھل کر بتایا۔

''ان کے اولاد تو تھی نہیں کوئی، پھر تم کہاں سے ٹپک پڑے غالبؔ کے ابا؟'' پہلے تو وہ اُچھل کر ہنسا، پھر اس نے اپنے ہاتھ کے پنجے کے بیچ کی انگلی اٹھا کر ہوا میں دائرہ بناتے ہوئے گھمائی اور آگے پوچھا ''اپنے ابا کا کوئی شعر یاد ہے، تم کو؟؟''

''شیر! شیر تو کوئی تھا نہیں، میرے یہاں۔''

''یہی امید تھی تم سے، غالبؔ کے ابا!'' اس نے ٹھٹھا لگا کر آگے کہا۔ ''شعر (اشعار) تو بے شمار تھے، اُن کے، کچھ کو تو جلا کر تاپ گئے ہوں گے۔ کچھ ردّی میں بیچ کر پتنگیں اُڑا ڈالی ہوں گی، اچھا ہوا، جو کچھ بھی ہوا، اور ہوتا بھی کیا اُن کا؟ پڑھنے والے ہی کتنے رہ گئے ہیں، اُن کے؟'' وہ کچھ سوچ کر آگے بولا ''ہاں، تو مَیں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں۔۔۔! مَیں کہہ رہا تھا کہ کسی اور نے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے ؛ غالبؔ سے ملتا جلتا ''تو مثلِ سیاہی ؛ حرف ہوں مَیں : تو آبِ بقا ؛ اور برف ہوں مَیں : جب حرف مٹا ؛ اور برف گلا : تو اور نہیں ؛ مَیں اور نہیں۔ یعنی کہ کوئی فرق ہی نہ ہوتا۔''

سمجھے! اور اگر اب بھی نہیں، تو اور آگے سمجھاؤں؟ لو وضاحت کیے دیتا ہوں۔ یہ کالا پن وہ ہے، جس سے سفیدی کا معیار قائم ہے۔ مَیں بھی چاہتا ہوں کہ یہ میری بائیں کالی مونچھ جو تحت الثریٰ میں پیوست ہے کسی طرح سفید ہو جائے۔ اور مَیں پھر اپنے اُسی مقام پر پہنچ جاؤں۔ یا پھر یہ دائیں طرف کی سفید مونچھ جو صدرۃ المنتہیٰ کی جانب لپک رہی ہے، کسی طرح کالی ہو جائے۔ تو بھی بات بن جائے۔ یوں تو نہ اِدھر کا ہوں ؛ اور نہ اُدھر کا۔ اور یہ جو بیچ کی مونچھ ہے، نا؟ یعنی کہ کھچڑی دار۔۔۔؟ جو مو الید ثلاثہ میں پیوست ہے، یعنی کہ دنیا کو جکڑے۔ اوپر نیچے دونوں میں شامل ہونے کے باوجود نہ اِدھر کی ہے ؛ اور نہ اُدھر کی۔ یعنی کہ معلّق۔ بس اِسی طرح مَیں بھی ہوں، اور تم بھی۔ کہیں دور نہ جاؤ! صدر المنتہیٰ اور تحت الثریٰ کی بات بھی چھوڑو ؛ دنیا کو ہی لے لو۔ چلے جاؤ! اُوپر، یعنی کہ پہاڑ پر۔ کیا ملے گا؟ صاف ہوا۔ شفاف پانی۔ سفید ہی سفید برف۔ ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول۔ کیا کہلاتا ہے؟ پہاڑ! یعنی کہ سب سے بڑا، سب سے اُونچا۔ پھر برف کی طرح پگھلو! چلے آؤ بہتے ہوئے

ڈیڈی کا ''ہیئر اسٹائل'' بنایا ہے مما!!

نیچے۔ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے۔ دنیا کی غلاظت سمیٹتے ہوئے؛ اپنے پہلو میں۔ کیا بن گئے اب؟ سمندر بن گئے، نا؟ یعنی کہ سب سے بڑے۔ اوپر تھے، تب بھی بڑے ۔ نیچے پہنچے، اب بھی بڑے۔ بیچ میں کیا تھے؟ کچھ بھی تو نہیں، یعنی کہ غلاظت ہی غلاظت۔"

"پانی کیسا ہوتا ہے، سمندر کا؟ کھارا۔ یعنی کہ بدمزہ۔ وہی جب اُوپر چلا جاتا ہے، پھر ہوجاتا ہے ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول۔ وہی غرور اُسے لے آتا ہے نیچے، میری طرح۔ یعنی کہ غلاظت ہی غلاظت۔ اور جب اس میں عاجزی وانکساری آجاتی ہے، تو زمین اُس کے وجود کو اپنے میں جذب کر کے پاتال میں لے جا کر پھر شفاف، ٹھنڈا اور شیریں بنا دیتی ہے۔ اگر کچھ بننا چاہتے ہو تو پاتال کے پانی سے سیکھو! پہاڑ پر رہو! یا پاتال میں۔ پسند کیے جاؤ گے، بیچ میں کچھ نہ پاؤ گے۔ گندے نالے کا کوئی مقام نہیں۔ کچھ بننا ہے دنیا میں۔ تو اندر کے کالے پن کو نکال پھینکو۔ یا پھر سفید پن کو۔ سب کچھ بن جاؤ گے۔ دنیا سلام کرے گی، جھکے گی تمھارے سامنے، یہ دنیا۔ آمیزش میں کچھ نہ ملے گا۔ لیکن مَیں جانتا ہوں کہ مکمل طور سے نکال نہ سکو گے، کسی کو بھی۔ کیوں کہ یہ دنیا نکالنے ہی نہ دے گی، کبھی۔ کوشش تو مَیں بھی کر رہا ہوں، ازل سے۔ لگتا ہے؛ نکال نہ سکوں گا کبھی۔ کاجل کی کوٹھری میں ہوں، نا؟ دیکھو! اس کالی مونچھ کو! کئی بار کاٹ چکا ہوں اسے، لیکن بار بار نکل آتی ہے، کم بخت۔ اسی طرح تم بھی نہ بچ سکو گے، کاجل کی کوٹھری سے۔ کیوں کہ جو مَیں ہوں؛ وہی تم بھی ہو۔ ہو، نا وہی تم؟ یعنی کہ دنیا والے۔ خربوزے کی طرح ایک دوسرے کا رنگ پکڑ نے والے۔ شاہین جیسی فطرت اب کہاں، تم میں؟ تم بھی چھپائے رہتے ہو اپنی مُتلوّنِ فطرت، ایک دوسرے سے، میری طرح۔"

"آدم علیہ صلاۃ والسلام کا نام تو سنا ہوگا؟" اُس نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"ہاں، ہاں۔" مَیں نے برجستہ اقرار کیا۔

"کیوں نہیں، ابا جو تھے تمھارے وہ، کبھی اُوپر تھے، سفید پوش۔ پھر میرے ایک اشارے پر یعنی کہ قدرتی نظام کے تحت نیچے آگئے، دھڑام سے: ہاہاہا۔۔۔ہا۔۔۔! کہتے ہیں تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغامبر آئے، دنیا میں۔ سارے کے سارے، سفید پوش۔ سفید چہروں پر مونچھیں لیے، سفید سفید۔ پیغام بھی دیے، اپنی نسل کو۔ لیکن اولادوں کی مونچھیں نکلیں پھر کالی، بھیڑوں جیسی چال والی۔ تم بھی وہی ہو، نا؟"

"مَیں کہاں؟" میری آواز ممیا گئی، شیر کے سامنے۔

"کہا نا؟ مَیں نے؟ تم چھپا رہے ہو خود کو، مجھ سے۔ دیکھو۔۔۔! مَیں تمھارا ہی بھائی ہوں، پہچانتا خوب ہوں، تم کو۔ مجھے بیوقوف بنا رہے ہو...! دائی سے پیٹ چھپا رہے ہو؟" اُس نے پھر گھڑکی دی۔

"نہیں بھائی، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" مَیں کانپ گیا۔

"ہے۔۔۔ ہے۔۔۔ ایسا ہی ہے کچھ۔ ابھی اُتارتا ہوں، تمھارے کپڑے۔ کرتا ہوں ننگا سرِ عام، تم کو، پیاز کے چھلکوں کی طرح۔ سمجھے!" اس نے لمبا سانس لے کر آگے پوچھا: "اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ تم ہو کون؟"

"اُسی آدم کی اولاد! جس کی تم بات کر رہے تھے۔"

"اوہ! آدم۔۔۔؟ تھا جو مسجودِ ملائک، تم وہی آدم ہو؟"

"ہاں، ہاں وہی وہی!"

"ہاں ہاں وہی وہی! تھے تو آبا، وہ تمھارے ہی؛ مگر تم کیا ہو؟ اوپر سے تو آئے تھے، آدم کے روپ میں۔ مگر اب کیا ہو، وہی وہی؟ میرا مطلب سکھ ہو؟ ہندو ہو؟ یا پھر عیسائی؟ کچھ تو بولو! میرے بھائی؟ کون ہو، اُن میں سے تم؟ وہی وہی!" اس نے ایک ہاتھ اٹھلا کر انگلیاں نچاتے ہوئے میرا مذاق بنایا۔

"مَیں تو مسلمان ہوں، بھائی۔"

"مسلمان! آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟ شور ہے، ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود! مسلمان، اب رہے کہاں؟ ابے نمرود! بت شکن اُٹھ گئے، باقی جو رہے؛ بت گر ہیں۔ ہوگا، تو ہوگا کوئی ڈھکا چھپا۔ میری نظر میں تو کوئی ہے نہیں مسلمان، اب۔ ہاں، نام نہاد تو ہیں اور بے شمار ہیں؛" اس نے ذرا رک کر پوچھا " جانتے ہو؟ نام نہاد مسلمان، کیا ہوتا ہے؟"

''بالکل جانتا ہوں۔'' مَیں نے وثوق سے کہا۔

''بتاؤ تو ذرا؟'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''پکا مسلمان، میری طرح۔'' مَیں نے برجستہ بتایا، جس پر وہ ہنستے ہنستے لوٹ گیا، پھر بڑی دیر میں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا ''چلو مان لیتا ہوں کہ پکے مسلمان ہو، یعنی کہ نام نہاد۔ مگر یہ تو بتاؤ میرے دوست کہ تم ہو کون سے مسلمان؟''

''کون سے مسلمان!'' مَیں نے تعجب کیا۔

''ہاں بھئی ہاں، ہو کون سے مسلمان؟ مسلمانوں کی کتا گری ایک دو تو ہیں نہیں۔ دنیا بھری پڑی ہے، مسلمانوں کی کتا گری سے! اور ان کی مسجدیں الگ الگ ہیں، بھائی! خدا ایک، اور اس کی مساجد کے خدا، جدا جدا! یعنی کہ بے شمار! سمجھے کہ نہیں؟'' اس نے مجھ کو ٹارگٹ مان کر میزائل داغ دیا۔

''نہیں سمجھا۔'' اور مَیں نے نہیں کہہ کر خود کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

''سمجھو گے بھی نہیں تم، اور نہ ضرورت ہے سمجھنے کی، ابھی تم کو۔ بس، نام ہی کے بنے رہو مسلمان۔ آپس میں مار کاٹ کرنے والے۔ کچھ دنوں میں خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ ابھی تو اتنا بتاؤ! میرے بھائی کہ ہو کون سے مسلمان؟ شام کے نصری؟ عمان کے عبادی؟؟ دروز؟ داعش؟ کردوں؟ خارجی تکفیری؟ داؤدی بوہرا؟ آغا خانی بوہرا؟ ایزدی؟ سنّی؟ یا پھر شیعہ؟'' اُس نے میرا سراغ لگانے کے لیے مجھ کٹی پتنگ کو پھانس کر لانے کے لیے اپنی پتنگ کی ڈھیل مزید بڑھا دی۔

''شیعہ شیعہ۔'' مَیں نے برجستہ کہا۔

''پر کون سے شیعہ ہو بھائی؟ کون سے شیعہ؟ علوی؟ حسنی؟ یا پھر حسینی؟ زیدی؟ باقری؟ جعفری؟ کاظمی؟ رضوی؟ تقوی؟ نقوی؟ عسکری؟ کچھ تو بولو بھائی!'' یا پھر آنے والے مہدی؟؟''

''نہیں نہیں، شیعہ نہیں۔ مَیں تو سنّی ہوں؛ سنّی، یعنی کہ ٹناٹن سنّی۔''

''اوہ! ٹناٹن سنّی؟ سمجھ گیا، سمجھ گیا مَیں؛ پوری طرح سمجھ گیا، تم سنّی ہو؛ یعنی کہ ٹناٹن سنّی۔ مگر ٹناٹن سنّی صاحب! یہ تو بتاؤ! ہو کون سے سنّی ٹناٹن؟ سلفی؟ شافعی؟ صوفی؟ مالکی؟ حنبلی؟ یا پھر حنفی؟؟''

''م۔م۔م۔ مَیں حنفی ہوں، حنفی۔''

''کون سے حنفی بھائی؟ بریلوی؟ یا دیوبندی؟؟''

''دیوبندی۔''

''کون سے دیوبندی؟'' وہابی؟ تبلیغی؟ مظاہری؟ قاسمی؟ جماعت اسلامی؟ مودودی؟ سر سیّد والے نیچری؟ چکڑالوی؟ شمع نیازی؟ سلفی؟ یا اہلِ حدیثی؟''

''نہیں نہیں۔ مَیں دیوبندی نہیں؛ بریلوی ہوں، بریلوی۔''

''کون سے بریلوی بھائی؟ کون سے بریلوی؟ قادری؟ سہروردی؟ نقشبندی؟ چشتی؟ قطبی؟ فریدی؟ صابری؟ واحدی؟ برکاتی؟ اشرفی؟ رضوی؟ عطاری؟ قدیری؟ فردوسی؟ یا سالمی؟'' اصولی؟ اخباری؟ ملنگ؟ اثنا عشری خوجہ؟ مولائی؟ دیوبندی ٹناٹن؟ بریلوی ٹناٹن؟ سلفی ٹناٹن؟ حنفی ٹناٹن؟ شافعی ٹناٹن؟ اہلِ حدیث ٹناٹن؟ مواحدون ٹناٹن؟ خواجہ ٹناٹن؟ یا کہ پھر صوفی ٹناٹن؟ تم ہو کون سے سنّی ٹناٹن، یہ تو بتاؤ؟''

''کون سے سنّی؟'' مَیں نے کہا۔

''ارے بھئی ہاں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمھیں پتا ہی نہیں کہ تم ہو کون؟ بھئی ٹناٹن سنّی صاحب! اگر تم نے بتا بھی دیا کہ مَیں فلاں سنّی ہوں تو مَیں پھر پوچھوں گا کہ تم سیّد ہو؟ اور لیس ہو؟ قریشی؟ عباسی؟ تیلی؟ نائی؟ دھوبی؟ تنبولی؟ بہشتی؟ رنگریز یا انصاری؟ یا کہ پٹھان؟ سلمانی، فاروقی، میراثی، کون ہو ٹناٹن بھائی؟؟''

''پٹھان، پٹھان، پٹھان، بھئی پٹھان ہوں مَیں تو پٹھان، ٹنا

گوپی ناتھ امنؔ کے فرزند کی شادی تھی۔ انہوں نے دہلی کے دوست شعراء کو بھی مدعو کیا۔ ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی بھی شریک تھے۔ ہر شاعر نے سہرا یا دعائیہ قطعہ یا رباعی سنائی۔ امنؔ صاحب نے بیدی صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی کچھ ارشاد فرمایئے تو بیدی صاحب نے یہ شعر فی البدیہ کہہ کر پیش کر دیا۔

جنابِ امنؔ کے لختِ جگر کی شادی ہے
مگر غریب کو کس جرم کی سزا دی ہے

اندازِ نظامت

چیمسفورڈ کلب کے ایک مشاعرے میں، جس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی کر رہے تھے، انہوں نے جناب عرشؔ ملسیانی سے کلام سنانے کی گزارش کی جب عرشؔ صاحب مائیک کی طرف جانے لگے تو بیدی صاحب نے فرمایا ؎

عرش کو فرش پر بٹھاتا ہوں
معجزہ آپ کو دکھاتا ہوں

اور اسی طرح دوسرے شاعر کو بلانے سے پہلے فرمانے لگے کہ ایک محاورہ ہے۔ ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' کیا ستم ظریفی ہے کہ اب میں آپ کے سامنے ایک ایسے شاعر کو پیش کر رہا ہوں جو ہر طرح سے گھرا ہوا ہے اور قافیہ ردیف کا بھی پابند ہے اس ستم یہ کہ سرکاری ملازم بھی ہے اور تخلص ہے آزاد۔
اس پر جگن ناتھ آزاد اٹھ کر مائیک پر تشریف لے آئے۔

ٹن پٹھان۔'' مَیں نے برجستہ جواب دیا۔

''پٹھان ! اوہ! پٹھان؟ یعنی کہ خان بھائی ۔لڑھی جوت ، یا لال منہ کے پٹھان یا پھر چوڑی ہڈی والے یعنی کہ..''

''ہاں ہاں... وہی وہی ۔'' مَیں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی چوڑی ہڈی والے پٹھان ہونے کی حامی بھرلی۔

''خان بھئی، پہلے اپنی پٹھانوی پر ایک لطیفہ سن لو، ایک پٹھان تھے یعنی کہ خان صاحب؛ اور ایک تھے پنڈت جی۔ دونوں کی ایک دوسرے سے دوستی تھی، دانت کاٹی اور ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی ۔ایک بار ہندو مسلم فساد ہوا، تو خاں صاحب نے پنڈت جی کے یہاں جانا بند کر دیا، لیکن پنڈت جی برابر آتے رہے، خان بھائی کے یہاں ۔ پنڈت جی نے خاں صاحب سے ان کے نہ آنے کا شکوہ کیا تو خاں صاحب نے کہا: ''پہلے آپ مسلمان ہو جائیں، تب ہی آؤں گا ، ورنہ نہیں۔'' پہلے تو پنڈت جی بہت چکرائے، لیکن جب محبت نے جوش مارا تو بے چارے مجبور ہو گئے۔ انھوں نے خاں صاحب سے کہا '' مجھے بتاؤ! مَیں کیسے مسلمان بنوں؟'' خان صاحب نے برجستہ کہا: ''قلمہ (کلمہ) پڑھو! قلمہ (کلمہ)۔'' پنڈت جی نے جوش میں آ کر کہا: ''اچھا، پڑھاؤ کلمہ!'' خاں صاحب پہلے تو کچھ دیر کے لیے خاموش رہے، پھر چکرا کر بولے ''قلمہ (کلمہ) تو بھائی مجھے بھی نہیں آتا!'' لگتا ہے اسی طرح کے خان ہو، تم بھی ؟ شاٹن، یعنی کہ کچھ بھی نہیں، نہ تم ہندو ہو، نہ ہی مسلمان، نہ سکھ ہو، اور نہ ہی تم ہو عیسائی، تم تو مطلب پرست ہو میرے بھائی۔ تمھارا تو اب کوئی مذہب ہی نہیں ہے، میری طرح۔''

''اچھا! اچھا اب تم بتاؤ! کہ تم کون ہو؟'' مَیں نے رگرگٹ سے پوچھا۔

''ارے! کمال ہے، کمال ہے بھائی! ساری دنیا جانتی ہے؛ اور تم نہیں پہچانتے ؟''

''نہیں، مَیں نہیں پہچانتا!'' مَیں نے برجستہ کہا۔

''نہیں پہچانتے ؟ تو سنو! تم نے اقبالؔ کو تو پڑھا ہوگا؟

گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
مَیں لرزتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

''نہیں، مَیں نے تو نہیں پڑھا۔''

''نہیں پڑھا، تو تم کیا جانو، اُن کو؟''

''ہاں، جانتا تو ہوں۔''

''جانتے ہو! مگر کیسے؟''

''وہ تو میرے چچا تھے ، گھنگرو باندھ کر ناچتے تھے ۔اور دوسروں کو بھی سکھاتے تھے۔'' مَیں نے بتایا اور اس نے بڑے زور سے ٹھٹا لگایا۔

''چلو شکر ہے؛ اتنا تو جانتے ہو اقبالؔ کو۔ وہ ناچتے تھے اور دوسروں کو بھی سکھاتے تھے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس کھینچ کر آگے کہا: ''وہ بے چارے ناچ ناچ کر خود کو گھائل کر کے زندگی بھر دوسروں کو درس دیتے دیتے مر گئے، اور تم ان کے گھنگروؤں کی آواز بھی نہ سمجھ سکے، یار.....! اور اَب سمجھ بھی نہ سکو گے۔ اب تو اُن کے گھنگروؤں کی وہ دل دوز جھنکار اُردو ہی چھین لی، مَیں نے، تم سب سے، جس میں ان کا درس تھا، اور تمھارا سبھی کلچر بھی۔ جس سے شناخت تھی تمھاری۔ اَب نہ رہا بانس، اور نہ بجے گی

بانسری، اب تو اپنی ہی بجے گی بانسری۔اور بج بھی رہی ہے۔ سنو! اُردو ختم کرنے والا کون؟ حوّا کو بہکانے والا کون؟ آدم کو نیچے لانے والا کون؟ دنیا کو ملکوں میں بٹوانے والا کون؟ مذہبی تفریق پھیلانے والا کون؟ مسلمانوں کو مسلکوں میں بٹوانے والا کون؟ انسان کو شیطان بنانے والا کون؟ سمجھے؟ مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا؛ ہم نے اُسے انسان سے شیطان بنایا۔ انسان تو انسان، بھگوان کی ہر شے کو مذہبوں کے رنگ دے ڈالے ہیں، مَیں نے، سمجھے؟ یہاں تک کہ چرندوں، پرندوں، سبزیوں، پھلوں، اَناجوں، کھانوں، مٹھائیوں، دِنوں، مقاموں، مکانوں کی گرستیوں، سمتوں، پیڑ، پودوں، ندیوں، پتھروں، لباسوں اور رنگوں تک کو مذہبی رنگوں میں رنگ ڈالا ہے۔ساری دنیا میں میری ہی حکومت ہے، اِس وقت۔ یہ اُونچ نیچ، ذاتیں، میری ہی ہیں کراماتیں۔ ننگا ناچ، مَیں ہی تو کروا رہا ہوں، دنیا میں۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر نیم برہنہ دوشیزائیں مٹکتی پھرتی ہیں، چھیل چھبیلی؛ خوش بودار، تنگ کپڑوں میں، اپنے جسموں کی نمایش کرتی ہوئی؛ سرخی پاوڈر پوتے؛ میرے ہی اشارے پر تو۔تو تم کیا سمجھتے ہو، یہ سب جنّت میں جائیں گی....؟ ان کو بہلا پھسلا کر، بہکا کر بے غیرت، بے شرم، بے حیا اور ننگا اسی لیے کر دیا ہے کہ یہ سب جہنّم میں جھونکی جائیں، سمجھے؟ اور مَیں عیش کروں، اُن کے ساتھ، سمجھے؟ عورتیں پسند ہیں، مجھ کو، کیوں کہ یہ اپنے شوہروں کی اتنی نہیں مانتیں جتنی کہ میری۔ حوّا نے بھی میری مان کر آدم کو گندم کھلایا تھا۔مَیں انھیں میں رہتا بھی ہوں، زیادہ تر لیعنی کہ بٹوے پر۔وہیں اپنے رنگ ڈھنگ بدل بدل کر دل بہلاتا ہوں، ان کے ساتھ۔''

''لے تو اُن کے شوہروں کو بھی جاؤں گا جہنم میں۔ پیر دبوانے کے لیے، اپنے۔ کیوں کہ وہ اپنی عورتوں کو آوارہ چھوڑے ہیں، بے لگام۔ یہ لوگ اپنے ماں باپ کی خدمت نہ تو خود کرتے ہیں اور نہ اپنے بیوی بچّوں سے کرواتے ہیں۔ضرورت تو بچّوں کی بھی ہوگی، وہاں۔ اسی لیے تو بگاڑ رکھا ہے، اُن کو۔ وہ اب میرے اشاروں پر چلتے ہیں، وہ اب بڑوں کا کہنا نہیں مانتے اور نہ ہی پڑھنے میں من لگاتے۔ ٹی۔وی۔اور موبائل چلاتے ہیں۔ یہ لت مَیں نے ہی ڈال رکھی ہے، اُن میں۔'' گرگٹ نے اچھل اچھل کرناچتے ہوئے بتایا۔

''مگر یہ تو بتاؤ...! ایسا تم کر ہی کیوں رہے ہو؟''

''اپنی بھلائی کے لیے۔''

''اپنی بھلائی کے لیے؟'' مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں بھئی ہاں، مَیں چاہتا ہوں زیادہ سے زیادہ لوگ جہنم میں جائیں، اسی میں ہے، میری بھلائی۔اس کے بعد جب حساب ہوگا، تو ہم سے زیادہ اِن سب کے گناہ نکلیں گے۔ کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ مَیں سب سے زیادہ عالم، فاضل ہوں اور خدا کی عبادت بھی مَیں نے ہی کی ہے۔بس ایک نافرمانی پر یہ سزا ملی مجھ کو، اور تم سب تو بے شمار نافرمانیاں کرتے ہو، اللہ کی؛ تم لوگ تو ہم سے کہیں زیادہ گناہ گار ہو۔ایک بات اور بتاتا چلوں تم کو، لوسُن لو...! سات جانور بھی ایسے ہیں جو بہشت میں جائیں گے، اور میاں اَشرف المخلوقات؟ ہاہاہا! جہنّم میں۔ مَیں اَب بھی تم سب سے لاکھ گنا اچھا ہوں۔تم سب جہنم میں ہوگے، اور مَیں بہشت میں عیش کروں گا، حسیناؤں کے ساتھ۔او۔کے۔'' گرگٹ نے کہتے ہوئے اپنا سینہ تان کر اپنے سارے جسم کے سفید رنگ کو سمیٹ کر سفید مونچھ میں پیوست کر کے، سفید مونچھ کو مزید سفید کیا اور پھر ایک بھیانک آواز کے ساتھ، بھر پور زور لگاتے ہوئے آسمان کی جانب اُٹھاتا گیا؛ اُٹھاتا گیا۔ اور پھر ایک بھیانک دردناک چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔اس کی سفید مونچھ آگ سے جھلس کر کالی پڑ گئی۔

''اس کا مطلب کہ تو ابلیس ہے؟'' جب وہ کافی دیر بعد ہوش میں آیا تو مَیں نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم نے صحیح پہچانا، دوست! مَیں ابلیس ہی ہوں۔''

''اچھا ٹھہر! تیرا علاج تو ہے میرے پاس!'' اور جیسے ہی لاحول پڑھا مَیں نے۔ وہ بجلی جانے پر ٹی۔وی۔ کے اسکرین سے تصویر کی طرح غائب تو ہوگیا۔لیکن میرے وجود کے سیہ خانوں میں سہ بُرُوتی کے گلّے پھوٹنے لگے۔

ثریا بابر

زبان کی پھسلن

کوئی آٹھ سال کی عمر ہوگی ہماری۔ سگی چچی ایک گاؤں سے اور سوتیلی دادی دوسرے گاؤں سے ہمارے گھر بہاول پور رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ امی ان کے لیے مزے مزے کے کھانے پکاتے پکاتے تھک جاتیں اور ان کے نخرے ہی لیے نہ پڑتے۔ ابا اپنی ماں (سوتیلی ہی سہی) اور بھابی کو بہت خوش کرنا چاہتے تھے اس لیے امی اور ابا ان کے لیے بہت مہنگے مہنگے کپڑے لے کر آئے مگر وہ تو ناک منہ چڑھا کر بیٹھی رہیں، لینے سے انکار بھی نہ کیا۔ اٹیچی میں سب سے نیچے دبا کر رکھ لیے۔ ابا اُن کے ناخوش ہونے پر بڑے پریشان تھے۔ وہ کپڑے جو ہمارے ابا کو پریشان کر دیں ہمیں بھی بہت برے لگنے لگے۔ دادی اور چچی نے آپس میں تو ہماری امی کی بہت برائیاں کر لیں مگر کسی اور کو سنائے بغیر انہیں چین پڑنے والا نہ تھا۔ دوسرے دن وہ ہمیں ساتھ لے کر ملنے کے بہانے پڑوس میں چلی گئیں۔ تھوڑی سی دیر کی دعا سلام کے بعد ہی وہ ہمارے امی ابو کے لائے ہوئے کپڑوں کی برائیاں کرنے لگیں۔ ہم خاموشی مگر غور سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہماری امی گوری چٹی ہیں جب کہ وہ دونوں گہری سانولی تھیں۔ بچپن تھا، زبان اور دل کے درمیان فاصلہ بھی کم تھا (جو کبھی بھی زیادہ نہ ہو سکا) ہم نے دل سے کہہ دیا ”جیسی تمہاری شکلیں، ویسے تمہارے کپڑے۔۔۔۔۔“

پڑوسنیں کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔ دادی اور چچی گھر آئیں تو امی سے ہماری شکایتیں لگائیں۔ ابا اس وقت دکان پر تھے۔ اُن کو پیغام بھجوا دیا ”ہم جا رہے ہیں گاؤں میں ضروری کام ہے“ کپڑے پھر بھی نہ چھوڑے، ساتھ لے گئیں۔ ابا آئے تو امی نے صورت حال کی سنگینی کو تھوڑا کم کر کے ہماری باتیں بتا دیں۔ ابا کے حضور ہماری طلبی ہوگئی۔ ہم نے بھی صاف کہہ دیا ”ہماری امی گوری اور اچھی ہیں، کچھ بھی پہن لیں اچھا لگتا ہے، ان پر تو اچھے کپڑے بھی برے لگ رہے تھے۔“

ابا نے مسکرا کر امی کو دیکھا۔ امی نے سر جھکا لیا۔ بہر حال ہم سے کچھ زیادہ پوچھ گچھ نہ ہوئی۔ مگر اب ہمیں اپنی امی چہرے پر کچھ سکون نظر آیا۔ ہمیں اسکول کی کتابیں وہ زیادہ تر خود ہی پڑھاتی تھیں۔ اب ہمیں اس کے لیے زیادہ وقت ملنے لگا۔ گھر بھی دوبارہ سے صاف رہنے لگا۔ مگر اللہ ہی جانے زبان کی لغزش کا یہ فائدہ تھا یا نقصان؟

اسکول میں داخلہ تو تھا ہی، ہمارے پڑوس کے کچھ بچوں نے

بھی اسکول جانا شروع کیا۔ امی نے ہمیں ان کے ساتھ کر دیا کہ اکٹھے اسکول چلے جایا کرو۔ ان کے گھر میں گالیوں کا عام چلن تھا۔ ہم بھی ان کے ساتھ گالیاں سیکھ گئے۔ دوسری گلی میں جا کر پہل دوج بھی کھیلنے لگے۔ ایک خاتون کے ٹھیکری لگ گئی، اُنہوں نے ڈانٹا، ہم نے گالی دے دی۔ وہ ایک دم سے ہنس پڑیں، ہمارے دونوں گال پکڑ کر بولیں ''تمہارے منہ سے تو یہ بھی اچھا لگتا ہے۔'' بس اب ہمیں گالی دینا اچھا لگنے لگا۔ اب ہم بات بات پر گالی دینے لگے۔ جس نے گالی سکھائی تھی ایک دن اس کو کچھ زیادہ ہی نواز ڈالا۔ اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ اس نے ہمیں سمجھایا کہ ''گالی صرف غصے کے وقت دیتے ہیں۔'' ہم نے یہ بات بھی پلے باندھ لی۔

گھر میں مالٹے آئے رکھے تھے۔ ہم نے سب سے بڑا والا اٹھا لیا۔ بھائی جان نے چھین لیا۔ ہم نے گلا پھاڑ کر اُنہیں گالی دے دی۔ انہوں نے چپل اٹھائی اور ہمیں پٹک پٹک کے دھویا۔ ہم خود کو چھڑا کر چیختے چلاتے امی کے پاس پہنچ گئے جو بڑے سکون سے کھانا بنا رہی تھیں۔

''امی ہمیں بھائی جان نے چپل سے مارا ہے۔'' ہم وہاں جا کر پوری طاقت سے چلائے۔

''تو بیٹا جی آپ نے گالی کیوں دی تھی؟'' بڑے سکون سے جواب ملا ''اب اگر دوبارہ میں نے ایسے الفاظ سن لیے تو پائپ سے ماروں گی!''

ایک تو امی غلط بات پر کبھی حمایت نہیں کرتیں۔ وہ دن، آج کا دن، گالی نوکِ زباں پر تو کیا؟ دل اور ذہن کے کواڑوں تک بھی نہ آ سکی مگر اللہ ہی جانے زبان کی پھسلن کا یہ فائدہ تھا یا نقصان۔

آٹھ سال اور گزر گئے، بڑی بہن ماہ جبین کا رشتہ آیا۔ رشتہ لانے والوں سے رشتہ داری کا تعلق تو تھا مگر اتنا زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ جانچ پرکھ تو بہر حال لازمی تھی۔ ویسے بھی گھر میں غیروں کا گزر نہ تھا۔ ابا یا بھائی جان کے جو بھی دوست آتے، بیٹھک سے ہی چائے پانی کر کے رخصت کر دیے جاتے۔ مگر رشتہ داروں کے معاملے میں اتنی سختی نہیں تھی۔ کوئی بھی آتا، حاضر ہو کر سلام کرنا لازمی تھا۔ لڑکے لڑکیاں آتے جاتے سلام دعا بھی کر جاتے، شوخیاں بھی کر جاتے، ہاں رل مل کر بیٹھنے نہ دیا جاتا تھا۔ شادیوں میں تو یہ بندشیں اور ڈھیلی پڑ جاتیں۔ یوں دو افراد کی شادی ہوتی، کئی ایک کے رشتے ہو جاتے۔

امی، ابا، دونوں نے اپنے اپنے بہن بھائی بلا لیے تاکہ لڑکے سے ملاقات بھی ہو جائے، بردکھوا بھی ہو جائے۔ ہمارے چار کمروں کے گھر میں اچھی خاصی چہل پہل ہو گئی۔ سب کی اولاد مل کر کوئی دس لڑکے اور بارہ لڑکیاں گھر میں ہو گئیں۔ پانچ ہم بہن بھائی۔ کوئی گیارہ بجے امی ابا کے بہن بھائی پہنچے، ایک بجے کے قریب لڑکے والے بھی آ گئے۔ وہ بھی کوئی درجن بھر لوگ تھے۔ کمرے میں جالی کے دروازے لگے ہوئے تھے۔ خواتین تو باورچی خانے میں مصروف تھیں، لڑکیوں کو ایک کمرے میں بند کر

حفظِ ماتقدم

دیا گیا۔ ہم ان کے ساتھ مل کر جالی کے دروازے سے لڑکوں کا مشاہدہ کرنے لگے۔

متوقع دولہا بھائی کے ساتھ آئے ہوئے ایک سانولے سے نوجوان کو دیکھ کر ہم عش عش کر اُٹھے۔ بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، بھرے بھرے ہونٹ، ستواں ناک، ریشمی بالکل کالے بال، بیچ میں سے مانگ نکالی ہوئی، دونوں طرف سے بال کانوں کی لوؤں تک آتے تھے مگر ستم یہ ڈھایا تھا کہ مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ اگر وہ بھی صاف کرادی جاتیں تو ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ مس یونیورس کے مقابلے میں اوّل پوزیشن شاید تادمِ جوانی ان ہی کے پاس رہتی۔

کھانا کھلانے کی ذمہ داری لڑکیوں کو سونپی گئی تھی۔ کھانا کھلانے کے دوران ہمیں ان صاحب کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی پلکیں کناروں سے اس طرح مڑی ہوئی تھیں جیسے کسی نے رولر لگا کر موڑ دی ہوں۔ اتنی خوب صورت پلکیں تو ہم نے کسی خاتون کی بھی آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ واقعی اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

کھانے کے بعد سب لڑکیوں نے مل جل کر فٹافٹ باورچی خانہ صاف کر دیا۔ سردیاں تھیں، دوپہر میں سونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ سب لڑکے مل کر کرکٹ کھیلنے لگے۔

وہ نشیلی آنکھوں والا لڑکا بیٹنگ کرنے آیا۔ ہمارے چھوٹے بھائی بڑی زور سے گیند کراتے ہیں۔ اُنہوں نے جو ہاتھ گھما کر گیند کرائی، اوئی اللہ کی باریک سی آواز آئی اور وہ لڑکا لچک مٹک کر ایک طرف ہو گیا۔ جالی کے پیچھے سے یہ نظارہ دیکھتے ہوئے ہم لڑکیوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ ہماری خالہ جو ہمارے ساتھ نظارے لینے میں مصروف تھیں، ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بولیں ''اے موا۔۔ یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟؟؟''

ہماری ماموں کی بیٹی جو بڑے غور سے ان کو دیکھنے میں مصروف تھیں، بولیں ''لباسِ تنگ کے حساب سے تو اِن کے لڑکا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔'' محترم جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھے۔ اس بات پر پھر ایک قہقہہ پڑا۔

تخلص کی داد

مولانا الطاف حسین حالؔی ایک شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے کسی مداح کے مکان پر مقیم تھے۔ میزبان نے اُن کی خدمت پر ایک دیہاتی کو مقرر کیا اور اُس سے کہا ''یہ مولانا حالی ہیں۔''

دیہاتی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا ''کیا ہالی (یعنی ہل چلانے والا) بھی مولانا ہو سکتا ہے۔''

مولانا حالؔی نے یہ سُن کر ہنس پڑے اور فرمایا ''اس سے بہتر میری ستائش اور نہیں ہو سکتی، آج مجھے اپنے تخلص کی داد مل گئی ہے۔''

ممانی اور چچی چائے بنا رہی تھیں۔ ہمیں بھی چائے پینے کے لیے بلا لیا گیا۔ لڑکے والے ڈرائنگ روم میں چائے پینے لگے۔ ہم سب لڑکیاں دوسرے بڑے کمرے میں جمع ہو گئیں۔ چائے پی کر ہماری طبیعت میں چہل آئی۔ وہیں رکھا ایک پلاسٹک کا بلا اٹھا کر ہم اس ہیروئن نما ہیرو کی مٹک مٹک کر نقل اتارنے لگے۔ ہماری خالہ اور دوسری لڑکیوں کے ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔

چھٹی حس کام کر گئی۔ ہم بلا رکھ کر بیٹھے ہی تھے کہ لڑکے والے کمرے میں داخل ہوئے۔ ماہ جبیں آپا کے رشتے کے لیے ہاں ہو گئی تھی۔ وہ مٹھائی دے کر رخصت ہونا چاہتے تھے۔ وہی حضرت سب سے آگے آگے تھے۔ اُنہوں نے خالہ سے اپنا تعارف کروایا۔ ان کا نام جمیل تھا پھر وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولے'' آپ سب سے بڑی سالی ہیں نہ؟؟ میں ثاقب بھائی کے چچا کا بیٹا ہوں اس طرح میں آپ کا بھائی لگتا ہوں۔''

زبان کو تو پھسلنے کی بیماری ہے، پھر پھسل گئی اور ایسی پھسلی کہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ ہمارے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا ''ہمیں تو آپ اپنی بہن سی لگتے ہیں!''

اُن کی نشیلی آنکھیں کچھ غصیلی بھی ہو گئیں۔ بڑے ضبط سے بولے ''میں ثابت کر سکتا ہوں'' پھر اُنہوں نے جانے کیا سوچ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا، خالہ کے آگے سر جھکایا ''اچھا خالہ ہم

چلتے ہیں!'' سلام کیا اور چلے گئے۔ ہمارا دل ڈر گیا کہ اب اگر اُنہوں نے بھائی جان سے شکایت کر دی اور بھائی جان نے ہمیں پٹک پٹک کر دھویا تو کیا ہوگا۔

ہمارے فرسٹ ائیر کے امتحان چل رہے تھے کہ ماہ جبیں آپا کے سسرالی شادی پر اصرار کرنے لگے۔ ہمیں سن گن ملی کہ ہمیں بھی ساتھ ہی فارغ کرنے کی تیاری ہے۔ ہم نے چھوٹے بھائی کی ڈیوٹی لگائی کہ معلوم کرو کیا معاملہ ہے؟؟ انہوں نے جا کر سیدھے سبھاؤ پوچھ لیا ''امی۔۔۔!! آپی پوچھ رہی ہیں کہ آپ کہاں میری شادی کر رہی ہیں؟؟'' امی کے حضور ہماری طلبی ہوگئی۔ امی نے بتایا کہ لڑکا مہذب ہے، شریف ہے، لڑکے والے ثاقب کے محلے میں ہی رہتے ہیں۔ لڑکا میڈیکل ریپ میں ہے۔ پھر انہوں نے تھوڑا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ہماری طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

زبان کو تو پھسلنے کی بیماری ہے پھر پھسل گئی، ہم مودب ہو کر بولے۔ ''میڈیکل کی حد تو ٹھیک ہے، یہ دوسرا لفظ ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔''

امی نے گھور کر ہمیں دیکھا ''فالتو ضرور بولنا ہے تمہیں، لڑکے والے ثاقب والوں کے محلے میں ہی رہتے ہیں۔ دونوں بہنیں ساتھ ہو جاؤ گی، ماہ جبیں کام میں ذرا سست ہے اس کی مدد کر دیا کرنا۔''

تھوڑا بہت فالتو بولنے کے علاوہ ہماری کچھ اور ہمت نہ تھی۔

شادی کی تقریبات شروع ہو گئیں۔ تقریبات کے دوران ہم حساب لگاتے رہے، صبح نو بجے اپنے گھر کی جھاڑو، دس بجے ماہ جبیں آپا کے گھر کی جھاڑو، گیارہ بجے اپنے گھر کے برتن اس کے بعد ماہ جبیں آپا کے گھر کے برتن۔۔۔ شادی نہ ہوئی ماسی گیری ہو گئی ہم اپنے بچے کب میں پالیں گے؟

رخصتی ہوگئی۔ میاں صاحب گھونگھٹ اٹھاتے ہی بولے ''اوئی اللہ۔۔۔ آپ کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔۔۔؟''

یہ موئی نگوڑ ماری، کم بخت زبان پھر پھسل گئی۔۔۔ منہ سے پھر نکل گیا ''ائے ہائے۔ ہائے اللہ یہ تو وہ ہی زنانی ہے۔۔۔''

پہل کی چار بیٹیاں، پھر تین سال تک دو دو جڑواں بیٹے، پھر ہر سال ایک ایک بیٹا، ماشاء اللہ۔۔۔ دس سال میں گیارہ بچے ہمارے گرداگرد چوں چوں کرتے پھر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہم بے بس ہو کر، مجبور ہو کر ان نشیلی آنکھوں کے آگے ہاتھ جوڑ دیتے ہیں کہ اب بس بھی کریں تو بڑے سکون سے جواب ملتا ہے ''مجھے زنانی کیوں کہا تھا۔''

ماہ جبیں آپا جن کے لیے امی نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ اُن کی کام میں مدد کر دینا۔ ہمارے کام کر کر کے پریشان ہیں۔ اُنہیں اللہ نے ابھی تک اولاد سے نہیں نوازا۔ اکثر تو وہ ہی ہمارے گھر آتی ہیں لیکن قصوروار وہ بھی ہم کو ہی ٹھہراتی ہیں۔ ظاہر ہے قصور تو ہمارا بھی ہے۔ زبان تو ہماری ہی پھسلی تھی مگر زبان کی پھسلن کا یہ فائدہ ہے یا نقصان؟ فیصلہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔

اقبال حسن آزاد

ہاشم بھائی قاسم بھائی ٹوپی والا

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ہاشم بھائی قاسم بھائی ٹوپی والا کی زندگی نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ گزر رہی تھی۔ بڑے سرکاری افسر ہوا کرتے تھے۔ پنشن اچھی خاصی تھی۔ بچوں کو بھی انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور وہ سب کے سب کامیابی کی نئی منزلیں سر کر رہے تھے۔

ہاشم بھائی دیندار آدمی تھے، صوم و صلوۃ کے پابند، ہمہ وقت سر پر ٹوپی پہنے رہتے۔ فجر کے وقت بیدار ہوتے۔ نماز سے فارغ ہوکر کافی دیر تک تلاوت کرتے۔ پھر اخبار پڑھتے، ٹی وی پر خبریں سنتے یا بچوں سے فون پر بات کرتے۔ ان کی بیگم سگھڑ، سمجھدار اور ہوشیار تھیں۔ کبھی شوہر کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی بھی غضب کی تھی۔ لوگ ان پر رشک کیا کرتے تھے۔

ہاشم بھائی کی زندگی ایک بندھی بندھائی ڈگر پر رواں تھی کہ اچانک اس میں ایک خوشگوار موڑ آ گیا۔ چھوٹی بیٹی نازنین ایک دفعہ دہلی سے لوٹی تو ان کے لیے لیپ ٹاپ لیتی آئی۔ ہاشم بھائی نے عام موبائل کا استعمال تو خوب خوب کیا تھا لیکن لیپ ٹاپ سے ان کی شناسائی نہیں تھی۔ نازنین نے چند ہی روز میں انہیں سب کچھ سکھا دیا۔ اب تو بس ہاشم بھائی تھے اور ان کا لیپ ٹاپ۔ فیس بک نے تو ان پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دئے تھے۔ ایک بیٹا امریکہ میں تھا، دوسرا مسقط، تیسرا دمام اور چوتھا قطر میں۔ بڑی بیٹی شارجہ میں مقیم تھی۔ ان کے سارے بھائی بہن پاکستان میں تھے۔ نیٹ کے ذریعہ سے سب کے سب قریب آگئے۔ ویڈیو کال ہوتی اور گھنٹوں گفتگو ہوتی۔ رشتہ داریوں کا ٹوٹا ہوا سرا پھر سے جڑ گیا اور ہاشم بھائی ہمہ وقت اپ ڈیٹ رہنے لگے۔

ہاشم بھائی نے فیس بک پر بہت سارے دوست بنا رکھے تھے۔ جن میں زیادہ تر ان کے افراد خانہ اور جان پہچان کے لوگ تھے۔ ایک روز وہ نیٹ کھول کر بیٹھے تھے کہ شہیدی بیگم کے نام سے ایک فرینڈ ریکوئسٹ آئی۔ ڈی پی میں خوبصورت دست حنائی دکھائی دے رہا تھا۔ ہاشم بھائی پہلے تو ذرا تذبذب کا شکار ہوئے لیکن نام کے ساتھ ساتھ پروفائل پکچر میں بھی کچھ ایسی کشش تھی کہ

وہ خود کو روک نہ سکے اور دوستی کی درخواست قبول کر لی۔ اب جو چیٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو دراز ہی ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو معاملہ ''السلام علیکم، وعلیکم السلام'' سے شروع ہوا۔ پھر بات کچھ آگے بڑھی۔ ہاشم بھائی جوانی میں نہایت خوبصورت اور وجیہہ ہوا کرتے تھے۔ ابھی بھی ان کی شخصیت کافی پُرکشش تھی۔ وہ اکثر ان کی خوبصورتی اور وجاہت کی تعریفیں کیا کرتیں۔ اور ان سے نئی نئی تصویروں کی فرمائش کرتیں۔ ہاشم بھائی بھی ان کا دل رکھنے کی کوشش کرتے لیکن جب وہ ان سے کوئی تصویر مانگتے تو یہ کہہ کر ٹال جاتیں کہ ان کے گھر میں پردے کی سخت پابندی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی تصویر انہیں بھیجی اور کسی معلوم ہو گیا تو غضب ہو جائے گا۔ ہاشم بھائی دل کو مسوس کر رہ جاتے۔

ہاشم بھائی کا ادبی ذوق کافی بلند تھا۔ ادھر شہیدی بیگم نے شعر وشاعری کا جوراگ چھیڑا تو ہاشم بھائی لہالوٹ ہو گئے۔ شہیدی بیگم زیادہ تر رات کے دس بجے کے بعد آن لائن ہوتی تھیں۔ اب ہاشم بھائی دیر رات گئے تک جاگنے لگے۔ اکثر فجر کی نماز قضا ہو جاتی۔ توبہ استغفار کرتے لیکن وہ کافر منہ سے ایسی لگی تھی کی چھڑائے نہیں چھوٹ رہی تھی۔ چھوٹنا تو دور کی بات بلکہ بات اب دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی لیکن آدمی شریف تھے۔ حد ادب ملحوظ تھا۔ وہ کرید کرید کر ان کے گھریلو حالات پوچھتیں اور یہ بھی ایمانداری کے ساتھ سب کچھ بتاتے چلے گئے۔ اپنے بارے میں، بیوی اور بچوں کے بارے میں لیکن جب یہ ان سے کچھ پوچھتے تو وہ طرح دے جاتیں اور کوئی پھڑکتا ہوا شعر سنا کر گفتگو کا رخ موڑ دیتیں۔

پھر یوں ہوا کہ ان کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی شہیدی بیگم کی فرینڈ لسٹ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ شہیدی بیگم کی شوخ وشنگ باتیں سب کو لبھانے لگیں اور وہ آناً فاناً مشہور ہو گئیں۔ اب لوگوں میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ آخر یہ محترمہ ہیں کون؟ قیاس کے گھوڑے دوڑائے جانے لگے لیکن کوئی سراغ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ شہیدی بیگم نے ہاشم بھائی کو میسج کیا کہ میں آپ کے شہر میں آئی ہوئی ہوں اور آپ سے ملنے کی مشتاق ہوں۔ ہاشم بھائی کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ انہوں نے فوراً انہیں اپنے گھر کا پورا پتا اور رابطے کا نمبر دے دیا۔ شہیدی بیگم نے انہیں فون تو نہیں کیا لیکن اپنے آنے کا وقت بتا دیا۔ ہاشم بھائی نے اپنی بیگم کو مہمان کے آنے کی اطلاع دی۔ دونوں میاں بیوی کافی مہمان نواز تھے لہٰذا شہیدی بیگم کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہاشم بھائی کی نگاہ بار بار گھڑی کی جانب اُٹھ رہی تھی لیکن وہ بھی آج سست رفتاری کے ساتھ چل رہی تھی۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ لیکن وقت مقررہ پر شہیدی بیگم نہیں پہنچیں۔ ہاشم بھائی کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ اپنی کیفیت کو بیگم سے چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا ان کے چہرے پر مایوسی چھائی جاتی تھی۔ آج انہوں نے اپنا بہترین خان سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس میں ان کی شخصیت کچھ اور نکھر گئی تھی۔ لیکن ان کی اس چھب کو دیکھنے والی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

کال بیل بجی تو وہ چونک پڑے اور لپک کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر ان کے سالے صاحب کھڑے تھے۔

''یہ کم بخت کہاں سے آ گیا؟'' انہوں نے دل ہی دل میں سوچا لیکن اخلاقاً مسکرا کر انہیں اندر آنے کو کہا۔ بیگم تو بھائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں لیکن ہاشم بھائی کو کباب میں ہڈی پسند نہیں آئی۔ پھر آپس میں باتیں ہونے لگیں۔ ہاشم بھائی اب ناامید ہو چلے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ آج ہونے دو آن لائن۔ وہ کھری کھری سناؤں گا کہ محترمہ زندگی بھر یاد رکھیں گی۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھے کہ سالے صاحب کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''شہیدی بیگم کا انتظار ہو رہا ہے کیا؟'' اور اسی کے ساتھ ان کے ہونٹوں سے ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ہاشم بھائی نے پہلے تو ان کی جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہی ان کے چہرے پر ایک معصوم سی شرمندگی اُبھر آئی۔

سالا آخر سالا ہی ہوتا ہے۔

پیوند کاری

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تمنا تھی کہ ہم زندہ رہیں روزِ قیامت تک
کئی صدیوں پہ پھیلا تھا اسی ارمان کا نقشہ

تگ و دو کر کے ہر اک بار دیتے موت کو دھوکا
بدل لیتے کبھی کمرے، کبھی دالان کا نقشہ

نہ آنکھیں اپنی ذاتی تھیں، نہ گردہ، دل، جگر اپنا
کہ سرجن نے بدل ڈالا تھا جسم و جان کا نقشہ

مگر کب بچ سکا ہے موت سے کوئی جو ہم بچتے
اجل آئی تو رکھا رہ گیا سب جان کا نقشہ

فرشتے نامہء اعمال لے کے پہنچے مشکل سے
کہ گڈمڈ ہوگیا تھا ان سے قبرستان کا نقشہ

شکائت کر کے پھر کہنے لگے یہ ہے عجب مشکل
کہ مظہرؔ تو تو ہے بکھرے ہوئے سامان کا نقشہ

بھلا دیکھو تو دھوکا دے رہا ہے ہم فرشتوں کو
لگا کے اعضاء لوگوں کے، ہے بدلا جان کا نقشہ

ہوئی ہے سرجری چہرے کی، ہر اِک نقش بدلا ہے
نہ پہلا سا وہ جبڑا ہے، نہ وہ دندان کا نقشہ

بنی تھی جو ازل میں شکل تیری وہ کہاں پر ہے
نہ ویسی ناک تیری ہے، نہ ہے وہ کان کا نقشہ

ہے قوسوں، دائروں، اور مستطیلوں میں کوئی گڑبڑ
کمر کے پیچ و خم میں ہے کسی کوہان کا نقشہ

کمالِ دستِ سرجن ہے کہ ہے یہ موت کی وحشت
کہ لگتا اجنبی سا ہے تری مُسکان کا نقشہ

تو انٹرنیشنل ہے، تیرا ایڈریس گو مقامی ہے
بڑی مشکل سے سمجھا تجھ سے بے ایمان کا نقشہ

سری لنکا سے آنکھیں لیں، کینیڈا سے جگر بدلا
ہے دل انگلش، بنا ہے جس پہ انگلستان کا نقشہ

بڑا دل گردہ ہے تیرا، ہوا جب فیل یہ گردہ
تو پیسے دے کے بدلا تو نے اپنی جان کا نقشہ

لٹائی اپنی دولت، جان تیری بس رہے باقی
نہ جانے ذھن میں تھا نقش کس سلطان کا نقشہ

مگر تو بچ کے جائے گا کہاں پیوندِ انسانی
بنائیں گے تجھے ہیروشما، جاپان کا نقشہ

سزا ایسی ملے گی سارے اعضاء کے عوض تجھ کو
کہ تجھ کو یاد آجائے گا چولستان کا نقشہ

حساب اعضاء کا تجھ سے لیں گے ہم بالکل الگ سارا
خدا بننے چلا تھا خود بخود نقشہ بدل ڈالا

وقت، بے وقت

ڈاکٹر عزیز فیصل

رات کے دو بجے
آنکھ کھلنے پہ باذوق سرتاج سے
اُکھڑے لہجے میں غصے سے کہنے لگی لکھنوی اہلیہ

نامرادا!!!!! بھلا
شعر گھڑنے کا یہ کونسا وقت ہے؟
شعر سازی کی جھنجھٹ میں پڑتے ہوئے
مصرعۂ تر کی ڈھیری کے شمشان پر
گلنے سڑنے کا یہ کونسا وقت ہے؟
ضد میں آتے ہوئے، سر کھپاتے ہوئے
چاہے غزلوں پہ غزلیں لکھو تم مگر
ضد پہ اڑنے کا یہ کونسا وقت ہے؟

😊

''اے لڑاکا بلا، سن مری بھی ذرا
چاہے لڑتی جھگڑتی رہے تُو سدا
دشمنِ شعر و فن، اے حریفِ سخن
مجھ تخیل میں ڈوبے ہوئے کو بتا
مجھ سے لڑنے کا یہ کونسا وقت ہے؟''

😊

جن خرافات کو
تو سمجھتا ہے اپنا ہنر، اپنا فن
میری اور میرے والد کی دانست میں
اک چول آدمی کا ہے دیوانہ پن

شوق سے تم بگڑتے رہو سارا دن
یوں بگڑنے کا یہ کونسا وقت ہے؟
گھپ اندھیرے میں چمگادڑوں کی طرح
کرتے جاتے ہو پروازِ حرف و نوا
دیکھو دینے لگی ہوں تجھے واسطہ
تیرے دس نونہالوں کا میں ظالما
لوڈشیڈنگ بھری اس شب تار میں
شاعری کے چراغ الہ دین کو
اَب رگڑنے کا یہ کونسا وقت ہے؟

کہ آیو رے ساون

نوید ظفر کیانی

بلالو سب کو بلالو کہ آیو رے ساون
جمالو رنگ جمالو کہ آیو رے ساون

اُٹھو کہ پھر سے ہے موسم تماشہ کرنے کا
چلو کہ نام کمالو کہ آیو رے ساون

سیاستوں کے پنپنے کا ہے یہی موسم
بنا ہے بخت اپالو کہ آیو رے ساون

تمام شہر ہے ڈوبا ہوا تو میں کیا کروں
کرو نہ تنگ سوالو کہ آیو رے ساون

بلاؤ جتنے بھی ہیں میڈیا کے جادوگر
لفافے خوب بنالو کہ آیو رے ساون

مری سپیچ کو کچھ اور بھی عوامی کرو
نئے مکالمے ڈالو کہ آیو رے ساون

وزیرِ اعلیٰ نہیں، میں ہوں خادمِ اعلیٰ
یہ کہہ کے سب کو پٹالو کہ آیو رے ساون

جو مجھ میں گھسنے کی ہمت نہ کرسکی ہیں کبھی
اُن عظمتوں کو اجالو کہ آیو رے ساون

میں جو بھی بات کروں جوششِ خطابت میں
تم اُس پہ بولو نہ چالو کہ آیو رے ساون

مجھے بھی پانی میں گھس گھس کے پوز دینے ہیں
رَبر کے بوٹ نکالو کہ آیو رے ساون

تعویز

ایک نثری نظم

کچھ دنوں سے

اک انجانا خوف تھا دل میں

دو تین بار تو سوتے میں بھی ڈر گیا

وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی

کہ آج بیگم

ایک تعویز پکڑاتے ہوئے بولیں

شاعروں کے لئے خاص ہے

گلے میں ڈال لیجئے

دسمبر آ رہا ہے

اعظم نصر

ہوشیار باش

میری پہلی نثری نظم

عرفان قادر

اے ہواؤ! جب میں تُمھیں آواز دیتا ہوں
تو گرد و غبار کا طوفان آجاتا ہے
اے سمندر! جب میں تجھے بلاتا ہوں
تو تمھارے اندر سے شارکیں اچھل اچھل کر
مُنہ کھول کھول کر باہر آنے لگتی ہیں
اے ندی نالو! جب میں تمھیں پکارتا ہوں
تو گٹر کا گندا پانی تم میں بہنے لگتا ہے
اے دسمبر! جب میں تمھیں یاد کرتا ہوں
مجھے نزلہ زکام اور کھانسی ہو جاتے ہیں
اے پرندو! جب میں تمھیں چہچہانے کو کہتا ہوں
تو کوّے کائیں کائیں کرنے لگتے ہیں
اے برسات! جب میں تم سے مخاطب ہوتا ہوں
میرے محلے کی گلیاں
کیچڑ اور دلدل سے بھرے جوہڑوں میں بدل جاتی ہیں
اور اُن میں مینڈکیں ٹرانے لگتی ہیں
کیوں؟
کیا صرف اس لئے کہ میں ایک مزاحیہ غزل گو شاعر ہوں
اور تمھارے بارے میں مزاحیہ غزلیں لکھتا ہوں
تو سُن لو
کہ میں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ
نثری نظمیں بھی کہنا شروع کر دی ہیں
کیا سمجھے؟

الیکشن منانے کے دن آرہے ہیں
سو اُلو بنانے کے دن آرہے ہیں

مداری کے پھر ڈگڈگی ہاتھ میں ہے
کہ بندر نچانے کے دن آرہے ہیں

سجا ہے نیا ماسک چہرے پہ پھر سے
کہ ملنے ملانے کے دن آرہے ہیں

گلے پھاڑ کر چیخنے سب لگیں گے
یہ جوہر دکھانے کے دن آرہے ہیں

یہاں ابنِ زردار بھی موجود ہے اب
کہ دولت لٹانے کے دن آرہے ہیں

پریشان شہباز یہ سوچتا ہے
کہ انگلی گھمانے نے دن آرہے ہیں

لگانے لگا ہے یہ عمران نعرے
یہ گیدڑ بھگانے نے دن آرہے ہیں

بڑی توند والے بھی فرما رہے ہیں
سیاست چلانے کے دن آرہے ہیں

لگے گی بڑی سیل چاروں طرف ہی
کہ لوٹے اُٹھانے کے دن آرہے ہیں

لگائیں گے جو بھی بنائیں گے دُگنا
یہ دولت اُگانے کے دن آرہے ہیں

چھڑی ہاتھ میں بوٹ والوں نے پکڑی
حکومت کے جانے کے دن آرہے ہیں

صدا دل سے یہ آرہی ہے عتیقؔ اب
برائی مٹانے کے دن آرہے ہیں

عاشق کی انشاء اللہ

شہاب ظفر

دل سے نام delete کروں گا
نہ ہی تم کو cheat کروں گا
اب تو میرے باپ کی توبہ
نہ مسٹیک repeat کروں گا
آ جاؤں نظروں میں تیری
ایسی کوئی feat کروں گا
عشق میں اپنا task یہی ہے
مجنوں کو بھی beat کروں گا
صرف تمھارے دل کی خاطر
سالوں کو بھی beat کروں گا
set جو کی ہے Dad نے تیرے
deadline وہ meet کروں گا
کانوں کان خبر نہ ہو گی
کام میں اِتنا neat کروں گا
ساس کو ساس نہیں سمجھوں گا
ماں جیسا ہی treat کروں گا
سسرالی جب آئیں اُن کو
پیش میں اپنی seat کروں گا
جب بولو پی لوں گا پانی
eat کہو تو eat کروں گا

توند

محمد ادریس قریشی

اِس میں ہے بے حد لچک، خود کو بڑھا سکتی ہے توند
مال نذرانے کا جتنا ہو، کھپا سکتی ہے توند

روسٹ چاہیں ہوں کہ ہو مرغِ مسلّم، فکر کیا
دو پراتیں کھیر کی بھی ساتھ کھا سکتی ہے توند

چھوٹی موٹی کار کو دھکا لگا سکتی ہے توند
جتنا بھی ہو رش یہ لوگوں کو ہٹا سکتی ہے توند

پانچ چھ بچوں کو نیچے بھی چھپا سکتی ہے توند
ان کو دھوپ آندھی سے، بارش سے بچا سکتی ہے توند

ایک دو بچوں کو اوپر بھی بٹھا سکتی ہے توند
گر کے اوپر سب کا فالودہ بنا سکتی ہے توند

جب گلے ملتی ہے مجھ جیسے کسی باریک سے
ہڈیوں اور پسلیوں کو کڑکڑا سکتی ہے توند

گر ہو بیگم باکسر سمجھے گی اس کو پنچ بیگ
پنچ کھانے کے لئے بھی کام آ سکتی ہے توند

کھا رہے ہیں سحری و افطار میں جو بے حساب
روزہ داری بھی نہیں اُن کی گھٹا سکتی ہے توند

آج اہلِ توند کی سروس کو خطرہ ہے بہت
ہو نہ پائی کم تو اپنے گھر بھی جا سکتی ہے توند

کیل کانٹے سے مگر اس کو بچانا ہے ذرا
ہو گئی پنکچر، زمیں ساری ہلا سکتی ہے توند

کل اِک بزرگوار سے کچھ گفتگو ہوئی
کیا گفتگو ہوئی یہ ذرا سن لیں آپ بھی
میں نے کہا کہ گرمی ہے بجلی کا کیا کریں
کہنے لگے کہ ہاتھ سے پنکھا جھلا کریں
میں نے کہا کہ ریل میں ہے بھیڑ کس قدر
بولے کہ کیوں بھٹکتے ہو ہر روز اِدھر اُدھر
میں نے کہا کہ کام ہے نا کوئی کاروبار
کہنے لگے کہ شعر کہو روز بے شمار
میں نے کہا کہ شاعری مجھ کو سکھایئے
بولے مشاعروں میں مرے شعر گایئے
میں بولا پیٹرول کی قیمت پہ کچھ کہیں
کہنے لگے کہ مہنگا ہے پیدل چلا کرو

میں نے کہا کہ دھوپ میں گرمی میں کیا کریں
بولے کہ گھر میں بیوی کی صورت تکا کریں
میں نے کہا کہ دیکھیے مہنگائی ہے بہت
بولے تمہاری آمد بالائی ہے بہت
میں نے کہا کہ سیب بھی مہنگا ہے کس قدر
بولے کہ تم چنے ہی چباؤ کٹر کٹر
انگور کا جو نام لیا بولے چونک کر
دختر پسند کرتے ہو تم اس کی یا پسر
میں نے کہا کہ آم کے بارے میں کچھ خیال
کہنے لگے پھلوں کا ہے راجہ یہ بے مثال
میں نے یہ پوچھا آم میں کیا خاص بات ہے
بولے جو آم کھاتا ہے اس کی نجات ہے

پوچھا قرآں میں ذکر ہے اس پھل کے نام کا
کہنے لگے کہ تیسواں پارہ ہے آم کا

حسرتِ قربانی

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

میں نے بھی اس عید پہ قربانی کرنے کی ٹھانی
سوچا بکرا عید پہ دے دوں بکرے کی قربانی

جیب میں ڈال کے سات ہزار میں پہنچا بکرا منڈی
ہر بیوپاری ہر گاہک سے مار رہا تھا ڈنڈی

جس بکرے کا ریٹ بھی پوچھا، سُن کر جی گھبرایا
تیس ہزار کا بکرا سُن کر مجھ کو چکر آیا

میں نے کہا کہ میرے پاس ہیں بس اِتنے ہی پیسے
وہ بولا تم بکرا منڈی میں آئے ہو کیسے

آپ کے حق میں بہتر ہے باہر کا رستہ پکڑیں
بکرے نے یہ ریٹ سُنا تو مارے گا وہ ٹکریں

سات ہزار میں مل سکتا ہے بکرے کا اک ساشے
ویٹ ہو جس کا سات کلو، چھ تولے اور دو ماشے

یا پھر مل سکتا ہے تم کو چھوٹا ٹیڈی بکرا
اِن پیسوں میں آسکتا ہے ممی ڈیڈی بکرا

میں نے پوچھا اِس بکرے کی قربانی کا جائز
بولا ''پاہ جی، دوندا ہے یہ اس رُتبے پر فائض''

دے کر سات ہزار کی قیمت بکرا لے کر آیا
گھر میں لا کر سب سے پہلے بیگم کو دکھلایا

بکرا دیکھ کے بیگم نے غصے میں مجھ کو دیکھا
غصے میں تو لگتی ہے وہ مجھ کو بالکل ''ریکھا''

بولا ایسا اعلیٰ بکرا لائے ہو کس جد کا
قربانی کرنی ہے تم نے یا دینا ہے صدقہ

جاؤ جا کر ایسا بکرا واپس کر کے آؤ
اِس بکرے سے بہتر ہے گائے میں حصہ پاؤ

کھا کر بیگم کی جھڑکیں میں واپس منڈی آیا
چار ہزار میں سات کے بدلے بکرے کو لوٹایا

گائے کا حصہ بھی تھا میری اوقات سے باہر
کر نہ پایا قربانی اِس بار بھی مفلس شاعر

تیس ہزار کا بکرا ہو اور دو دو لاکھ کی گائے
ایسے میں مجھ جیسا کیسے بکرا عید منائے

محمد عارف

جس لڑکی کو چھیڑا تھا
والد اس کا نکلا نائی
اپنی اپنی قسمت بھائی

مجھ کو چھوڑ کے اس مہ رخ نے
بکرے کے سنگ عید منائی
اپنی اپنی قسمت بھائی

چھڑے مُڑے تھے خاموشی تھی
اب ہے ہنگامہ آرائی
اپنی اپنی قسمت بھائی

بھاشا ڈیم بھی کاغذ پر ہے
اس کو کہتے ہیں دانائی
اپنی اپنی قسمت بھائی

پنکھا ساکت بلب بجھا ہے
لیکن آن ہے وائی فائی
اپنی اپنی قسمت بھائی

علامہ محمود حسن قیصر

نشتر امروہوی کی محاکاتی شاعری

اُردو شاعری کی مختلف اصناف ،غزل ،قصیدہ ،مثنوی ،رباعی وغیرہ میں طنزو مزاح بھی ایک قابل ذکر صنف ہے۔ اس صنف کو دیگر اصناف کے علاوہ یہ خصوصیت حاصل ہے کہ متعدد شکلوں میں اس کو سمویہ جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر غزل ہے جو عشقیہ اشعار پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ قصیدہ بنیادی طور پر کسی کی تعریف میں ہوتا ہے لیکن اس میں بھی طنزو مزاح کے عناصر کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس صنف کو اتنی وسعت اور اتنا وسیع میدان دینے کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری کے کئی سو سالہ دور میں اس کا سرمایہ سخن برائے نام ہی ملتا ہے۔

غور کرنے پر اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُردو کے بڑے اور نامور شعراء نے اس صنف کو اپنانے میں عار محسوس کیا اور اس کو خالص عوام کے لئے مخصوص سمجھا۔ مثال کے طور پر علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، مجازؔ، فیض احمد فیضؔ، آلِ احمد سرورؔ اس سے اوپر جایئے تو مرزا غالبؔ، آتشؔ لکھنوی، عیشیؔ لکھنوی، ذوقؔ وغیرہ ان میں سے کسی نے بھی طنز و مزاح کے موضوع پر ہاتھ نہیں رکھا اور اپنے پاکیزہ ذوق اور رجحانِ طبع کے تقاضے پر شعر کہے۔ اِن شعراء کے یہاں طنزومزاح کی کچھ مثالیں اگر ملیں گی بھی تو ان کی کوئی خاص ضرورت رہی ہوگی۔ البتہ اُردو کے آخری دور میں جو دورِ انحطاط کہلاتا ہے، جس نے داغؔ، امیرؔ مینائی ،تسلیمؔ وغیرہ کو جنم دیا۔ اِسی کے متوازی کچھ مزاح نگار شعراء بھی پیدا ہوئے مگر ان میں سے کسی میں نہ کوئی علمی صلاحیت تھی، نہ آسودگیٔ ذہن، نہ الفاظ کہ جن کے سہارے وہ کوئی مضمون تخلیق کر سکتے۔ مثال کے طور پر:

جب کہا میں نے کہ میرے گھر چلو
تب مری گوئیاں نے اے رنگیں پکار
گال پر انگلی کو رکھ کر یوں کہا
میں تیرے گھر جاؤں گی اے دور پار
(رنگینؔ)

رخِ روشن کی جھرّی حسن کا گویا ٹھٹھر جانا
قیامت ہے کسی معشوق کا سن سے اتر جانا
(ظریفؔ لکھنوی)

میری آہوں کی توپوں کا وہ خالی خولی سرہونا
وہ ان کا لاٹ صاحب کی طرح غیروں کے گھر جانا
(ظریفؔ لکھنوی)

ایسے اشعار آپس میں بیٹھ کر تفریح کے لئے تو پڑھے جاسکتے ہیں لیکن ادب میں ان کو کوئی مقام نہیں دیا جاسکتا، البتہ جدید دور میں نئی نسل نے اس صنف کو بلندی دی اور اس کو ادبِ اُردو میں ایک قابلِ ذکر مقام دیا۔ یقیناً ان کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے۔ اس سلسلے میں شہبازؔ امروہوی، ہلالؔ رامپوری، دلاور فگارؔ بدایونی، ناضرؔ خیامی، ہلالؔ سیہاروی، ناظمؔ انصاری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد شروع ہوتا ہے جدید ترین دور جس میں پہلا نام ساغرؔ خیامی اس کے بعد عادلؔ لکھنوی، اس کے بعد سید ین شجاع نشترؔ امروہوی۔ مجھے یہ افسوس ہے کہ وہ اپنی عمر کے پینتیس سال گزارنے کے بعد پہچان میں آئے ورنہ آج ان کا مقام بہت بلند ہوتا۔ اُن کی شاعری کو میں نے ہر دور میں سراہا ہے۔ ان کے یہاں وہ پسپائی نہیں پائی جاتی جو عموماً طنز نگاروں میں پائی جاتی ہے نشترؔ کی نظموں میں حسب ذیل نظمیں خاص معیار رکھتی ہیں اور اُن کی صالح فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''دعوتِ ولیمہ'' کے دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

کچھ عورتوں کے ساتھ میں بچے تھے چلبلے
کس باپ کے سپوت تھے کس گود کے پلے
نو دس برس کے سن میں یہ ہمت یہ ولولے
کس کی مجال ان سے کوئی ڈونگہ چھین لے
مرغے کی ٹانگ پھینک دی آدھی چچوڑ کر
بریانی پیلنے لگے روٹی کو چھوڑ کر
آئے کبابِ سیخ تو ہتھیا گیا کوئی
ملے ''پڑا'' نہ کچھ بھی تو جھلا گیا کوئی
چٹنی سمجھ کے سونٹھ وہاں کھا گیا کوئی
اور رائتہ میں کھیر کو اوندھا گیا کوئی
کوئی تو لے رہا تھا مزا رس ملائی کا
تھپڑ کسی نے کھالیا دستِ حنائی کا

دور ایوب شاہی میں قتیلؔ شفائی، فارغ بخاری اور رضاؔ ہمدانی ماہنامہ ''سنگ میل'' نکالا کرتے تھے۔ ایک مضمون کی اشاعت پر پاکستان سرکار بوکھلا اٹھی تو وارنٹ گرفتاری جاری ہوگئے۔
پولس نے تینوں کو گرفتار کرنے کے بعد حکام پاکستان کو رپورٹ بھیجی کہ تینوں ایڈیٹر گرفتار کرلئے گئے ہیں لیکن ہنوز ادارہ تحریر مفقود الخبر ہے۔ اس کی تلاش جاری ہے۔

اس نظم میں نشترؔ نے محاکات کا حق ادا کردیا ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اور اس میں ابتری ہم اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کی نظموں کے بعض بند سن کر یہ محسوس کیا کہ جیسے میر انیسؔ کی زبان سے نشترؔ بول رہے ہیں۔
اور ایک نظم جس کا عنوان ہے ''بیویاں'' اس نظم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عورت اپنے شوہر پر حاوی ہونے کے لئے کیا کیا طریقے اپناتی ہے۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ کریں۔

کھا کھا کے گوشت ویٹ نہ اپنا بڑھایئے
جو میں بنا رہی ہوں وہ چپ چاپ کھایئے
اس وقت گھر میں آیئے اس وقت جایئے
جانا کہاں ہے جانے سے پہلے بتایئے
اس طرح کنٹرول میں لاتی ہیں بیویاں
حاکم کو بھی غلام بناتی ہیں بیویاں
وہ سنتری ہو کوئی یا کوئی ہو منتری
ہوتی ہے سب کو بیوی سے احساسِ کمتری
کیسا بھی شیر دل ہو بہادر ہو وہ جری
رہتی ہو جس کے خوف سے دنیا ڈری ڈری
ایسے بہادروں کو ڈراتی ہیں بیویاں
پھر اُنگلیوں پہ اُن کو نچاتی ہیں بیویاں

ہر دور میں رنڈوے بیچارے مذاق کا موضوع رہے ہیں۔ اسی

نظریے کو سامنے رکھ کر نشتر امروہوی نے ایک رنڈوؤں کی کانفرنس کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، جس میں رنڈوے اپنی پریشانیاں بیان کرتے ہیں۔اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

صدرِ جلسہ جو کہ تھا اک سینئر رنڈوا وہاں
سب سے پہلے وہ اٹھا اور یوں ہوا شعلہ بیاں
قدر اُن کی ہے فقط زندہ ہیں جن کی بیویاں
اور رنڈووں کی کوئی عزت نہیں ہوتی میاں
فالتو سامان کی مانند ہیں گھر بار میں
جس طرح بوڑھی طوائف حسن کے بازار میں

ایک رنڈوا تھا وہاں جو قوم کا لیڈر بھی تھا
اس نے مائک تھام کر لمبا سا اک بھاشن دیا
جوڑ کر ہاتھوں کو آخر میں پھر اس نے یوں کہا
سب اسی طرح رہو مانو مرا تم مشورا
لاکھ بہتر ہیں کنوارے آج تک ہیں جو قطعیٔ
جس طرح مایا وتی، عبدالکلام اور باجپئی

آپ کی زبان آسان اور عام فہم ہے نگاہ گہری اور سماج کی تلخ حقیقتوں کو مزاح کا رنگ دینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے حالیؔ، اقبالؔ اور چکبستؔ کی طرح مسدس سے کام لے کر علامہ اقبالؔ کے شکوہ کی طرح خود ایک شکوہ تخلیق کیا جس میں بیوی کو مخاطب کیا گیا ہے۔نظم کے انداز کو دیکھ کر علامہ اقبالؔ کا شکوہ دماغ میں گھوم جاتا ہے۔نشتر امروہوی نے اس نظم میں طنز و مزاح کی ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں کہ جو بے ساختہ قہقہہ لگانے اور مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں۔

تیری خاطر جو کسی بات پہ اڑ جاتے ہیں
پیر گھر والوں کے گھر سے ہی اکھڑ جاتے ہیں
تجھ سے برہم ہوا کوئی تو بگڑ جاتے ہیں
بھائی کیا چیز ہے ہم باپ سے لڑ جاتے ہیں
دبدبہ تیرا ہر اک دل پہ بٹھا یا ہم نے
تو نے جو کہہ دیا وہ کر کے دکھایا ہم نے
رشتہ شادی کا لئے ہم سحر و شام پھرے
جیسے مایوس کوئی بندۂ آلام پھرے
کوئی ہاتھوں میں لئے جیسے تہی جام پھرے
ہم بجز تیرے ہر اک جگہ سے ناکام پھرے
صاحبِ زر نہیں بے زر بھی نہ چھوڑے ہم نے
عقل کے سیکڑوں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

ایک اور نظم ''آپ سے ملئے'' کا بند دیکھئے:

جلسازی میں یہ نٹور سے بھی کچھ ایکس ہیں
چار سو بیسوں سے بڑھ کر آٹھ سو چالیس ہیں
کون کہتا ہے کہ یہ شیطان کی تجنیس ہیں
یہ بذاتِ خود جنابِ حضرت ابلیس ہیں
عہدِ طفلی سے ہی مکاری کا اک پیکر ہیں آپ
آپ سے ملئے ہمارے ملک کے لیڈر ہیں آپ

اِس کے علاوہ حسبِ ذیل نظمیں بھی آپ کی تخلیق کا شاہ کار ہیں۔

ابھی پے نہیں ملی، چاپلوسی، آپ سے ملئے، خواب میں مشاعرہ، سیاست، بلیو لائن بس، کثرتِ اولاد، غالب کا پوسٹ مارٹم، شاعری اور بیگم، تعارف، مولوی صاحب، ابا کی موت، الیکشن، بے چارہ شاعر، چالان، میرا بھارت مہان، کالی سہاگ رات، ضرورتِ رشتہ، بوتل نامہ، تیرے بغیر وغیرہ۔

نظموں کے علاوہ نشتر کے یہاں سماجی اور سیاسی قطعات کی بھر مار ہے۔الگ الگ موضوعات پر تضمین آپ کے کلام کی جان ہے۔ایک تضمین ملاحظہ کریں۔

اک مردہ کہہ رہا تھا یہ اپنے مزار میں
رونق نہیں ہی ہے کوئی بھی قرب و جوار میں
ہو جائے دفن کوئی حسینہ ہی آس پاس
''لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں''

ایسی ہی طویل نظموں میں نشتر نے مزاح کے وہ فوارے چھوڑے ہیں کہ پڑھنے والا قہقہے لگانے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔مجھے ان کی شاعری اور تخلیقات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے شغل کو جاری رکھیں۔

سید بدر سعید

وسیم عباس

شاعر یا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ جو نہیں ہوتا اسے زیادہ داد ملتی ہے کیونکہ اس کا کلام سننے والوں کو بھی بھلا کہاں اوزان کا علم ہوتا ہے۔ وسیم عباس کے بارے میں ہمیں آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ شاعر ہے یا نہیں۔ شعر کہنے کا فارمولا اس نے بھی وہی اپنا رکھا ہے جو ہم نے اپنایا ہے البتہ اس کا گلا ہم سے زیادہ صاف ہے لہذا اکثر اٹکے بنا آگے نکل جاتا ہے۔ شاعری بہتر بنانے کے لئے باقاعدگی سے مشق کرتا ہے۔ اسی لئے روز صبح اٹھ کر دو گھنٹے مٹکے میں منہ ڈال کر شعر کا ردھم ٹھیک کرتا ہے۔ ایک مشاعرے میں وسیم عباس ٹھسے سے بیٹھا شعر کہہ رہا تھا۔ ساتھ بیٹھے عروضی نے فوراً ہی ٹوک دیا ''ارے بھیا! آپ کے مصرعہ کا ''ز'' گر گیا ہے۔'' واہ واہ کے شور میں وسیم عباس نے مڑ کر اسے دیکھا اور کہنے لگا ''صاحب خود اٹھا کر جوڑ لیں، میں اگلا مصرعہ سنانے میں مصروف ہوں۔'' بس تب سے یہ بندہ کچھ نہ کچھ گرا رہا ہے اور وہ عروضی صاحب اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ اپنی شاعری سے دنیا کو آگ لگانے کا عزم رکھتا ہے۔ اسی لئے شاعروں کو اپنی غزل سنا کر بھاگ جاتا ہے۔

ہمارے یہاں شاعروں کی شہرت مشاعروں سے زیادہ فیس بک پر نظر آتی ہے۔ اس مقابلہ میں خواتین شاعرات کافی آگے ہیں۔ شاعر بیچارہ اپنی غزل یا نظم لکھ کر اپ لوڈ کرتا ہے تو کوئی اسے گھاس تک نہیں ڈالتا۔ دوسری جانب شاعرہ کا کلام اکثر کوئی نہ کوئی خدائی مددگار ٹائپ بھائی باقاعدہ ڈیزائن بنا کر اپ لوڈ کرتا نظر آتا ہے۔ جس کے ساتھ لکھا ہوتا ہے کہ اپنی فلاں پیاری سی بہنا کے لئے۔ خدا جانے ایسی بہنیں شاعروں کو کیوں نہیں ملتیں۔ اس لحاظ وسیم عباس ٹو ان ون ہے یعنی یہ اپنی ہی بہن یا بھائی بھی ہے۔ یہ پیشہ ور ڈیزائنر ہے لہذا اپنی شاعری خود ہی ڈیزائن کر کے اپ لوڈ کرتا ہے۔ قاصد کے مطابق کئی نامور شاعرات کی ''شہرت'' کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ شہر میں لوگوں کے معاشقے چلتے ہیں جبکہ اس کے ڈیزائن چلتے ہیں۔ میرے کالم کا لوگو بھی اسی نے ڈیزائن کیا تھا۔ پہلی بار اس لوگو کے ساتھ کالم چھپا تو مٹھائی کا ڈبہ لے کر گھر آ گیا، کہنے لگا: کالم چھپنے کی مبارک باد قبول کریں لیکن خدارا کسی کو یہ نہ بتانا کہ لوگو میں نے بنا کر دیا تھا۔

وسیم عباس میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اِس کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے مجموعہ کلام میں میری رائے بھی شامل تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے اس مجموعۂ کلام کو چھپاتا پھرتا ہے۔ کہتا ہے ایک وقت میں یا میرا جھوٹ پڑھا جا سکتا ہے یا تمہارا۔ شاعرات کا خاص خیال رکھتا ہے۔ ایک دن ایک میک اپ زدہ شاعرہ کو کہنے لگا ''محترمہ نقاب ہمارے کلچر اور مذہب کا حصہ ہے لیکن نقاب کی جتنی پابندی آپ کرتی ہیں اسے زیادتی

میں لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی''

ہم نے یہ سن کر خوشی کا اظہار کیا ''اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ عوام کو کچھ تو سہولت ہوگی۔''

لیکن انہوں نے ہماری بات سے اتفاق نہ کیا کہنے لگے ''لگتا ہے آج کل سیاست سے کچھ دور دور رہو''

اب کے ہم نے ان کی بات سے اتفاق نہ کیا کیونکہ ہمارے خیال میں آج کل ہی تو ہم (گھریلو) سیاست میں ''اِن'' ہیں، بھلا کونسا فساد ہے جس میں ہمارا ہاتھ نہیں؟ لیکن وہ مصر رہے کہ ہم سیاست کی الف بے بھی نہیں جانتے آخر ہمیں ان کی مانتے ہی بنی کہنے لگے ''کیا تم ہمارے حکمرانوں کی عادتوں سے واقف نہیں ہو؟ واللہ! دنیا کے سب سے ذہین حکمران ہمارے پاس ہیں۔ ذرا غور کرو پہلے سولہ سے بیس گھنٹے لوڈ شیڈنگ ہوتی تھی اب اعلان کیا گیا کہ سحر اور افطار کے اوقات میں لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی''

''بالکل یہی تو فائدے کی بات ہے'' ہم فوراً چلائے۔

شاہ صاحب نے غصے سے ہماری جانب دیکھا اور کہنے لگے

''پہلے مجھے اپنی بات پوری کر لینے دو''

ہم نے بھی کہہ دیا کہ چلیں آپ اپنی بات پوری کر لیں ہم کونسا کسی مشاعرے میں بیٹھے ہیں جو اپنی اپنی سنانے کے چکر میں پڑیں۔

شاہ صاحب پھر سے کہنے لگے ''حکومت نے وعدہ کیا کہ سحر اور افطار کے اوقات میں لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی لیکن یہ وعدہ تو نہیں کیا کہ دن کے باقی اوقات بھی بجلی کی سپلائی جاری رہے گی۔ اب سحر اور افطار کا وقت تو بمشکل دو گھنٹے میں ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کے وقت لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی لیکن باقی بائیس گھنٹے کی کوئی گارنٹی نہیں اس طرح تو حکومت سولہ سے بڑھا کر بائیس گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ بھی کر سکتی ہے اور اب تو ذمہ داروں کے یہ بیانات بھی آن دی ریکارڈ آ چکے ہیں کہ سیلاب کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ کو نہیں روکا جا سکتا، مطلب دو گھنٹے کی بھی ضمانت نہیں رہی۔۔۔''

شاہ صاحب تو چلے گئے لیکن ہم واقعی پریشان ہو گئے کہ روزہ تو دن کے وقت ہوتا ہے اور اس وقت اگر بجلی کی سپلائی معطل رہی تو روزہ داروں کا کیا حال ہوگا؟؟؟ گرمی بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔ پسینہ بھی خوب بہے گا اور پیاس بھی خوب لگے گی۔ لیکن جب لائٹ ہی نہ ہو تو عین ممکن ہے پانی بھی نہ ملے اور نہ ہی افطاری کا سامان تیار ہو سکے، حبس بھی اپنے عروج پر ہے لوگ نماز تراویح کیسے ادا کریں گے؟ اور امام بھی آخر کتنی بلند آواز سے بول سکتا ہے وہ بھی انسان ہے مرغا تو نہیں ۔۔۔اور لائٹ نہ ہونے کا مطلب لاؤڈ سپیکر بھی جام!

ہمارے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم ایک انجمن قائم کریں جس کے تحت ملک بھر میں سیمینار کروائے جائیں اور ایک بل منظور کروانے کی کوشش کی جائے جس کی رو سے حکومت وقت یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جائے کہ آئندہ سحر اور افطار کے اوقات میں لوڈ شیڈنگ ہوگی لیکن دوران روزہ بجلی کی سپلائی جاری رہے گی تا کہ روزہ دار کسی بھی قسم کی مشکلات کا شکار نہ ہوں۔

امید ہے آپ اس مشن میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ ویسے تو ہمیں یہ بھی امید ہے کہ جب تک یہ بل منظور ہوگا تب تک رمضان ختم ہو چکا ہوگا۔ بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بکرا عید (جس پر اس مرتبہ مہنگائی کی وجہ سے مرغا ذبح کرنے کے زیادہ چانس نظر آ رہے ہیں) بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہوگی۔ بہر حال پھر بھی آپ امید کا دامن تھامے رکھیں کیونکہ امید پر دنیا قائم ہے۔ جبکہ امید کا تا حال معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس پر قائم ہے، قائم بھی ہے یا اب تک دم توڑ چکی ہے۔۔۔۔؟؟؟ اللہ ہماری مردہ امیدوں کو جنت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

مشہور شاعر اختر شیرانی لاہور کے انارکلی بازار میں جوتوں کی مشہور دکان پر جوتے خریدنے گئے۔ دکان دار نے ان کے سامنے جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اختر شیرانی نے ایک ایک جوڑا دیکھا، مگر کوئی پسند نہیں آیا۔ قیمتوں پر بھی انہیں اعتراض تھا۔ دکان دار طنزیہ لہجے میں بولا ''اِتنے جوتے پڑے ہیں، آپ اب بھی مطمئن نہیں ہوئے؟''

اختر شیرانی ایک جوتا پہنتے ہوئے بولے ''بارہ روپے لیتے ہو یا اُتاروں جوتا؟''

چندا اور چندہ

اِس دراصل یہ ایک وضاحتی کالم ہے اور حفظ ماتقدم کے تحت تحریر کیا گیا ہے! قصہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے کچھ قارئین کو غلط فہمی لاحق ہوگئی ہے کہ ہم مغرب پسند ہیں اور مولویوں سے خار کھاتے ہیں اور مولوی بے زار ہیں! اس لئے ہم پہ لازم ہوگیا تھا کہ ہم اس غلط فہمی کا ازالہ کریں جس طرح مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ ''گدھے ہمارے بھائی ہیں''۔۔۔ الو ہمارے بھائی ہیں۔۔۔ تو میں کہتی ہوں کہ مولوی میرے بھائی ہیں۔۔۔ یقین نہیں آیا؟! سچ مچ میری فیملی تو مولوی شدہ ہوچکی ہے! مولوی سچ مچ میں میرے بھائی ہیں اور جو بھائی بغیر داڑھی کے ہیں اُن کے پیٹ میں بھی داڑھی ضرور موجود ہے! یہ اور بات ہے کہ ایک ادبی گروپ میں جب ہم نے یہ اعتراف جرم کیا کہ میں تو مولویوں کے حصار میں رہتی ہوں تو ایک محترم دوست نے پوچھا ''سیمیں بھلا کیسے؟'' تو میں نے ترنت جواب دیا ''زبان رہتی ہے جیسے بتیس دانتوں کے درمیان۔''

اِس سے پہلے کہ میں مزید آگے بڑھوں، لازم ہے کہ کچھ تعارف میں ان بتیس دنتوں کا بھی کروا ہی دوں، میرا خاندان بھان متی کا کنبہ ہے۔۔۔۔۔ بس اس سے اگلا جملہ آپ خود مکمل کر لیجیے، والدین کی وفات کے بعد جو اینٹ روڑا جہاں مناسب لگا ہم نے فٹ کر دیا! سو ہم پٹھان بھی ہیں!

اعوان بھی ہیں!

ہم شیخ بھی ہیں!

ہم راجپوت بھی ہیں!

ہم باجوے بھی ہیں اور گوندل بھی

اور اس تمام تر تنوع کے حسن کے ساتھ ہم مولوی بھی ہیں!

کیونکہ مولوی میرے بھائی ہیں!

اور یہ زبان گو لاکھ سنبھل کر رہتی ہے کبھی کبھی دانتوں تلے آ ہی جاتی ہے!

اب اگلا قصہ وضاحت وسراحت کے ساتھ آپ پر ثابت کر دے گا کہ مولوی بالآخر میرے بھائی ہیں!

ہوا کچھ یوں کہ اپنے بہن بھائیوں کے گروپ میں ہم نے ازراہ مذاق وشرارت ایک لطیفہ پوسٹ کر دیا!

لطیفہ کچھ یوں تھا کہ مولوی صاحب کی ایک ''چندا'' تھی، دل

> **ایک ادبی گروپ میں جب ہم نے یہ اعتراف جرم کیا کہ میں تو مولویوں کے حصار میں رہتی ہوں تو ایک محترم دوست نے پوچھا ''سیمیں بھلا کیسے؟'' تو میں نے ترنت جواب دیا ''زبان رہتی ہے جیسے بتیس دانتوں کے درمیان۔''**

کی ملکہ مان چکے تھے دل ہی دل میں اُسے، مگر کہنے کی جرات منصب نہیں دیتا تھا۔ ایک روز ہمت جتا کر اس کے دروازے پہ پہنچ کر دستک دی اور لب و لہجے میں تمام تر شیرینی سمو کر بولے ''چندا'' چندا نے ان کو دیکھا، سر پہ دوپٹہ اوڑھ واپس مڑ گئی۔ مولوی صاحب سمجھے کہ چندا شرما گئی، ابھی تذبذب میں کھڑے تھے کہ چندا لوٹی اور ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما کر بولی، مولوی صاحب ''چندہ۔''

بس یہ لطیفہ بھیجنا تھا کہ ہمارے گروپ میں زلزلہ آ گیا۔ بڑے مولانا جلال میں آگئے، خوب گرجے برسے، ہمیں احادیث وآیات کے عرقِ مقدس سے شرمندگی کے بحر میں غوطہ زن کرنا چاہا! اسی پہ بس نہیں کیا بلکہ فتوی جاری کر دیا کہ ہم سب لکھاری پاگل ہوتے ہیں! بھلا مولانا اس فتوے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم تو سب خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہم سب کچھ ''کھسکے'' ہوتے ہیں! وہ ابنارمیلٹی جسے حسن ظن ''سپر نارمیلٹی'' کہتا ہے! ہم قبیلہ عاشقاں کے فرد مولانا صاحب واقعی عرف عام میں تھوڑے سے پاگل ہی کہلاتے ہیں! لیکن قارئین آپ ذرا ملاحظہ کیجئے، آخر ایسا کیا قصور ہم سے سرزد ہوا تھا بھلا۔ فقط چندا اور چندا کے خوبصورت مغالطے "چندہ" ہی کی تو بات تھی! آپ مولوی بھائی صاحب آپ ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ لاکھ دستار ہو، فضیلت کا جبہ بھی ہو، مولوی بھی تو آخر انسان ہی ہوتا ہے! ابن آدم؟ ابن آدم ہو اور اس کی

مولانا جلال میں آگئے، خوب گرجے برسے، ہمیں احادیث وآیات کے عرقِ مقدس سے شرمندگی کے بحر میں غوطہ زن کرنا چاہا! اسی پہ بس نہیں کیا بلکہ فتوی جاری کر دیا کہ ہم سب لکھاری پاگل ہوتے ہیں! بھلا مولانا اس فتوے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم تو سب خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہم سب کچھ ''کھسکے'' ہوتے ہیں! وہ ابنارمیلٹی جسے حسن ظن ''سپر نارمیلٹی'' کہتا ہے! ہم قبیلہ عاشقاں کے فرد مولانا صاحب واقعی عرف عام میں تھوڑے سے پاگل ہی کہلاتے ہیں!

کوئی چندا نہ ہو؟! آخر سب کی ایک چندا تو ہوتی ہی ہے ناں! اور جو اگر چندا آپ کی دستار اور ریشِ مبارک کے جلال وجلوے کے رعب میں آ کر آپ کا دھڑ دھڑ کرتا دل نہ دیکھ پائے اور چندہ تھا دے ہاتھ میں تو بتائیے ذرا، رونے کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آئے گی یا نہیں؟

اب جو مجھے ہنسی آ گئی تو کیا خطا ہو گئی جو آپ اس قدر خفا ہو گئے! بھلا اتنا جلال میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟! اب تو آپ کو یقین آیا کہ میں مولویوں کے بارے میں گر کچھ کہتی ہوں تو دراصل وہ گھر کی ہی بات ہوتی ہے! اور کوئی اپنے گھر کی ریتی رواج سے لاکھ باغی ہو پھر بھی گھر تو آخر اپنا ہے! سو آپ کو مجھ سے یہ بدگمانی

اگر چندا آپ کی دستار اور ریشِ مبارک کے جلال وجلوے کے رعب میں آ کر آپ کا دھڑ دھڑ کرتا دل نہ دیکھ پائے اور چندہ تھا دے ہاتھ میں تو بتائیے ذرا، رونے کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آئے گی یا نہیں؟

دور کر لینی چاہیئے کہ میں خدانخواستہ مولویوں سے کوئی عناد رکھتی ہوں! کیونکہ مولوی تو آخر میرے بھائی ہیں! ویسے تو بھائیوں کی بھی بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں، اک برادران یوسف بھی ہوا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ خیر بھائیوں کی مزید اقسام پہ کسی اگلے کالم میں بات ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ یہ زبان کم بخت پھر پٹڑی سے پھسل جائے اور کسی دانت تلے آ کر کچلی جائے!

مولانا بھائی صاحب آپ جب یہ کالم پڑھیں گے تو حاجی ہو چکے ہوں گے خیر سے! یعنی مولانا بھی اور حاجی بھی یک نہ شد دو شد! اپنی حاجیانہ مبارک نظر سے غور فرمایئے گا بھلا کیا غلط کہا تھا میں نے؟ اگر یہ سب پڑھتے ہوئے آپ مسکرا دیں، مسکراتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑیں تو میں سمجھ جاؤں گی کہ آپ یونہی مولویانہ جلال میں مبتلا ہو گئے تھے اور عید اور حج کے مبارک موقع کی برکت میں دل پہ ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ ہر دل میں ایک چندا بسی تو ہوتی ہے تو پھر بھلا آپ کو غصہ کس بات پہ آ گیا تھا؟ آخر میں نے ''چندا'' کا ہی ذکر کیا تھا، کوئی چندہ تھوڑی آپ سے مانگا تھا! اسی گروپ میں چھوٹے مولوی بھائی بھی تو تھے، مگر غصہ صرف بڑے مولانا کو آیا، شاید۔۔۔ مگر چلیے چھوڑیئے شاید کو، عیدِ سعید قریب ہے، غصے وجاہ جلال کو قربان کر کے خوشیاں بانٹتے ہیں اور بہن بھائیوں میں یہ نوک جھونک تو چلتی رہتی ہے کہ آخر مولوی تو میرے بھائی ہیں!

شام کے بعد

مزاح مت

کے ایم خالد
kmkhalidphd@yahoo.com

اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جھنگ کی سوغات ہے۔ اُسے شاعری، اداکاری، گلوکاری اور اپنے ساتھی طالب علموں کو پھینٹنے کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ جھنگ کے بیلوں میں جب اس کی کوک گونجتی تو نہ جانے کہاں سے بہت سے پہاڑی کوے کیوں اِکٹھے ہو جاتے تھے۔ اِتنے سارے کوے دیکھ کر وہ گھبرا جاتا اور اپنا اسکول کا تھیلا اٹھا کر بھاگ نکلتا۔ چونکہ گاتے ہوئے وہ آنکھیں بند رکھتا تھا، اِس لئے اکثر دوست اُسے اسکول میں گانا شروع کروا کر خود رفوچکر ہو جاتے تھے اور وہ گاتا رہتا اور جب کوئی استاد اُسے چپ کروا کر اس کے اکیلے گانے کی وجہ پوچھتا تو وہ سادگی سے جواب دیتا ''ریاض کر رہا تھا'' تو استاد صاحب بھی سادگی سے فرماتے ''تم نہ بھی کرو تو کوئی فرق تو نہیں پڑنے والا۔''

اُس نے اپنی شاعری کی ابتدا اسکول سے پہاڑے پڑھتے ہوئی کی اور وہیں سے ردیف، قافیہ سیدھا کیا۔ ماڑے اسکولوں میں چونکہ لڑائیاں لڑنے کے لئے کوئی وجہ درکار نہیں ہوتی اس لئے ساتھیوں سے لڑنا معمول کا کام تھا، لیکن وہ اَندھا دُھند لڑنے کی بجائے سٹائل سے لڑنے کی کوشش کرتا کیوں کہ اس نے کچی ٹاکی میں ایک دو ٹوٹے بروس لی کے دیکھ رکھے تھے اور یہی شوق اسے نجا ماسٹر تک لے گیا۔ جھنگ سے لاہور تک کا تین گھنٹے کا سفر نہ جانے اس نے کتنے برسوں میں طے کیا لیکن لاہور پہنچ کر اُس نے صدیوں کا سفر برسوں بلکہ مہینوں میں طے کر لیا۔ اُس نے رنگیلا کی طرح یک مشت ہر فیلڈ میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔ اُس کے حد درجہ مخالف بھی اسے ایک جینوئن شاعر مانتے ہیں۔ اُس کی مارکیٹ میں دستیاب کتابوں میں ۴۶ شعری مجموعے اور ۲۱ متفرق کتابیں ہیں۔ ''بونگے بغلول'' کے خیال میں اِتنی کتابوں کے مالک شاعر مصنف کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے

> اُس کے حد درجہ مخالف بھی اُسے ایک جینوئن شاعر مانتے ہیں۔ اُس کی مارکیٹ میں دستیاب کتابوں میں ۴۶ شعری مجموعے اور ۲۱ متفرق کتابیں ہیں۔ ''بونگے بغلول'' کے خیال میں اِتنی کتابوں کے مالک شاعر مصنف کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ پڑھا بہت جاتا ہے یا پھر وہ کسی اشاعتی گھر کا مالک ہے۔

کہ یا تو وہ پڑھا بہت جاتا ہے یا پھر وہ کسی اشاعتی گھر کا مالک ہے۔ مشاعروں میں عموماً جو شاعر کلام سنا رہے ہوتے ہیں وہ تازہ دم ہوتے ہیں، جو ابھی سنانے والے ہوں وہ اونگھ رہے ہوتے ہیں

چونکہ گاتے ہوئے وہ آنکھیں بند رکھتا تھا، اِس لئے اکثر دوست اُسے اسکول میں گانا شروع کروا کر خود رفو چکر ہو جاتے تھے اور وہ گاتا رہتا اور جب کوئی استاد اُسے چپ کروا کر اس کے اکیلے گانے کی وجہ پوچھتا تو وہ سادگی سے جواب دیتا ''ریاض کر رہا تھا'' تو استاد صاحب بھی سادگی سے فرماتے ''تم نہ بھی کرو تو کوئی فرق تو نہیں پڑنے والا۔''

جبکہ جو سنا چکے ہوں وہ سو رہے ہوتے ہیں جبکہ اس کے مشاعروں میں نہ کوئی اونگھتا ہے اور نہ کوئی سوتا ہے۔ کمال شائد صرف اس کی شاعری کا ہے جو وہ گا کر سناتا ہے جبکہ بونگے بغلول کا کہنا ہے جب ''شیری'' گا سکتا ہے تو کیا اس کا حق نہیں بنتا، فرق تو انیس بیس کا ہی ہے۔ اُس کے ''ظالم'' اور ''وریام'' جیسے پروگراموں میں طنز میں تو وہ کمال فن پر نظر آیا لیکن مزاح ندارد اور شائد یہی وجہ ہے کہ وہ بہت سارے چینلز پر اُس کے پروگرام آن ایئر ہونے کہ باوجود وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکے جبکہ سارے مزاح نگاروں کا یہ ماننا ہے کہ جب تک طنز کے ساتھ مزاح کی آمیزش نہ کی جائے، وہ پر لطف نہیں ہو سکتا اور یہ مزاح ڈائریکٹ اپنی طرف سے شامل کرنے کی بجائے کسی دوسرے فریق سے کروایا جائے۔ اس کی بہترین مثال ہماری شادی بیاہ میں شغل میلہ لگانے والے بھانڈ ہیں۔ کوئی اپنے کتھارسس کے لئے بھانڈوں کے ہاتھوں آپ کی مٹی پلید کروا دے اور آپ سوائے پیچ و تاب کھانے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اب وہ ایک ماسٹر کے روپ میں مسکین سی صورت کے ساتھ ایک بڑے چینل کے پروگرام میں بیٹھتا ہے۔

جب اس کی پروگرام میں شمولیت کی خبریں میڈیا میں آئیں تو لوگوں کا خیال تھا کہ شائد وہ ''کو اینکر'' کے طور پر کام کرے گا لیکن تیرہ گھنٹے کی ریکارڈنگ میں اُس کے حصے میں چند لائنیں ہی آتی ہیں۔ وہ بھی صرف ''چغل جیا نہ ہووے تے'' جیسے چند الفاظ سمجھ آتے ہیں۔ دوسری اس کے لئے اہم باتیں تو اس سے تیز طرار بھانڈ چھین لیتے ہیں۔ اس نے میڈیا میں چھپنے والے کالموں کے جواب میں نجا ماسٹر ہونے کے باوجود چپ سادھ لی ہے لیکن شائد برسوں پہلے اس کا پنا کہا جانے والے شعر اس کے دل کی عکاسی کرتا ہو۔

تو ہے سورج، تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز مرے گھر میں اُتر شام کے بعد

لیکن ''باباجی'' اس پروگرام میں اس کی شمولیت اور کامیڈینز کے ہاتھوں ''تھاپوں'' کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں انہوں نے گیان کی آنکھ سے فرمایا ''پتر! میں اسے ششت باندھے دیکھ رہا ہوں''۔

اُنہوں نے میرے چہرے پر نہ سمجھنے والی لہر دیکھ کر ہولے

اُس کے ''ظالم'' اور ''وریام'' جیسے پروگراموں میں طنز میں تو وہ کمال فن پر نظر آیا لیکن مزاح ندارد اور شائد یہی وجہ ہے کہ وہ بہت سارے چینلز پر اُس کے پروگرام آن ایئر ہونے کہ باوجود وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکے جبکہ سارے مزاح نگاروں کا یہ ماننا ہے کہ جب تک طنز کے ساتھ مزاح کی آمیزش نہ کی جائے، وہ پر لطف نہیں ہو سکتا۔

سے کہا ''صدر پاکستان غلام اسحاق خان کو تو، تو جانتا ہے ناں''۔

''جی، جی!''

''بس سمجھو، کبھی کبھی نازک ذمہ داریاں کمزور کندھوں پر بھی آ پڑتی ہیں۔''

جناوری جنگ

انسان اشرف المخلوقت سہی، بہترین سانچے میں ڈھلا ہوا بھی قبول لیکن اس کی صفات میں جو نیرنگیاں پائی جاتی ہیں وہ توالاماں والحفیظ ہیں۔ وقت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرنے والا انسان اپنی حرکتوں پر نظر ڈالے تو کہیں کہیں یہ ترقی معکوس کی شکل میں بھی نمودار ہوئی ہے۔ ہم اپنے لیے نت نئے سامان پیدا کرتے ہیں جو ایک جانب ہماری زندگی کو سہل بناتے ہیں تو دوسری جانب ہماری پہچان بھی بنتے ہیں۔ انسان نے ترقی کے ساتھ اپنے حوالے سے پائی جانے والی مختلف غیر معقول عادات سے کنارا کشی اختیار تو کی ہے لیکن اسی اشرف المخلوقات نے اپنی ذات میں پائی جانے والی جناوری صفات سے آج تک جان نہیں چھڑائی ہے۔

ہم تیسری دنیا کی نہیں بلکہ ترقی یافتہ دنیا کی یا دنیا کی واحد سپر پاور کی بات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج بھی اپنے آپ کو جانوروں کے ساتھ نتھی کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ''خاک ڈالو ایسی ترقی پر جو آپ کو جانوروں کی حیثیت سے شناخت کرتی ہو۔'' بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ڈیموکریسی

جس کا دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اُس کی سب سے بڑی سرخیل جماعت ''ڈیموکریٹ'' کی شناخت کوئی ''گدھا'' ہو۔ ہماری نانی جان کہتی تھیں ''اے نوج گدھا بھی کوئی جانور ہے، جس کی آواز سنتے ہی کانوں میں سیٹیاں بجنے لگتی ہیں۔'' پتہ نہیں نانی جان کو صرف گدھے کی آواز سے ہی الرجی تھی یا گدھے سے بھی وہ اتنی ہی نفرت کرتی تھیں۔ بات کچھ بھی ہو ہمیں تو گدھا صرف اس لیے ایک آنکھ نہیں بھاتا کہ یہ امریکیوں کا مرغوب ترین لیڈر تھا۔ گذشتہ آٹھ سال سے کہتے ہیں کہ امریکا پر گدھے کی حکمرانی تھی۔ ویسے اخبارات کے ذریعے تو ہم نے یہی پڑھا تھا کہ امریکا پر باراک اوباما حکومت کرتا ہے لیکن ہماری گلی میں رہنے والے ایک پرائمری اسکول کے ماسٹر کرم داد کہتے تھے کہ امریکا میں گدھے کی حکومت ہے۔

آج کل سنا ہے کہ امریکا میں گدھے کو مشقت سے آزادی مل گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ ۸ سال تک دن رات کام کرنے کی وجہ سے گدھا کچھ لاغر ہو گیا تھا۔ گدھے کی لاغری کو دیکھتے ہوئے امریکی عوام کو اُس پر ترس آ گیا اور انہوں نے اپنا اور پوری دنیا کو بوجھ ڈھونے کے لیے ایک موٹا تازہ ہاتھی چن لیا ہے۔ ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ گدھا جو کام کرتا تھا کیا ہاتھی وہ سارے کام کر پائے گا؟ گدھے کے حوالے سے تو مشہور ہے کہ یہ بوجھ ڈھونے میں ماہر ہے جبکہ ہاتھی کا تو اپنا اتنا بوجھ ہوتا کہ وہ خود کو ہی ڈھولے تو بہت ہے۔ اگر ہاتھی گدھے کی طرح امریکیوں کا بوجھ نہیں ڈھو پایا تو امریکی کیا کریں گے؟ یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آیا کہ امریکا جو دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم ہے وہ انتخابی نشان کے لیے کوئی بہت ہی زیادہ جدید اور انسان کے لیے مفید ترین چیز کو کیوں نہیں اپناتی ہیں۔ بھلا گدھے اور ہاتھی بھی اکیسویں صدی کی ترقی سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں۔

امریکا میں انسانی زندگی کی بہت اہمیت گردانی جاتی ہے۔ اخلاقیات کا بھی خوب چرچا کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی سب خیالی باتوں کے ہی زمرے میں آتا ہے۔ بیچاری ہیلری کے شوہر نے ایک لڑکی سے ذرا سا آنکھ مٹکا کیا کر لیا تھا، بیچارے کو صدارت سے ہی ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ آج اسی امریکا میں ایک درجن سے زائد خواتین کے ساتھ تعلقات رکھنے والا شخص صدر بن بیٹھا ہے۔ ہیلری بیچاری اپنی تمام عوامی مہم میں امریکیوں کو کہتی رہی کہ وہ اُس کے انتخابی نشان گدھے کو ووٹ دیں، امریکیوں کی اکثریت نے ہیلری کی بات شاید پوری نہیں سنی۔ وہ صرف گدھا ہی واضح طور پر سن پائے، اِسی لیے انہوں نے دھڑا دھڑ گدھے کو ووٹ دے دیئے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جناوری جنگ میں سب اُلٹا ہو جاتا ہے۔

ہیلری بیچاری اپنی تمام عوامی مہم میں امریکیوں کو کہتی رہی کہ وہ اُس کے انتخابی نشان گدھے کو ووٹ دیں، امریکیوں کی اکثریت نے ہیلری کی بات شاید پوری نہیں سنی۔ وہ صرف گدھا ہی واضح طور پر سن پائے، اِسی لیے انہوں نے دھڑا دھڑ گدھے کو ووٹ دے دیئے۔

روبینہ شاہین بیناؔ

موجِ غزل کے مشاعرے میں مزاح نگار

موجِ غزل فیس بک کا ایک ایسا گروہ ہے جو ہفتہ وار طرحی مشاعروں کا انعقاد کرتا ہے۔اس گروہ کی یہ اچھی روایت ہے کہ یہ اکثر مزاحیہ مشاعروں کا خصوصی اہتمام بھی کرتا ہے۔۱۹؍نومبر ۲۰۱۶ءؔ کو اپنے ۳۱ ویں مشاعرے کو خوش فکر اور پُر مزاح شاعر جناب سید ضمیر جعفری مرحوم کے نام کیا

گیا۔اس ضمن میں مصرعۂ طرح کے لئے اُن کے درج ذیل شعر کا انتخاب کیا گیا۔

غریب خانہ ہمیشہ سے جیل خانہ ہے
مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے

اس میں جن شعرائے اکرام نے شرکت فرمائی اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: سالک جونپوری، نوید ظفر کیانی، نوید صدیقی، شہزاد گوہیر، سید محمد محی الدین شاہ قیس، عاکف غنی، ذہینہ صدیقی، شاہین فصیح ربانی، غضنفر علی، محمد خلیل الرحمن خلیل، شاہد رحمن، محترمہ ڈاکٹر امواج الساحل، خمار دہلوی، ہاشم علی خان ہمدم، محترمہ نور جمشید پوری، محترمہ شہناز رضوی، وزیر حسن وزیر، غوث بسواری اور راقم الحروف۔دیگِ سخن کی مخبری کے لئے چاولوں کے چند دانوں کا انتخاب پیشِ خدمت ہے، جس سے آپ کو مشاعرے کے پُرلطف ہونے کا اندازہ ہو سکے گا۔

ہے میرے ظاہر و باطن میں بھی بلا کا تضاد
ہے بھولی شکل مگر چال شاطرانہ ہے
سالک جونپوری

یوں کہنے کو تو وہ لیڈر ہے اعلیٰ پائے کا
یہ اور بات کہ انداز کچھ زنانہ ہے
روبینہ شاہین بیناؔ

یہ لفظ لفظ نہیں ہیں، لفافہ سازی ہے
بہت سے لوگوں کا بزنس ہی کالمانہ ہے
نوید ظفر کیانی

کہا یہ زوجہ نے شوہر سے صاف اولِ شب
مرا مزاج لڑکپن سے ''آمرانہ'' ہے
نشست تھام کے بیٹھا ہے صدر یوں کس کر
کہ جیسے کرسی کو ہمراہ لے کے جانا ہے
نوید صدیقی

کہا طبیب نے ہنس کر یہ ہم سے ہولے سے
کہ ایک چھوٹا سا پتھر درونِ خانہ ہے
شہزاد گوہیر

بس ایک مصرع میں پہچان ہے فرنگی کی
ہے رنگ گورا مگر چال شاطرانہ ہے
سید محمد محی الدین شاہ قیس

بنے ہوئے ہیں جو جمہوریت کے داعی سب
اُنہی کا طرزِ عمل جبکہ آمرانہ ہے
صداقتوں کی گواہی نہیں کوئی دے گا
یہاں یہ طے ہے کہ مل بانٹ سب نے کھانا ہے
عاکف غنی

وہ اوندھے منہ جو گرا آج شامیانے میں
تو دولہا بولا کہ سہرا کہاں سجانہ ہے
ذہینہ صدیقی

ترا مزاج ازل ہی سے گیدڑانہ ہے
ترا تو کام ہی دشمن سے خوف کھانا ہے
خیالِ عشق ذرا اور فی زمانہ ہے
بنے نہ بیوی مگر شاعرہ بنانا ہے
شاہین فصیح ربانی

حساب اربوں کا دینا تھا یا کہ عربوں کا
عدالتوں میں ادا کتنی معصومانہ ہے
عدالتوں میں میاں کی گرفت کیا ہوگی
یہ ایک میچ ہے اور وہ بھی دوستانہ ہے
غضنفر علی

یہ آدمی جو چھپا آ رہا ہے برقعے میں
یہ نازنین نہیں بلکہ اک زنانہ ہے
خلیل الرحمٰن خلیل

زیادہ ہو جو یوں تکلیف معاف کر دینا
ہمارے ہاتھ میں نشتر ذرا پرانا ہے
شاہد رحمٰن

وہ لیٹ آ کے ہمیشہ ہی اس میں چڑھتا ہے
جو پوری ریل میں ڈبہ لگا زنانہ ہے
ڈاکٹر امواج الساحل

اب اور اِن پہ بھروسہ نہ کیجئے آخر
سیاسی وعدے ہیں اِن کو تو ٹوٹ جانا ہے
خمار دہلوی

تمام ریٹ ترے ہیں وطن کے پٹواری
ترے ہی ہاتھ میں منڈی کا باردانہ ہے
کہاں سے آئی ہے دولت میاں بتاؤ تو
یہ مال و زر ہے کہاں کا جو غائبانہ ہے
ہاشم علی خان ہمدم

بہا کے خون پسینہ کھڑا کیا جس کو
نہ سمجھو اس کو مرا گھر، غریب خانہ ہے
نور جمشید پوری

سدا خفا ہی وہ رہتے ہیں اپنی بیوی سے
مگر سلوک تو سالی سے دوستانہ ہے
یوں ڈاکٹر کو بتایا ہے اس نے اپنا حال
یہ واردات ہے بیگم کی، بزدلانہ ہے
شہناز رضوی

جدھر بھی جائیے کچرے کے ڈھیر ملتے ہیں
ہمارا شہر نہیں، یہ کباڑ خانہ ہے
وزیر حسن وزیر

اُسے تو منہ بھی لگاتا نہیں ذرا سا میں
یہ کس نے کہہ دیا وہ جان دلبرانہ ہے
غوث بسواری

مزاحیہ مشاعروں کے انعقاد سے قطعۂ نظر موجِ غزل کے مشاعروں میں مزاحیہ شعراء کا ایک ایسا، نہ صرف مستقل بلکہ مستقل مزاج حصہ بھی موجود رہتا ہے جو اپنی طنز و مزاح پر مبنی شاعری کو ہر مشاعرے کی زینت بناتا ہے، چاہے خصوصیت سے مزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا ہو یا نہیں۔ اِس ضمن میں موجِ غزل کے

فورم پر عالمی فی البدیہہ طرحی مشاعروں کے سلسلے میں رواں سہ ماہی میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں طنز و مزاح کے اس عنصر کا تذکرہ کرنا ناموزوں نہیں لگتا۔ موجِ غزل کا ۲۸ واں عالمی طرحی مشاعرہ خوب صورت شاعرہ افروز رضوی کے نام تھا۔ اس ضمن میں مصرعۂ طرح کے لئے جس شعر کا انتخاب کیا گیا ہے وہ کچھ یوں تھا:

نصاب جاں میں اذیت تھی اس قدر تحریر
کہ ذکر آیا کسی کا ، خیال تیرا رہا

اس مشاعرے میں پیش کئے گئے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

میں سگ گزیدہ و تیری گلی میں کتے اف
ہمیشگی سے تو 100 پر جلال تیرا رہا
شریف نے تو شریفے تمھیں کو بانٹے ہیں
کہ مستفید سب اہل و عیال تیرا رہا

گوہر رحمان گہر مردانوی

بھری ہی رہتی ہیں سچائیوں میں مرچیں سی
کسی کی بات پہ منہ لال لال تیرا رہا

نوید ظفر کیانی

ہوئی ہے خرچ بیوٹی پہ سیلری ساری
میاں کنگال ہوا، پر جمال تیرا رہا

روبینہ شاہین بینا

میں کتنے زہرہ جمالوں کے خواب سے گزرا
اے میری پہلی محبت ! خیال تیرا رہا
ملا نہیں ترے جیسا کوئی مجھے ہمدم
منافقت بھری دنیا میں کال تیرا رہا

ہاشم علی خان ہمدم

حکومتیں کئی بدلیں، اے شوہرِ مسکیں!
”میاں“ کے دور میں ویسا ہی حال تیرا رہا
سُنا تھا عیب چھپاتے ہیں مال و زر، سچ ہے
مرے روپئے پہ حاوی ریال تیرا رہا

عرفان قادر

موجِ غزل کے ۲۹ ویں مشاعرے میں کہے گئے مزاحیہ کلام سے کچھ منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں جو قومی ترانے کے خالق جناب حفیظ جالندھری نام پر منعقد کیا گیا۔ مصرعہ طرح کے لئے حسب ذیل شعر کا انتخاب کیا گیا ہے۔

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

کوئی خاتون جو میک اپ کا نہ برقعہ پہنے
لوگ کہتے ہیں کہ چہرے پہ ذرا نور نہیں

نوید ظفر کیانی

ہم نے یوں یار کے پہلو سے اٹھایا دشمن
حور کی بغل میں اب چاہیے لنگور نہیں

ارشد عزیز

ناز اُٹھوائیے اُن سے ہی، جنھیں عادت ہے
ہم تو شاعر ہیں، کسی منڈی کے مزدور نہیں

عرفان قادر

تو کرپشن کو دفع دور نہیں کرتا کیوں
کیا یہ قانون بنانا ترا منشور نہیں

روبینہ شاہین بینا

کرکرے چپس سلانٹی کے بغیر آئی ہو
اب ترا وصل عنایات سے بھرپور نہیں

ڈاکٹر عزیز فیصل

۳۰ ویں مشاعرے کے لئے محفل حکیم الامت، مفکرِ پاکستان حضرت علامہ محمد اقبال کا حسبِ ذیل شعر کا انتخاب کیا گیا:

بر تر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

چیدہ چیدہ مزاحیہ اشعار درج ذیل ہیں:

شکر ہے اسکینڈلوں کے درمیاں ہے زندگی
خادمانِ قوم کے شایانِ شاں ہے زندگی

نوید ظفر کیانی

گیس کی موجودگی میں زندگی ہے واہ وا!
اور نہ ہو تو گیلی لکڑی کا دھواں ہے زندگی
نوید صدیقی

دو مہینے ہو گئے پورے مٹن کھائے ہوئے
آج کل اپنی تو آلو گاجراں ہے زندگی
عرفان قادر

فیس بک پر فوٹوؤں کی اک دکاں ہے زندگی
اِن دنوں تو کاروبار سیلفیاں ہے زندگی
روبینہ شاہین بینا

۳۲واں موج غزل مشاعرہ موج غزل کی خوبصورت شاعرہ محترمہ ڈاکٹر امواج الساحل کے نام تھا۔ اس میں اُن کے جس شعر کو منتخب کیا گیا تھا، وہ یہ تھا:

بہت آسان ہے دعویٰ یہ پیمانِ محبت کا
کسوٹی جب بھی لگتی ہے تو انساں ہار جاتا ہے

چیدہ چیدہ مزاحیہ اشعار پیش ہیں:

اسے ہے خوش گمانی کہ شجر پر نوٹ لگتے ہیں
بڑے ہی شوق سے کوئی سمندر پار جاتا ہے
نوید ظفر کیانی

کوئی پرزہ کسی قانون کا ثابت نہیں رہتا
کہ جب کارِ سیاست میں کوئی لوہار جاتا ہے
نوید صدیقی

گوالا ہو کہ تاجر ہو مؤرخ ہو لکھاری ہو
جسے ملتا ہے جو موقع، وہ ڈنڈی مار جاتا ہے
عرفان قادر

ہمارے ملک میں کچھ خاص ایسی بستیاں بھی ہیں
جہاں لیڈر نہیں جاتے مگر پرچار جاتا ہے
خمار دہلوی

جو آؤٹ آف ڈیٹ مجنوں تھا وہ صحراؤں میں پھرتا تھا
مگر اِس دور کا مجنوں سمندر پار جاتا ہے
روبینہ شاہین بینا

۳۶ واں طرحی مشاعرہ جناب شہزاد قیس کے نام تھا۔ اس مشاعرے میں دسمبر کے بخئے ادھیڑے گئے۔ چیدہ چیدہ مزاحیہ اشعار کچھ یوں تھے۔

جو سکڑ کر پڑا ہوں چادر میں
یہ ہے حالت بلم دسمبر میں
گوہر رحمٰن گہر مردانوی

دل ہمارا ہے یا فریزر ہے
جم سے جاتے ہیں غم دسمبر میں
روبینہ شاہین بینا

قیس کی شاعری کی گرمی ہو
پھر تو سردی ہو کم دسمبر میں
ڈاکٹر امواج الساحل

جو اڑاتے ہو مفت کی دعوت
پھٹ نہ جائے شکم دسمبر میں
کاشف صدیقی

ہیں دھواں دھار لیڈروں کے بیاں
اور ٹھٹھرتے ہیں ہم دسمبر میں
ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آپ نے فروری میں کی شادی
بڑھ گیا ہے جھم دسمبر میں
ذیشان فیصل شان

میری شادی! ستم! دسمبر میں
پھر تو پہلا جنم دسمبر میں
خلیل الرحمٰن خلیل

بے تکے گیت گا کے سمجھا ہے
خود کو "سونو نگم" دسمبر میں
عرفان قادر

کبھی ہو گا نہ کم دسمبر میں
شاعروں کا اُودھم دسمبر میں
نوید ظفر کیانی

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اپریل ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۷ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی